محافظِ اسلام

ابوطالب مومنِ قریشؑ

مولف

علامہ عبداللہ الخنیزیؒ

مترجم: علامہ سید ذیشان حیدر جوادی

پیشکش

معصومینؑ اکیڈمی حیدرآباد آندھرا پردیش

زیرِ اہتمام: انجمنِ معصومینؑ دارالشفاء نمبر 705-2-22 پنجتن کالونی حیدرآباد

آندھرا پردیش (انڈیا)

پی۔ او۔ بکس نمبر 610 معبلی پوسٹ آفس حیدرآباد، فون نمبر 524275

شیعہ ملٹی میڈیا ڈاٹ کام

www.ShiaMultimedia.com

محافظِ اسلام

ابو طالب مومنِ قریش

مولف

علامہ عبد اللہ الخنیزی

مترجم: علامہ سید ذیشان حیدر جوادی

پیشکش

معصومین اکیڈمی حیدرآباد آندھرا پردیش

زیرِ اہتمام: انجمنِ معصومینؑ دار الشفاء نمبر 700-2-22 پنجتن کالونی حیدرآباد

آندھرا پردیش (انڈیا)

پی۔ او۔ بکس نمبر۔ 610 جوبلی پوسٹ آفس حیدرآباد، فون نمبر: 524275

باسمہ سبحانہ

نام کتب ———— ابوطالب مومنِ قریش
تصنیف ———— علامہ عبداللہ الخنیزی
ترجمہ ———— علامہ سید ذیشان حیدر جوادی
ناشر ———— معصومین اکیڈمی حیدرآباد، اے پی
تعداد طباعت ———— (۲۰۰۰) دو ہزار
طباعت ———— سنہ ۱۹۹۵ء م سنہ ۱۴۱۵ھ
کتابت ———— سید محمد صادق رضوی (رضوی پرنٹرس جال مارکٹ چھتہ بازار)
قیمت ———— -/۱۲۰ ایک سو بیس روپے

———— ملنے کے پتے : ————

- دفتر انجمنِ معصومینؑ ۲۲-۲-۷۰۰ پنجتن کالونی دارالشفاء، حیدرآباد
  فون نمبر 624275
- مکتبۂ ترابیہ - چھتہ بازار - حیدرآباد (اے، پی)
- ساز ساؤنڈ - پرانی حویلی چوراستہ، حیدرآباد، اے پی

گلدستۂ مضامین

گفتارِ مترجم	۱
آستانۂ تاریخ و تقدیس	۲۰
مدارجِ زندگانی / خاندان	۵۸
دلائل	۷۷
ترویج	۸۷
پہلا پیغام	۹۰
دعوتِ ذوالعشیرہ	۹۴
جہاد	۱۰۱
وقتِ احتضار	۱۳۷
تاریخ کی ذمہ داریاں / بعد موت	۱۴۳
عطر بار تذکرے	۱۴۸
حضرت علیؑ کی زبان پر	۱۵۹
اصحاب و علماء کی زبان پر	۱۷۷
چند لمحے حدیدی کے ساتھ	۱۸۹
افتراپردازی اور جعلسازی	۲۰۱
مومن	۲۶۵

علّامہ حیدر جوادی (مترجم)

نام السیّد ذیشان حیدر تخلص حیدر، لقب جوادی (منسوب بامام جواد علیہ السلام) والدگرامی کا نام مولانا السیّد محمد جواد (سابق پیش نماز جلالی ضلع علی گڑھ) مدرسۂ امجدیہ کراری میں دینیات، مدرسۂ ناظمیہ لکھنؤ سے درجۂ عالم، نجف اشرف سے استعداد تحقیق و تفہیم و اجتہاد، خطابت کا سلسلہ ۱۹۴۹ء سے جاری ہے۔ تصنیف و تالیف میں برابر مصروف رہتے ہیں۔

قلمی خدمات :— نظام اسلام ۵ جلدیں، فدک تاریخ کی روشنی میں، شہداءِ ایمان، نص و اجتہاد، شیعی اجتہاد، قیاس، آج کا انسان اور اس کے اجتماعی مشکلات، ترجمہ کتاب سلیم، اقتصادیات ۲ جلدیں، الکلام (عربی)، الفقہ والاجتہاد (عربی) الامام الصادق ۴، تنقید من دیدان، حیّ علی الصلوٰۃ، حیّ علی الفلاح، حیّ علی خیر العمل، قد قامت الصلوٰۃ، داستانِ ابن سبا، توحیدِ خالق، شیعہ اور اصحاب، تحریف قرآن، عزائے مظلوم اور عقل و شرع، تحقیق اہل بیتؑ، الامام الصادقؑ والمذاہب الاربعۃ وغیرہ۔

ہماری استدعا پر موصوف کئی اہم کتابوں کی تالیف و تصنیف میں منہمک ہیں جو جلد از جلد منصۂ شہود پر جلوہ گر ہوں گی۔

فرقۂ جعفریہ کے تمام نوجوانوں کو آپکی دینی خدمات پر فخر و ناز ہے

○ ○ ○

معصومینؑ اکیڈمی

حیدرآباد، الہند

صدر میر احمد علی زوّار

ابوطالبؑ مومنِ قریش

ذوقِ تصنیف و تالیف میں حصولِ علم کی خاطر جو نفوس منہمک رہتے ہیں اُنھیں مالکِ حقیقی کی طرف سے ہر قسم کا جذبۂ عطا ہوتا ہے۔ چاہے وہ جذبہ دینی ہو یا دنیاوی اُسی انہماک کو لئے ہوئے نوجوانانِ ملت اس کارِ خیر میں پیشرفت کئے۔ محافظِ اسلام محسنِ انسانیت، باب العلمؑ کے پدر بزرگوار حضرت ابوطالب ہاشمی جو روزِ قیامت تک عالمِ انسانیت کے ظرف و ضمیر میں منوّر رہیں گے۔ ان کی حیاتِ طیبہ پر تصنیف کردہ نورانی تحریر "ابوطالب مومن قریش" عربی زبان میں عظیم کتاب ہے۔ اس کا ترجمہ اُردو میں عمدۃ العلماء علامہ السیّد ذیشان حیدر جوادی صاحب قبلہ و کعبہ نے کیا ہے۔ اُن ہی نوجوانانِ ملت میں سے ایک پاکیزہ نفس میر صابر علی صاحب بانیٔ انجمن معصومینؑ حیدرآباد (انڈیا) کی ملاقات علامہ السیّد ذیشان حیدر جوادی صاحب قبلہ سے ۱۹۸۶ء میں دوبئی میں ہوئی اس وقت موصوف اپنی دینی مصروفیات میں مشغول تھے۔ میر صابر علی، موصوف سے ہم کلام ہوئے تو موصوف نے کئی مکتوبات کا ذکر کیا۔ خاص کر اس کتاب کی طرف توجہ مبذول کرائی اور کہا کہ یہ کتاب ہندوستان میں شائع ہو چکی ہے۔ اتنے بڑے ملک میں یہ کتاب جتنی تعداد میں چھپنی چاہیئے تھی وہ نہ چھپ سکی آپ کی انجمن اگر اس کتاب کی اشاعت کی طرف توجہ کرے تو یہ بھی دینی و دنیاوی خدمت ہوگی۔ علامہ نے اس کتاب پر اس قدر روشنی ڈالی کہ میر صابر علی کے دل میں خواہش پیدا ہوگئی کہ مولف ابوطالب مومنِ قریش سے ملاقات ہو جائے چنانچہ میر صابر علی نے زیارات مقامات مقدسہ کے بعد بغرضِ عمرہ سعودی عربیہ پہنچے اور بعد فریضۂ عمرہ و مقاماتِ مقدسہ، اپنے ہی خواہوں سے ملاقات کرتے ہوئے سید اقبال عابدی سے الحسا (سعودیہ) میں ملاقات کی اور اس کتاب کا تذکرۂ خیر کیا۔ اس پر اقبال عابدی نے اُس مقام کی نشاندہی کی کہ جہاں پر عبداللہ بن الخنیزی صاحب قیام پذیر تھے۔ پھر دیگر ہم وطن حضرات سے بھی میر صابر علی کی ملاقات ہوئی جس میں قابلِ ذکر غلام پنجتن صاحب، سید واجد آغا صاحب

باسمہٖ تعالیٰ

احوالِ واقعی

محسنِ اسلام سید البطحا حضرت ابوطالب علیہ السلام پر تو ابنائے زمانہ کی اُسی وقت سے نظر تھی جب آپ نے حضرتِ ختمی مرتبتؐ کی پرورش کی ذمہ داری قبول کی اور آنحضرت کی نگہداشت ونصرت میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا، اسی دور سے مخالفینِ اسلام کی نظروں میں آپ کی شخصیت کھٹکنے لگی اور جب اسلام نے اپنا اثر دکھایا اور شخصیت پرست قبائل نے بھی باجبر واکراہ اسلام کا ظاہری لبادہ اوڑھ کر اسلام میں داخل ہوگئے اور طرح طرح کی سازشوں اور ریشہ دوانیوں میں معروف ہوگئے۔ محافظِ اسلام حضرت ابوطالبؑ کی خدمات تاریخ کے صفحات پر آج بھی ایک منارۂ نور کے مانند ہیں۔ اور بانئ اسلام و اسلام کی بقا کی دعوت دیتے ہیں۔ بعد وفات حضرت ابوطالب علیہ السلام کے آپ کے فرزند حضرت امیرالمومنین علی ابن ابوطالبؑ نے محافظِ اسلام وبانئ رسولِ اسلام کی حیثیت سے اپنے والدِ بزرگوار کی ذمہ داری کو اپنی آخری سانس تک ادا کیا، اسلامی جنگوں میں ہزاروں سورمایانِ عرب تیغِ امیرالمومنین علیہ السلام سے جہنم داصل ہوگئے۔ یہی وجہ تھی کہ پہلے تو حضرت ابوطالبؑ اور بعد میں مولائے کائنات حضرت علیؑ ابن ابی طالبؑ کے خون کے پیاسے ہوگئے۔ اور عرب کا کینہ تو تاریخ میں اپنی آپ مثال ہے۔ یہی دشمنی کا سلسلہ بعد وفات حضرت ختمی مرتبتؐ بڑھنے لگا۔ اور آخر میں میدانِ کربلا میں امام حسین علیہ السلام کے سامنے ایک قاتلانہ تحریک کے ساتھ نمودار ہوا۔ معاویہ کے دور سے ہی حضرت امیرالمومنین علیہ السلام کی ذاتِ بابرکات کیلئے اسّی ہزار منابر سے سب وشتم کا آغاز ہوچکا تھا۔ اور جب کہ یہ کینہ اپنے شباب پہ پہنچ گیا اور میدانِ کربلا میں امام حسین علیہ السلام نے لشکرِ یزید سے فرمایا کہ کیا میں حلال کو حرام کیا یا حرام کو حلال کیا ہوں یا شریعت میں تبدیلی کیا ہوں اس سوال کے جواب میں لشکرِ یزید نے کہا کہ یہ آپ کے باپ کا بدلہ آپ سے لے رہے ہیں۔ اس کے بعد دربارِ شام میں یزید کے سامنے اہلبیتؑ اطہار قیدیوں کی صورت میں پیش کیے تو یزید کہ وہ اشعار جو کہ اہلِ بیتؑ کی موجودگی میں کہا کہ کاش میرے بزرگوار جو بدر میں کشتے ہوتے تو دیکھتے کہ میں نے آلِ محمدؐ سے کیسا انتقام لیا ہے یہ اشعار اسلام دشمنی کا بین ثبوت

ہیں اور آج اسی کے ماننے والوں کا نعرہ ہے کہ "محوالآثار العلی" یعنی علیؑ کے آثار کو مٹا دو اور ساتھ ساتھ ایمان حضرت ابوطالبؑ کو بھی مشکوک بنادو تاکہ آئندہ بھی اس بغض وعناد کا سلسلہ جاری رہے اور اسلام اپنے حقیقی روپ میں کبھی دنیا کے سامنے نہ آنے پائے۔ لعنت اللّٰہ علیٰ اعدائھم اجمعین۔ ایسے پرآشوب دور میں دار سے پھر ایک آواز بلند ہوئی یعنی چودھویں صدی ہجری میں دار نے پھر ایک میثم عصر کو طلب کیا۔ اور اس میثمِ عصر کو بھی پھانسی کا حکم ہوچکا تھا مگر مشاہیرِ عالم کے تقریباً ایک لاکھ ٹیلیگرام پہنچے جس کی وجہ سے بادشاہِ وقت کو پھانسی کا حکم منسوخ کرنا پڑا۔ میثم عصر آیت اللّٰہ العظمیٰ الشیخ عبداللّٰہ الخنیزی مدظلہٗ کی کتاب "ابوطالبؑ مومنِ قریش" تاریخ وتحقیق کے طالب علموں کے لئے ایک نادر تحفہ ہے جس کے مطالعہ سے حقیقی نتائج کا سامنا اور شکوک مٹ جانا کتاب کی تاثیر ہے۔ فاضل مصنف نے جس طریقے سے تاریخی مواد کو پیش کیا ہے اس سے آپ کی خداداد تحقیقی صلاحیت کا پتہ چلتا ہے۔ کتاب کے تعلق سے اظہار کرنا اور وہ بھی علامہ السید جوادی کے بعد سورج کو چراغ دکھانا ہے۔ کتاب میں جابجا اشعار حضرت ابوطالبؑ اور اقوالِ رسول اور آیاتِ قرآنی کی روشنی میں تاریخ کا تجزیہ اپنے مقام پر انفرادیت رکھتا ہے۔ یعنی یہ کتاب راہِ حضرت ابوطالبؑ میں جہاد کرنے والوں کے لئے حرفِ آخر ہے اور ایسے ہی صاحبانِ ایمان کے لئے قرآن پکار کر کہہ رہا ہے۔

اَلَاۤ اِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (المجادلہ آیۃ ۲۲)

آگاہ رہو کہ خدا کا گروہ وہی تو (پوری پوری) فلاح پانے والے ہیں۔

آیۃ اللّٰہ حضرت عبداللّٰہ الخنیزی مدظلہٗ سے مجھے ملاقات کا شرف ۱۹۸۶ء میں بمقام سعودی عربیہ قطیف میں حاصل ہوا۔ جس کا سلسلہ آج تک جاری ہے۔ کیونکہ شیخ انتہائی منکسر المزاج اور خلیق انسان ہیں اور گفتگو میں بھی طمانیت کا انداز پایا جاتا ہے۔ اور آپ کے اخلاق کا یہ عالم ہے کہ جو بھی ایک مرتبہ آپ سے ملاقات کرتا وہ دوبارہ ملاقات کا خواہش مند ہوتا ہے خصوصاً آپ کی کتاب کی اشاعت کے بعد سے بیشتر لوگ آپ کے گرویدہ ہوگئے اور آپ کو مردِ مجاہد کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ خدا آپ کو صد وسی سال سلامت رکھے۔ آمین یارب العالمین بحقِ آلِ طٰہٰ ویٰسین —— اور اب تو شیخ کی تقلید میں بھی ہزاروں مقلدین ہیں اور شیخ کو مرجع کا بھی شرف حاصل ہے۔

۱۹۸۶ء میں میں نے بغرضِ زیارت مقاماتِ مقدسہ کے لئے سعودیہ عربیہ گیا تب

پیشکش انجمن معصومین حیدرآباد الہند جسٹرڈ

صورۃ العکس:

حجۃ الاسلام مجاھد الاسلام ثانی حضرت میثم تمار مرجع تقلید جہاں عبداللہ، حضرت شیخ علی الحاج حسن بن مقلع بن کاظم بن علی عبداللہ الخنیزی صاحب قبلہ مدظلہ۔ سنہ ولادت ۱۳۵۵ م

چراغ آلِ محمد ہمیشہ روشن باد

والذین یودون المومنات بغیر ما اکتسبو فقد احتملوا بهتانا وانما مبیناہ (القرآن)

"جو لوگ اہلِ ایمان کو بہتان دھر کر اذیت دیتے ہیں وہ کھلے ہوئے گناہ کے متحمل ہوتے ہیں۔"

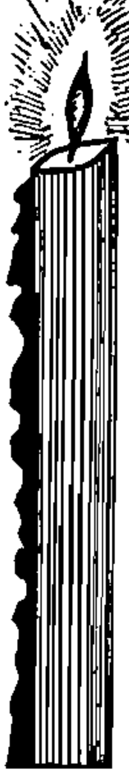

ملنے کا پتہ

انجمن معصومینؑ:- پی.او.بکس نمبر (615) حوبلی پوسٹ نمبر 2 (اے.پی) انڈیا۔

میں نے علامہ سے ملاقات کرنے کی کوشش کی۔ میں ابوطالبؑ مومنِ قریش پڑھنے کے بعد میرا دل بے اختیار ہوگیا کہ علامہ سے ملاقات کروں اور مجھے میرے خدا سے یہ اُمید ہے کہ میری ملاقات آیت اللہ الشیخ عبداللہ الخنیزی مدظلہ سے ہو گی ـــــ سید تنویر عباس۔ میر حسین علی اور سید واجد حسین صاحب اور غلام پنجتن صاحب نے شیخ سے ملاقات کا بندوبست کیا۔ اور یہ ملاقات ہماری زندگی میں ایک بہت ہی مبارک و مقدس اور اہم مقام رکھتی ہے۔ میں جتنے بھی دن سعودی عرب میں تھا پابندی سے علامہ کی ملاقات کو جاتا اور دوسری ملاقات کا متمنی رہتا اور جب میں حیدرآباد واپس ہونے لگا تو نہایت ہی افسوس کر رہا تھا ؎

"حیف در چشم زدن صحبتِ یار آخر شد"

انجمن معصومینؑ ایک زمانۂ دراز سے دینی خدمات میں مصروف ہے اس کے ساتھ ساتھ انجمن نے کئی دینی اور فقہی کتابوں کی اشاعت کی اور اِن کتابوں کو مفت تقسیم کیا گیا انجمنِ معصومینؑ کی کتابوں میں دعائے کمیل اور ہدایاتِ معصومینؑ خاص کتابیں ہیں اور دیگر کئی رسالوں کی اشاعت بھی ہو چکی ہے میں سعودی عرب سے آنے کے بعد اپنی دینی خدمات میں منہمک ہونے کے باوجود میں خط و کتابت کا سلسلہ جاری رکھا۔ خاص کر میں نے غلام پنجتن صاحب اور واجد آقا صاحب سے بذریعہ خط مشورہ کر کے "معصومینؑ اکیڈیمی" کا انعقاد عمل میں لایا۔ اور اس اکیڈیمی کی جانب سے یہ کتاب آیۃ اللہ العظمیٰ الشیخ عبداللہ الخنیزی مدظلہٗ العالی کی اشاعت عمل میں آئی۔ ان تمام خدمات کا اجر بارگاہِ رب العزت میں بطفیل معصومین علیہ السلام محفوظ ہوگا۔ اور بارگاہِ خداوندی میں ہماری یہ دُعا ہے کہ رب العزت بطفیلِ معصومین علیہ السلام اِن کی توفیقات میں اضافہ فرمائے۔

آمین یارب العالمین،

بعنایاتِ ربِّ ذوالمنن

میر صابر علی زوّار

سکریٹری و بانی انجمنِ معصومینؑ حیدرآباد

علامہ الشیخ عبداللہ الخنیزی سے بانی و سکریٹری انجمنِ معصومینؑ، و سکریٹری معصومینؑ اکیڈمی میر صابر علی زوّار ملاقات کرتے ہوئے

گفتارِ مترجم

کسی انسان کی سیرت پر ذمہ دارانہ قلم اُٹھانا ایک ایسا سخت اور دشوار گزار مرحلہ ہے جس کے طے کرنے میں مورخ کے پائے نگاہ میں لغزش پیدا ہو جاتی ہے۔ قلم تھرّانے لگتا ہے۔ ہاتھوں میں رعشہ پڑ جاتا ہے۔ خیالات بھٹکنے لگتے ہیں اور قوتِ ادراک و شعور اپنی پوری ہمت صرف کرنے کے بعد بھی "ماعرفناک" کی فریاد بلند کر دیتی ہے۔

اس لئے کہ سیرت نگاری انسان کے تمام سوانح حیات اور اوضاعِ زندگانی پر ایک تفصیلی مطالعہ اور دقیق نظر کی متقاضی ہے اس اہم موضوع کے لئے انسان کے موروثی صفات اس کے داخلی کیفیات، نفسیاتی رجحانات اور اجتماعی سماجی اور اقتصادی مشکلات سبھی پر نظر رکھنے کی ضرورت پڑتی ہے۔

سیرت نگاری فقط ظاہری حلیہ کے بیان کر دینے کا نام نہیں ہے یہ ایک مختصر فہرست ہوتی ہے جس سے مکمل کتابِ زندگانی کا اندازہ ہوتا ہے۔ ایک چھوٹا سا آئینہ ہوتا ہے جس میں ماضی، حال اور مستقبل بیک وقت دیکھے جا سکتے ہیں۔ ایک مختصر سا نقشہ ہوتا ہے جس میں زندگی کا پورا عکس نظر آتا ہے۔

ظاہر ہے کہ جب عام انسان کی سیرت نگاری اتنی اہم اور دشوار گزار ہے تو شیخ بطحا سید قریش حضرت ابوطالبؑ کی زندگی پر قلم اٹھانا اور بھی مشکل مرحلہ ہو گا۔

مجھے داد دینی پڑتی ہے اپنے نوجوان برادرِ دینی جناب عبداللہ خنیزی کو جنھوں نے جوانی کے مادی تقاضوں کو پس پشت ڈال کر زندگانی کا ایک اہم حصہ یعنی تقریباً ایک سال کا زمانہ اس وادی کو طے کرنے میں صرف کر کے حضرت ابوطالبؑ کے ایمان و عقیدہ آپ کے جہاد اور آپ کے خدمات مسلسل کا وہ ذخیرہ مہیا کر دیا ہے جس کو دیکھنے کے بعد کوئی انصاف پسند انسان آپ کے ایمان و عقیدہ میں شک نہیں کر سکتا۔

یہ بات پہلے بھی واضح تھی لیکن ایک ایسے جری القلم اور صحیح الکلمہ انسان کی ضرورت تھی جو "علی

ابصارھم غشاوۃ "قسم کے لوگوں کی نگاہوں سے تعصب اور جہالت کے پردے ہٹاکر ان کے لئے نورِ صداقت کے جلوؤں کی نشاندہی کرے۔ مشیت نے اس انسان کو موصوف کی شکل میں مجسم کیا اور اس طرح آپ کے سیال قلم اور عمیق افکار سے یہ خدمت انجام پائی

قانونِ سیرت نگاری کے تحت اگر حضرت ابوطالبؑ کی پوری زندگی کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ آپ کی پوری زندگی میں کوئی لمحہ ایسا نہیں آیا جسے کفر سے سازگار یا اسلام سے کنارہ کش تصور کیا جاسکے یہ ضرور ہے کہ ان لمحات کے صحیح تجزیہ کے لئے ایک ذہنِ رسا اور چشمِ بینا کی ضرورت ہے ورنہ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ کوئی شئے اپنے انتہائی ظہور کی بنا پر پردۂ خفا میں چلی جاتی ہے۔ فلسفہ کا ایک مسلّم مسئلہ ہے کہ پوشیدگی اور مخفیت محض گمنامی کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ اس کا عامل بعض اوقات خود ظہور بھی ہوتا ہے۔

ہم دنیا کی جس شئے کو بھی دیکھتے ہیں اس سے پہلے نورِ آفتاب نظر آتا ہے اس کے بعد اس کے وسیلے سے اس شئے پر نظر پڑتی ہے جسے دیکھنا چاہتے ہیں لیکن اس کے باوجود ہم اس شئے پر نظر جما لیتے ہیں اور نورِ آفتاب کی طرف متوجہ بھی نہیں ہوتے۔

اس طرح ہمیں جس شئے کا علم ہوتا ہے اس کا وسیلہ وہ ذہنی تصویریں ہوتی ہیں جو صفحۂ قلب پر منقش ہوتی ہیں لیکن اس کے باوجود ہم اپنے ہی نفس سے غافل ہو کر اس شئے کی طرف توجہ مرکوز کر دیتے ہیں۔

اس سے زیادہ واضح مثال یہ ہے کہ آج کی بعض تحقیقات کی بنا پر دنیا میں رنگ کا کوئی وجود نہیں ہے سُرخ و زرد و سیاہ و سفید یہ سب ان ہوائی تموجات کا نتیجہ ہیں جو اپنے پہلو میں نور کی شعاعیں لئے رہتے ہیں۔ مجھے اس سے بحث نہیں ہے کہ فلسفی اعتبار سے اس دعوے پر کوئی محکم دلیل قائم ہو سکتی ہے یا نہیں۔؟ مجھے تو صرف یہ بتانا ہے کہ فلسفۂ جدید و قدیم دونوں اس ایک نقطہ پر متفق ہیں کہ اکثر چیزیں اپنے ظہور اور انکشافِ کامل کی بنا پر مخفی ہو جاتی ہیں۔

اسی بنیاد پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ حضرتِ ابوطالبؑ کے ایمان کا نظروں سے پوشیدہ ہو جانا اس کے گمنام اور مخفی ہونے کا نتیجہ نہیں ہے، بلکہ یہ اس کے کمالِ ظہور کا اثر ہے۔ یہ اور بات ہے کہ آفتاب کی شعاعیں بھی چمگادڑ کی نظروں سے پوشیدہ ہی رہتی ہیں۔

ورنہ کیا سبب تھا کہ دنیا کو آپ کا مادی جہاد آپ کا سماجی مقابلہ اور آپ کے تبلیغی خدمات نظر آئے۔ لیکن ان کے پس منظر میں کام کرنے والا بنیادی عقیدہ نظر نہ آسکا۔

حضرت ابوطالبؑ کی سیرت سے دلائلِ ایمان اور شواہدِ عقیدہ کے جمع کرنے کے لئے آپ کی زندگی کو چار حصوں میں تقسیم کرنا پڑے گا پہلے حصہ میں آپ کے اضافی اوصاف پر نظر ڈالی جائے گی دوسرے

میں نفسیاتی رجحانات پر بحث ہوگی۔ تیسرے حصے میں آپ کے ذاتی خدمات بیان کئے جائیں گے اور چوتھے میں آپ کے بارے میں علماءِ امت کے اعتراف و ارشادات نقل کئے جائیں گے

اضافی اوصاف

آپ کا نسب شریف اس تسلسل کے ساتھ حضرت آدمؑ تک پہنچتا ہے:۔

ابوطالب بن عبدالمطلب بن ہاشم بن عبد مناف بن قصی بن کلاب بن مرہ بن کعب بن لوی بن غالب بن فہر بن مالک بن نضر بن کنانہ بن خزیمہ بن مدرکہ بن الیاس بن مضر بن نزار بن معد بن عدنان بن عود بن ناحور بن یعور بن یعرب بن یشجب بن نابت بن اسمٰعیل بن ابراہیم بن تارخ بن ساروغ بن ارعواو بن فانع بن عابر بن شالخ بن ارفخشد بن سام بن نوحؑ بن لمک بن متوشلخ بن خنوخ بن برد بن مہلابیل بن لعوف بن انوش بن شیث بن آدمؑ۔ (مواہب الواہب)

آپ کے اسمِ گرامی کے بارے میں علماء میں قدرے اختلاف ہے۔ صاحبِ عمدۃ المطالب احمد بن علی کا قول ہے کہ آپ کا اسم شریف عبد مناف تھا۔ ابوبکر طرطوسی کی رائے ہے کہ اسم مبارک عمران تھا اور بعض لوگوں کا خیال ہے کہ خود ابوطالبؑ ہی تھا۔

بعض علماء نے عبد مناف کو ترجیح دی ہے کہ حضرت عبدالمطلب نے اپنی وصیت میں اسی نام سے یاد کیا ہے اور ابوطالب کو کنیت قرار دیا ہے۔ رہ گیا عمران تو اس کے بارے میں روایت کو ضعیف قرار دیا گیا ہے اگرچہ شہرت اسی نام کی ہے اور اسی اعتبار سے اہلبیتؑ کو آلِ عمران بھی کہا جاتا ہے۔

(مواہب الواہب)

توارثِ صفات

"پدرم سلطان بود" اگرچہ انسان کو سلطان نہیں بنا سکتا لیکن یہ حقیقت بھی ناقابلِ انکار ہے کہ سلاطین کی اولاد کی ذہنیت عام ذہنیتوں سے مختلف ضرور ہوتی ہے اب یہ اختلاف جائز حدود میں ہو یا ناجائز اس کے عوامل و حرکات اچھے ہوں یا بُرے لیکن اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ انسان اپنے موروثی صفات کا آئینہ دار ضرور ہوتا ہے۔

"قانونِ توارث کے تفصیلات کا تذکرہ اپنے موضوع سے خارج ہے۔ اس لئے اسے علماءِ نفس کے حوالے کیا جاتا ہے۔ البتہ اتنا کہنا ضروری کہا جاتا ہے کہ اس قانون کا کس حد تک تسلیم کرنا انتہائی بدیہی اور وجدانی شئے ہے انسان جن صفات کا حامل ہوتا ہے۔ بچے میں ان کے آثار کا پایا جانا ایک فطری شئے ہے۔ ایک بخیل کے بچے میں بخل اور ایک کریم کے بچے میں کرم کا ہونا ضروری ہے۔ یہ اور بات ہے کہ حالاتِ زمانہ اور اختلاف معاشرہ کی بنا پر ان صفات کا مظاہرہ اپنی آبائی شکلوں میں نہ ہو سکے۔

بچہ ابتدائی تخلیق کے اعتبار سے ماں باپ کے اوصاف لے کر دنیا میں آتا ہے۔ پھر معاشرہ اس پر اثرانداز ہوتا ہے۔ وہ اپنے داخلی کیفیات کی بناء پر سماج کا مقابلہ کرتا ہے اور نتیجہ میں تصادم و تعارض ایک جدید شکل کی طرف منتہی ہوجاتا ہے جس کا حقیقی سرچشمہ وہی موروثی صفات ہوتے ہیں جن کو لے کر دنیا میں آیا ہے

اگر بچہ کسی بخیل و لئیم انسان کے گھر پیدا ہوا اور اس کی تربیت ایک ایسے عالم اور فیاض گھرانے میں ہو جائے جس کا شعار دولت کا لٹانا اور اموال کا تقسیم کرنا ہو تو یہ خارجی اثرات سے متاثر ہونے کے بعد اموال کی تقسیم میں بخل سے کام نہ لے گا لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ بخل اس کی سرشت سے نکل گیا۔ بلکہ ہو سکتا ہے کہ اس کا اظہار دولتِ علم کی تقسیم میں ہو یا شرافتِ اخلاق کی فیاضی میں۔

یہی وجہ ہے کہ دینِ اسلام نے انسان کی تربیت کا انتظام اس کے شعوری دور سے ہی کیا کہ اس وقت وراثت اپنا اثر دکھا چکی ہے۔ بلکہ اس کا مکمل اہتمام اس کے وجود میں آنے کے پہلے ہی سے شروع کر دیا۔ اِدھر کسی انسان نے تولیدِ نسل کا قصد کیا اُدھر اسلام نے اپنے احکام نافذ کر دیئے۔ اچھی اور با اخلاق عورت کا انتخاب کرو۔ مال و جمال پر نظریں مت جماؤ۔ دودھ پلانے پر خاص توجہ دو۔ ناجائز و ناروا خیالات کی حامل عورت سے بچے کو محفوظ رکھو۔ اچھی آغوش میں تربیت کا انتظام کرو وغیرہ۔

یہ سب کیا ہے؟ یہی کہ تربیت عالمِ وجود میں قدم رکھنے سے پہلے ہو تاکہ موروثی صفات اپنا غلط رنگ نہ جما سکیں۔ بنیادی اثرات نامناسب طریقے پر متاثر نہ کر سکیں۔ ایسا نہ ہو کہ مصلح و مربی کی ساری تدبیریں صرف ان بنیادی جراثیم کی بناء پر بیکار اور بے سود ہو جائیں جو پہلے سے طینت میں اپنا گھر بنا چکے ہیں۔

توارثِ صفات کے اس نظریئے پر ایک عبوری نظر ڈالنے کے بعد ہمارا فریضہ ہے کہ ہم اس سلسلے میں حضرت ابوطالبؑ کے موقف کو واضح کر کے بتائیں کہ اس نجیب الطرفین فرزند کو اپنے والدین سے کیا کیا ملا ہے!

(۱) حضرت عبدالمطلبؑ (۲) عالم عربیت (۳) رئیسِ مطلق (۴) اور ابوطالبؑ کا مربیِ اوّل

کیا کہنا اس انسانِ کامل کا جسے تاریخ آج تک مفلسوں کی پناہ گاہ اور غریبوں کے ملجا و ماویٰ کے نام سے یاد کرتی ہے جس نے حاجیوں کو سیراب کر کے "فیاض" اور اڑتے ہوئے پرندوں کو غذا دے کر "مطعم الطیر" کا لقب حاصل کیا۔

اس وقت آپ کی مکمل تاریخ پیش کرنا مقصود نہیں ہے صرف ان خطوط کی نشاندہی کرنا ہے جو آپ کی زندگی میں بڑی نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔ یعنی آپ کا ایمان و اخلاص اور جود و کرم۔

جود و کرم کا یہ عالم تھا کہ کبھی تڑپتے ہوئے دل اور سنولائے ہوئے چہرے دیکھے نہیں جاتے تھے۔ اِدھر

دھوپ کے مارے ہوئے قافلے اور میدان کی تپش سے جھلسے ہوئے چہرے سامنے آئے اور اُدھر سیرابی کا انتظام شروع ہوگیا۔ کوئی مسافر پیاسا نہ رہ جائے کسی غربت زدہ کو احساسِ غربت نہ ہونے پائے کوئی دور افتادہ اپنے کو لاوارث تصور نہ کر سکے۔ صرف اس لئے کہ آنے والے اللہ کے مہمان اور خانۂ خدا کے طواف کرنے والے ہیں۔

کوئی پوچھے کہ آنے والے سے آپ کا کیا تعلق ہے؟ یہ سارے انتظامات آپ کیوں کر رہے ہیں! مکہ والے اپنے شہر کی آبرو کا خیال کیوں نہیں کرتے! عالمِ عربیت کی حیثیت کو کیا ہو گیا ہے۔!

حقیقت یہ ہے کہ یہ اہتمام و انتظام، یہ خاطرداری اور ضیافت اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ اس انسان کے دل میں عشقِ الٰہی کے گہرے جذبات اور جود و کرم کے عمیق رجحانات پائے جاتے ہیں۔ یہ نہ تو یہ چاہتا ہے کہ ریگزار حجاز کے تپش زدہ پیاسے رہیں اور نہ یہ برداشت کر سکتا ہے کہ خدائی مہمانی پر کوئی حرف آسکے اسے نہ یہ گوارا ہے کہ اپنے موروثی جذبات گھٹ کر مر جائیں اور نہ یہ برداشت ہے کہ دھوپ اور پیاس کی شدت سے گھبرا کر لوگ طوافِ خانۂ کعبہ چھوڑ دیں۔

سوال یہ ہے کہ جود و کرم اور احساس و شعور کے یہ گہرے رجحانات حضرت ابوطالبؑ کی زندگی میں کس طرح ظاہر ہوئے۔ دور جانے کی ضرورت نہیں ہے تاریخ کے اوراق ہمارے سامنے ہیں۔ قلتِ مال اور کثرتِ عیال نے پریشان کر رکھا ہے لیکن وراثتی صفات اس بات پر مجبور کر رہے ہیں کہ اللہ کے مہمان بھوکے پیاسے نہ رہ جائیں۔ اور لوگ گھبرا کر خانہ کعبہ کو ترک نہ کر دیں۔ اپنا گھر اُجڑتا ہے تو اُجڑ جائے لیکن اللہ کا گھر آباد رہے۔ اپنے سر پر بار بڑھتا ہے تو بڑھ جائے لیکن اللہ کی مہمان داری پر حرف نہ آنے پائے۔

کیا ان تصورات و جذبات کا انسان بھی کافر ہو سکتا ہے؟

ایمان و عقیدہ

آپ کے ایمانِ کامل کا ثبوت آپ کا وہ مقابلہ ہے جو آپ نے ابرہہ سے اس وقت کیا جب وہ خانۂ خدا کو منہدم کرنے کے لئے اپنا عظیم الشان لشکر لے کر مکہ آیا۔ آج دنیا میں اسلام کے ٹھیکیدار بہت ہیں۔ جسے دیکھئے وہ ذمہ دارِ شریعت ہے جس پر نظر ڈالئے وہ وارثِ قرآن ہے لیکن انصاف سے بتایئے کہ اگر آج العیاذ پر کوئی وقت پڑ جائے تو کیا کوئی ایسا مسلمان ہے جو حضرت عبدالمطلبؑ کا جیسا مطمئن قلب ..... اور پُرسکون نفس لے کر اُٹھ کھڑا ہو! ــ یہاں تو مسلمانوں کا یہ عالم ہے کہ بات بات پر دشمن کو چیلنج کر رہے ہیں۔ اور جب بات پوری نہیں ہوتی تو مصلحت خدا پر ٹال دیتے ہیں۔ جس کے نتیجہ میں اسلام کی رسوائی اور شریعت کی بے عزتی ہوتی ہے لیکن کیا کہنا حضرت عبدالمطلب کی دوررس نگاہوں کا کہ آپ نے ابرہہ سے اس وقت تک کوئی بات نہیں کی جب

تک کہ مشیت الٰہی کا اندازہ نہیں کر لیا۔ یہی وجہ تھی کہ ادھر زبان پر کلمات آئے ادھر ابابیل کی فوجیں روانہ ہو گئیں

مباہلہ ایک ایسا کام ہے جس کا اختیار سوائے اِن اولیاء خدا کے کسی اور کو نہیں ہے جن کو اپنی طلب پر اعتمادِ کامل اور اللہ کی مشیت پر اطلاعِ تام حاصل ہو۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ انسان اپنی خواہش سے کوئی بات کہہ دے اور اس کے نہ ہونے کی صورت میں اسلام بدنام ہو جائے اس لئے کہ اللہ نے ہر ایک کے دعوے کی تصدیق کی کوئی ضمانت نہیں لی ہے۔

حضرت عبدالمطلب کا یہ وہ طرزِ عمل تھا جس نے آپ کی وصایت کو مکمل طریقے سے واضح کر دیا۔ آپ انتہائی اطمینانِ قلب کے ساتھ ابرہہ کو چیلنج کرتے ہیں (اور پھر جو کچھ ہوتا ہے) وہ چند لمحات میں نگاہوں کے سامنے آجاتا ہے تاکہ دنیا دیکھ لے کہ دُعا میں کتنی تاثیر ہے اور ایمان کی لاج کس طرح رکھی جاتی ہے۔

سابق بیان کو دیکھنے کے بعد یہ کہا جا سکتا تھا کہ اگر حضرت عبدالمطلب کی نیاضی کو یہ گوارا نہ تھا کہ خانۂ کعبہ کی مرجعیت میں کوئی فرق آسکے تو پھر ابرہہ کے مقابلہ میں خانۂ کعبہ کی طرف سے دفاع کیوں نہیں کیا۔؟

لیکن اِس کا کھلا ہوا جواب یہ ہے کہ اوّلاً تو مادی اعتبار سے حضرت عبدالمطلب کے پاس اتنی قوت نہ تھی کہ اِس بے پناہ لشکر کا مقابلہ کر سکتے" دوسری بات یہ بھی ہے کہ اِس مقابلہ سے بات ابرہہ اور عبدالمطلبؑ کی ہو کر رہ جاتی اور آپ کا منشاء یہ تھا کہ ابرہہ کے سامنے الٰہی طاقتوں کا مظاہرہ ہو جائے تاکہ اسے یہ احساس ہو جائے کہ اللہ اِسے اپنا گھر نہیں بنانا چاہتا جسے بندے زبردستی اِس کی طرف منسوب کرنا چاہتے ہیں۔

اِس کے بعد ابابیل جیسے مختصر پرندے کو ہاتھی جیسے گرانڈیل جانور کے مقابلہ میں بھیج کر خالقِ کائنات نے سِن وسَال کے امتیاز کو بھی اس طرح ختم کیا ہے جس کی نظیر تاریخ میں مشکل سے ملے گی۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ حضرت ابوطالبؑ نے اِس اطمینانِ نفس اور سکونِ قلب سے کیا پایا ہے ؟

اِس کا جواب تو اُسی وقت ظاہر ہو گیا تھا' جب رسولِ اکرمؐ نے آپ کو اس بات کی اطلاع دی تھی کہ قریش نے ہمارے بائیکاٹ کے لئے جو دستاویز لکھی ہے اسے دیمک کھا گئی ہے اور حضرت ابوطالبؑ نے انتہائی سکونِ قلب کے ساتھ قریش کو چیلنج کر دیا تھا اس دستاویز پر ایک نظر کر لو۔ اگر محمدؐ کا قول صحیح ہے تو ایمان لے آؤ ورنہ ہم محمدؐ کو تمہارے حوالے کر دیں گے۔

کیا اِس سے اطمینانِ نفس کا تصور کیا جا سکتا ہے کہ انسان آج اس کو دشمن کے حوالے کرنے پر آمادہ ہے جس کو مدتوں اپنی آغوش میں پالا ہے جس کی خاطر اپنی دنیاوی ریاست وزعامت کھوئی ہے اور جس کی وجہ سے شعب کی تلخ کام زندگی گزارنا پڑی ہے۔ اور جس کے تحفظ کے لئے اپنی اولاد تک کی قربانی پیش کرنے کا انتظام کیا تھا۔

فاطمہ بنتِ عمرو بن عایذ بن عمران بن مخزوم :-

(مومن کامل حضرت عبدالمطلبؑ کی زوجہ اور حضرت ابوطالبؑ کی والدہ گرامی)

مناظرانہ تعصب سے الگ ہو کر دیکھا جائے تو یہ بات بالکل واضح ہے کہ آباواجدادِ نبی کو تمام اخلاقی اور مذہبی نقائص سے بری ہونا چاہیئے. اس لئے کہ ماں باپ کی بُرائی سے اولاد کی بدنامی ہوتی ہے جیسا کہ علامہ سیوطی نے آباواجدادِ سرورِ اکرم کے ایمان کا فیصلہ کرتے ہوئے تحریر کیا ہے کہ انہیں مسلمان تسلیم کرنا اس لئے بھی ضروری ہے کہ ماں باپ کی بدنامی سے اولاد بدنام ہو جایا کرتی ہے۔

حقیقت امر یہی ہے کہ اگر کسی پست طبقہ کے انسان کے یہاں کوئی باشرف بچہ پیدا ہو جائے تو اقدار ومفاہیم سے نابلد عوام اُس کی طرف متوجہ نہیں ہوتے اور ان کا حساب خاندانی عظمتوں سے ہوتا ہے۔ وہ اضافی کمالات کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر کسی کا مقصد یہ ہے کہ تمام عالم کو کسی شخص کے سامنے جھکا دے تو اس کا فریضہ ہو گا کہ اِسے ایسے باشرف گھرانہ میں پیدا کرے جس کی شرافت اُس انسان کی عظمت کے لئے سازگار ہو۔

بھلا کون ایسا ہو گا جو عطر شمامۃ العنبر کو مٹی کے کوزہ میں بھر دے۔ کس کی عقل گوارا کرے گی کہ صاف و شفاف چشموں کا پانی گندی نالیوں سے بہائے اور جب عام دنیاوی انتخابات کے اصول اتنے دقیق ہیں تو نورِ نبوت کے لئے جس ظرف کا انتخاب کیا جائے گا کیا وہ شرک ونجاست سے ملوث وآلودہ ہو سکتا ہے ہرگز نہیں۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے رسولِ اکرمؐ سے خطاب کر کے اعلان کر دیا تھا۔ تقلبک فی الساجدین جس کی تفسیر امام رازی نے ان الفاظ میں کی ہے کہ" اس سے مراد اصلاب طاہرہ اور ارحامِ طیبہ میں منتقل ہونا ہے"۔

اس کے علاوہ حضرت ابراہیم علیہ السّلام کی معروف دُعا یہ تھی :-

واجنبنی وبنیّ ان نعبد الاصنام ——— "خدایا مجھے اور میری اولاد کو بُت پرستی سے محفوظ رکھنا" ———

کیا یہ ممکن ہے کہ حضور اکرمؐ کو نسلِ ابراہیمؑ سے خارج کر دیا جائے اور اولادِ ابراہیمؑ میں ان کا شمار نہ ہو۔

خود رسولِ اکرمؐ کی متفق علیہ حدیث ہے :——

لم یزل ینقلنی اللہ من اصلاب الطاہرین الی ارحام المطہرات حتیٰ اخرجنی فی عالمکم ہذا لم یدنسنی بدنس الجاہلیۃ ۔ (اللہ نے ہمیشہ ہمیں پاک صلب سے پاک رحم کی طرف منتقل کیا ہے ہم اِس دنیا میں آنے تک کسی وقت بھی جاہلیت کی گندگیوں سے آلودہ نہیں ہوئے ——)

حدیث شریف میں طاہر ومطہر کے الفاظ کا مفہوم پورے طور پر اس وقت ظاہر ہوتا ہے جب ہم انہیں

انما المشرکون نجس کے ساتھ ملاکر دیکھتے ہیں اور یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ ان حضرات میں کفر و شرک کا احتمال بھی نہ تھا۔

روضۃ الواعظین میں جابر بن عبداللہ انصاری کے واسطے سے یہ روایت نقل کی گئی ہے کہ رسول اکرمؐ نے اپنی اور حضرت علیؑ کی تخلیق کا تذکرہ کرتے ہوئے یہ الفاظ ارشاد فرمائے ہیں۔

ثم نقلنا من صلبہ (آدم) فی الاصلاب الطاھرات الی الارحام الطیبۃ فلم نزل کذلک حتیٰ اطلعنی اللہ تبارک وتعالیٰ من طھر طاھر و ھو عبداللہ ابن عبدالمطلب فاستودعنی خیر رحم وھی آمنہ

"اللہ نے ہمیں حضرت آدمؑ کے بعد بھی برابر ارحام طیبہ اور اصلاب طاہرہ کے ذریعہ منتقل کیا ہے۔ یہاں تک کہ حضرت عبداللہ کے پاک صلب اور حضرت آمنہ کے مقدس رحم سے ہمیں اس دنیا میں ظاہر فرمایا ہے۔"

اس کے علاوہ خود حضرت ابوطالبؑ کی ولدیت سے استدلال ہوسکتا ہے کہ حضرت ابوطالبؑ حضرت علیؑ کے والد ہیں اور حضرت علیؑ کا نور اقدس ہمیشہ پاک اصلاب و طیب ارحام میں رہا ہے لیکن تعصب آمیز نگاہوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے ہم نے جناب عبداللہ کو واسطہ قرار دے کر حضرت فاطمہ کی عظمت و جلالت کا اظہار کیا ہے۔

آیات و روایات کی روشنی میں جب یہ بات پایۂ ثبوت کو پہونچ گئی کہ انوار طیبہ کے لئے ارحام طیبہ کی ضرورت ہے تو حضرت فاطمہ مخدومہ کے ایمان و اجلال کے بیان کرنے کے لئے کوئی ضرورت باقی نہیں رہی کہ یہ مخدرہ حضرت عبداللہ کی مادر گرامی ہیں اور حضرت عبداللہ کے صلب میں نور اقدس نبوی ودیعت کیا گیا تھا اس کے بعد یہ سوال پیدا ہوگا کہ ایسی مقدس اور باعظمت ماں سے حضرت ابوطالبؑ کو وراثت میں کیا ملے گا۔ اس کا فیصلہ تو بابصیرت علماء نفس ہی کرسکتے ہیں یا علم النفس سے قطع نظر کرلینے کے بعد ہر انسان کا وجدان و ضمیر کرسکتا ہے۔

⋆ فاطمہ بنتِ اسد

(حضرت ابوطالبؑ کی زوجہ محترمہ حضرت علیؑ کی والدہ گرامی)

خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ ابھی تک مسلمانوں میں کوئی ایسا فرقہ پیدا نہیں ہوا جو آپ کے ایمان کو شک و انکار کی نظر سے دیکھتا ہو۔ آپ کی جلالت قدر کا یہ رعب ہے کہ اہل تاریخ و سیر آپ کا شمار سابق الاسلام مخدرات میں کرتے ہیں اور آپ کے اسلام کو دیگر خواتین پر مقدم قرار دیتے ہیں۔
(ابوالفرج۔ فصول مہمہ ابن صباغ)

اس کے باوجود آپ زندگی بھر حضرت ابوطالبؑ کی زوجیت میں رہیں اور ان کے ساتھ بہترین سلوک کرتی رہیں۔
آپ کے ایمان و عقیدہ اور عظمت و جلالت کے بعض شواہد یہ ہیں۔

(۱)۔ جس وقت جناب امیرؑ کی ولادت کا وقت قریب آیا اور آپ نے اپنی زحمت کا احساس کیا تو خانۂ خدا کے قریب تشریف لائیں۔ شکمِ اقدس کو جدارِ کعبہ سے مس کیا اور دعا کے لئے ہاتھ بلند کردیئے "اللّٰھُمَّ اِنّی مومنۃ بک" (خدایا میں تجھ پر ایمان لاچکی ہوں) خدایا تجھے اس مولود کا واسطہ جو میرے شکم میں ہے میری مشکل آسان کردے۔

کیا کہنا اس ایمان کامل اور اس رتبہ شناسی کا کہ بچہ بطن میں ہے اور اس کا واسطہ دے رہی ہیں۔ اللہ پر ایمان کا صریح لفظوں میں اعلان ہو رہا ہے کہ اس کے بعد کسی کفر و شرک کا احتمال نہ پیدا ہوسکے۔

(۲) ــ آپ کے رحم مطہر میں اس علیؑ کا نور رہ چکا ہے جس کو رسالت مآبؐ نے اپنے نور کا شریک قرار دیکر اصلاب طاہرہ اور ارحام طیبہ سے اپنا تخلیقی سفر بیان فرمایا ہے۔ رحم طیب میں غیر از اسلام کوئی تصور نہیں ہوسکتا ہے

(۳) ــ آپ کی جلالتِ قدر کا یہ عالم تھا کہ رسول اکرمؐ نے اپنے دستِ مبارک سے تجہیز و تکفین کی۔ خود قبر میں اترے اور ایک خاص اہتمام کے ساتھ نماز جنازہ پڑھائی۔ اپنے پیراہن میں کفن دیا۔ خود ہی تلقین پڑھی تاکہ دنیا دیکھ لے کہ یہ خاتون عام عورتوں کی طرح کی مسلمان نہیں ہیں ان کا اسلام و ایمان ایک خاص اہمیت کا مالک ہے اور ان کا عقیدہ ایک مخصوص اخلاص کا حامل ہے۔ (الفصول المہمہ)

یہ سب اس لئے کہ ناواقف اور متعصب افراد پر آپ کا اسلام پوری طرح واضح ہوجائے اور یہ سمجھ سکیں کہ آپ کا اسلام آپ کے شوہر کے اسلام کی ایک واضح دلیل ہے اس لئے کہ اسلامی قانون کی بناء پر غیر مسلم کسی مسلمان عورت کا شوہر نہیں رہ سکتا۔ قرآن مجید نے بار بار مشرک و مسلمہ کے ازدواجی تعلقات سے ممانعت فرمائی ہے اور یہ احتمال نہیں دیا جاسکتا کہ رسول اکرمؐ نے حکم قرآن کو ٹال دیا ہو۔ یا اس پر عملدرآمد نہ کیا ہو جس کا مطلب ہی یہ ہے کہ آپ کی نظر میں جس طرح فاطمہ بنتِ اسد مسلمان تھیں۔ اسی طرح حضرت ابوطالبؑ بھی مومن کامل تھے۔ اب مسلمانوں کو اختیار ہے چاہے رسول اکرمؐ کے نظریات سے اتفاق کریں یا اختلاف کریں۔

امیرالمومنین علیؑ (ابوطالبؑ کے فرزند ارجمند)

دنیا حضرت علیؑ کو سابق الاسلام تسلیم کرے یا نہ کرے اس سے کوئی بحث نہیں ہے۔ یہ بحث تو ان لوگوں کے بارے میں بھلی معلوم ہوتی ہے جن کا سابقہ کفر سے رہ چکا ہو۔ جن کی پیشانیاں بتوں کے سجدوں سے آشنا ہوچکی ہوں۔ جن کے دل اصنام کی بارگاہ میں جھک چکے ہوں۔ لیکن جو انسان تاریخی مسلمات کی بناء پر کَرَّمَ اللہُ وَجْہَہٗ صرف اس لئے کہا جاتا ہو کہ اس

نے کبھی بُتوں کے سامنے سر نہیں جھکایا اور کبھی آن بھی سنگ و خزف کو سجدہ نہیں کیا اِس کے بارے میں یہ بحث فضول معلوم ہوتی ہے۔

بہرحال یہ ایک مسلّمہ حقیقت ہے کہ حضرت علیؑ نے زندگی کا کوئی لمحہ بھی عالمِ کفر میں نہیں گزارا۔ حالانکہ اگر بعض مسلمانوں کے زعم کے مطابق ہم حضرت ابوطالبؑ کو کافر تسلیم کرلیں تو ہمیں یہ ماننا پڑے گا کہ حضرت علیؑ کی ابتدائی زندگی بھی محکومیت بالکفر میں گزری ہے۔ اس لئے کہ باطنی طور پر فطرت اسلام پر پیدا ہونے والا بچہ ظاہری طور پر ماں باپ ہی کے احکام کے تابع ہوتا ہے۔

کیا دُنیا کا کوئی عاقل یہ تصوّر کرسکتا ہے کہ ایک کافر کے بچہ کی ولادت کے لئے خانۂ حق کی دیوار شق ہوکر راستہ دے۔ وہ خانۂ کعبہ جس کی تعمیر کے اتمام کے بعد خلیلِ حق کو دوبارہ اِس کی تطہیر کا حکم ہوا تھا۔ ایسا تصوّر عظمتِ خلیلؑ پر زبردست حملہ اور عظمتِ کعبہ پر بہت بڑا بہتان ہے۔ کعبہ میں ولادتِ علیؑ حضرت ابوطالبؑ کے ایمان کی بہترین دلیل ہے اور شاید یہ بھی ایک مصلحت رہی ہو کہ مشیّت نے آپ کی ولادت کے لئے خانۂ کعبہ کا انتخاب کیا تھا۔

صاحب مناقب نے یہاں تک نقل کیا ہے کہ ولادت کے بعد حضرت ابوطالبؑ نے بچّہ کو گود میں لے کر بارگاہ احدیت میں عرض کی ؎

یَارَبِّ یَاذَاالْغَسَقِ الدَّجِیِّ ‏ ‏ وَالْقَمَرِ الْمُبْتَلِجِ الْمُضِیِّ
بَیِّنْ لَنَا فِیْ حُکْمِکَ الْمَقْضِیِّ ‏ ‏ مَاذَا تَرٰی فِیْ اِسْمِ ھٰذَا الصَّبِیِّ

(اے تاریک رات اور چمکتے چاند کے خالق و مالک رب تو ہی فیصلہ کرکہ اِس بچہ کا نام کیا ہوگا)

اِس کے جواب میں یہ دو شعر نازل ہوئے۔ علی بن ہمام کی روایت کی بناء پر تختی پر لکھے ہوئے اور فضل بن شاذان کی روایت کی بنا پر زبانِ ہاتف پر ؎

خصصتما بالولد الزکی ‏ ‏ والطاھر المنتجب الرضی
فاسمہ من شامخ علی ‏ ‏ علی اشتق اسمہ من العلی

(تمہیں ایک پاک و پاکیزہ منتخب اور پسندیدہ بچّہ دیا گیا ہے اِس کا نام بلند و بالا اور اسمِ الٰہی سے مشتق یعنی علی ہے")

اگرچہ یہ روایت شیعی طریق سے نقل ہوئی ہے لیکن میرا موضوع سخن مناظرہ سے ہٹ کر تحقیق ہے اس لئے میں اس روایت پر اعتماد کرسکتا ہوں جس کے راوی معتبر اور اسناد صحیح ہوں، خواہ ان کا تعلق کسی بھی فرقہ سے ہو۔

نفسیاتی رجحانات

وہ افراد جن کے پہلو میں دل اور دل میں جذبات ہیں۔ وہ اس حقیقت کو اچھی طرح جانتے ہیں کہ انسان کو اپنا عقیدہ بہت پیارا ہوتا ہے وہ اپنے مذہبی رجحانات یا نظریاتی میلانات کی خاطر اپنا سب کچھ قربان کرسکتا ہے اس کی نظروں میں یہ ایک ایسی بیش بہا دولت ہوتی ہے جس کا توازن کسی شئے سے نہیں کیا جاسکتا۔

آج بھی دیکھ لیجئے بھائی بھائی' باپ بیٹے' عزیز عزیز یہ سب کیوں جھگڑا کر رہے ہیں۔ اِن میں نزاع کی بنیاد کیا ہے۔ ان میں اختلاف کس نے پیدا کیا ہے۔ کیا اس کا سبب نظریئے کے علاوہ کچھ اور بھی ہے؟ اِس کا نظریہ ہے اُس کا وہ' اِس کا عقیدہ ایسا ہے اُس کا ویسا۔ حالت یہ ہے کہ ادھر نظریات کی بحث چھڑی ادھر قرابت کے رشتے ٹوٹے' اب نہ کوئی باپ ہے نہ بیٹا' نہ بھائی ہے نہ بہن' جس کا کھلا ہوا مطلب یہ ہے کہ عقیدہ دُنیا کے ہر رشتہ پر بھاری ہے اس کی قوت عالم کی ہر ایٹمی قوت سے زیادہ موثر ہے انسان اپنے عزیز قریب کے خلاف بات برداشت کرسکتا ہے لیکن اپنے عقیدہ کے خلاف کوئی بات برداشت نہیں کرسکتا۔

نفسیاتی اعتبار سے یہ ثابت ہوجانے کے بعد یہ بھی واضح ہوگا کہ عالم تقیہ کا ایمان عام ایمان و اسلام سے زیادہ قیمتی ہوتا ہے اس لئے کہ کھلا ہوا اسلام اپنے مذہب سے دفاع کرسکتا ہے۔ وہ اپنے خلاف کوئی کلمہ نہیں سنے گا۔ ایسے کسی مخالف کی بات نہیں برداشت کرنا پڑے گی۔ لیکن تقیہ کے ایمان کو ان تمام مشکلات سے دوچار ہونا پڑے گا۔ وہ اپنے خلاف باتیں سنے گا۔ اور چپ رہے گا۔ اپنے اصول پر حملہ دیکھے گا اور دفاع نہ کرسکے گا۔ جذبات گھٹ گھٹ کر رہیں گے۔ اور کوئی کلمہ زبان پر نہ آسکے گا۔ اتنا سخت مرحلہ جہاد اکبر ہی کہا جائے کہ جہاد بالنفس اس کے علاوہ کوئی اور شئے نہیں ہے تلوار لے کر میدان میں آجانا دشمن کے ایک ایک کلمہ پہ دادِ شجاعت دے کر جاں بحق تسلیم ہوجانا بہت آسان ہے اور دشمنوں کے طعنے سن کر ان کی تعدیاں دیکھ کر ان کی بے ادبیوں پر نظر رکھتے ہوئے خاموش رہ جانا بہت مشکل ہے۔

یہی وجہ تھی کہ قرآن کریم نے مومنِ آلِ فرعون کی مدح کی ہے اور یہی راز تھا کہ اصحابِ کہف کے قصے زینتِ کتاب عزیز بنائے گئے ہیں کہ ان لوگوں نے ضبط نفس کا ثبوت دیتے ہوئے اپنے مذہب کو ظاہر نہیں کیا۔ تاکہ اِس طرح اپنے اصول کا تحفظ کرسکیں یا حضرت موسیٰؑ کی جان بچا سکیں۔

جذبات پر قابو حاصل کرکے مصالح وقت کے پیش نظر حفاظتی کارروائی کے لئے اپنے دین کو پوشیدہ کردینے والے حضرات اس بات کے زیادہ حقدار ہیں کہ انھیں اس جنسِ گراں کی اُجرت عطا کی جائے ان کے اس کنز مخفی کو اچھی قیمت سے خریدا جائے۔

پھر کیا کہنا اس تقیہ کا جس کا محرک اپنی جان کا تحفظ یا اپنے مال و آبرو کا بچاؤ نہ ہو بلکہ اس کا تمام تر محرک ایک قانون کا تحفظ، ایک رسولؐ کی حفاظت اور ایک لازوال مذہب کا باقی رکھنا ہو۔ جس کے نتیجہ میں دینِ الٰہی زندہ درگور ہونے سے بچ جائے اور جس کے طفیل میں اسلام پر مہرِ دوام ثبت ہو جائے۔

حضرت ابوطالبؑ کی یہی وہ بیش بہا دولت تھی جس کی صحیح قیمت امامِ وقت نے لگائی اور یہ فرمایا کہ وہ دوہرے اجر کے حقدار ہیں۔ انھوں نے فقط اسلام ہی قبول نہیں کیا بلکہ اسلام کے تحفظ اور رسولِ اسلامؐ کی بقا کی خاطر اپنے جذبات کی قربانی بھی دی ہے۔ اپنے ظاہری وقار و عظمت کو بھی کھویا ہے اور اپنی رات کی نیند اور دن کا چین بھی حرام کیا ہے۔

اربابِ انصاف فیصلہ کریں کہ راحت و اطمینان کے ساتھ اعلانِ اسلام زیادہ قیمت رکھتا ہے یا بیدار ضمیر اور زندہ دل کے گھٹے ہوئے جذبات، اسلام ظاہر کر کے اپنے جان و مال کا تحفظ زیادہ قیمت رکھتا ہے یا اس بیش بہا دولت کو خزانۂ دل میں چھپا کر رسولِ اسلامؐ کا تحفظ!

ذاتی خدمات

رسولِ اسلامؐ اور حضرت ابوطالبؑ کی زندگی کا امتزاجی مطالعہ اس بات کا قوی شاہد ہے کہ ابوطالبؑ کی طینت کا خمیر اسلام و عقیدہ کے آبِ حیات سے اٹھا تھا۔ یہ وہ انسان تھا جس نے اصل و نسل، حسب و نسب کسی اعتبار سے بھی کفر سے کوئی تعلق پیدا نہیں کیا۔ تبلیغ کے ابتدائی لمحات جن میں ایک مؤید کی شدید ضرورت ہوتی ہے جب تحریک اٹھانے والا حسرت و یاس سے ایک ایک کا منہ تکتا ہے کسی محرک کا باقاعدہ ساتھ دے کر اس کی تحریک کو کامیاب بنا دینا ان تمام ہمراہیوں سے کہیں زیادہ بہتر ہے جو تحریک کی کامیابی کے بعد ظہور میں آتی ہیں۔

سچ فرمایا ہے امام محمد باقرؑ نے کہ اگر ساری دنیا کا ایمان ایک پلّہ میں ہو اور ابوطالبؑ کا ایمان دوسرے پلہ میں تو ان کا پلّہ بھاری رہے گا اس لئے کہ وہ اسلامی بنیادوں کے مضبوط کرنے والے اور اسلام کو دنیا سے روشناس کرنے والے ہیں۔

دنیا جانتی ہے کہ ابوسفیان بھی مسلمان تھا اور حضرت ابوبکر بھی لیکن حضرت ابوبکر کے اسلام کو ترجیح حاصل ہے۔ اس لئے کہ انھوں نے غربت کے دور میں اسلام کو قبول کیا تھا اور ابوسفیان نے اس کی بڑھتی ہوئی شوکت کو دیکھنے کے بعد۔

لوگ کہتے ہیں کہ حضرت عمر کے اسلام کی وقعت بھی اسی لئے زیادہ ہے کہ ان کے اسلام سے مذہبی دبدبہ میں اضافہ ہو گیا اور اس ہیبت سے نہ جانے کس کس کے دل ہلنے لگے تو اس کا کھلا ہوا مطلب یہ ہے کہ عالمِ غربت و کسمپرسی کا اسلام حالتِ شوکت و دولت کے اسلام سے کہیں زیادہ وقعت و اہمیت رکھتا ہے تو پھر یہ

دیکھنا پڑے گا کہ یہ تمام غربت کے اسلام (مرفِ بانیٔ اقرار کے حدود تک محدود تھے ان کی تمام تاریخیں) یا رسولِ اسلامؐ کی نصرت کا کوئی تذکرہ نہیں تھا اور ابوطالبؑ کے اسلام کا تعلق زبان سے نہیں تھا بلکہ اس کی پشت پر عمل ہی عمل تھا۔ اور خدمت ہی خدمت تھی۔

اگر یہ نہ ہوتا تو اسلام کی صف خالی اور اس کی بساط الٹی ہوئی نظر آتی۔ اگر یہ نہ ہوتا تو رسولِ اسلامؐ خاک و خون میں غلطاں اور ان کی تحریک زندہ درگور دکھائی دیتی، اگر یہ نہ ہوتا تو الٰہی مقصد نامکمل اور انسانی کمال ناتمام رہ جاتا۔

اس اسلام کا قیاس ان اقراروں پر نہیں کیا جا سکتا جن میں خوف و رجاء حرص و طمع، اندیشۂ ماضی اور فکرِ فردا کے احتمالات پائے جاتے ہوں۔ سچ کہا تھا ابنِ ابی الحدید معتزلی نے کہ:۔

"اگر ابوطالبؑ کے خدمات نہ ہوتے تو اسلام کا کوئی رکن بھی قائم نہ ہو سکتا۔"

آپ ان خدمات کا تجزیہ کریں تو آپ کو ہر ہر قدم پر عقیدہ کی تجلّیاں اور ایمان کی ضو فشانیاں نظر آئیں گی۔ وہ پہلا دن جب حضرت عبداللہ کے بعد ایک رہا سہا محافظ (عبدالمطلب) دارِ دنیا سے گزر رہا تھا اور چلتے چلتے یہ وصیت کر رہا تھا کہ کاش میں اس بچہ کے اعلانِ تبلیغ تک زندہ رہتا تو اس کے ہاتھ پر بیعت کرتا۔ خیر اب جو میری اولاد میں رہ جائے اس کا یہی فریضہ ہے۔

کتنا حسین موقع تھا۔ ایک مختلف العقیدہ انسان کے لئے کہ اس کم سنی اور کس مپرسی کے عالم میں بچہ کا کام تمام کر دیتا۔ نہ بانس رہتا نہ بانسری، نہ محرک رہتا نہ تحریک، نہ صاحبِ عقیدہ و نظام رہتا نہ نظام و عقیدہ — لیکن ہمیں تو یہ کچھ نظر نہیں آتا۔

اب اگر یہ فرض بھی کر لیا جائے کہ ابوطالبؑ کو محمدِ عربیؐ کی نبوت کا علم نہیں ہو سکا تھا تو بحیرا راہب کے بیان کے بعد تو یہ حقیقت واضح ہو گئی تھی۔ اب کیا شبہ کی گنجائش تھی؟ اب کیا خطرہ تھا؟ اب تو وطن سے بھی دور تھے۔ وہیں خاتمہ کر دیا ہوتا۔ عقیدہ تو قرابت سے زیادہ قیمتی ہوتا ہے اور اس نبوت کا تو مطلب ہی عالمِ کفر و شرک کی کھلی ہوئی مخالفت تھا۔

فرض کیجئے اب بھی علم نہیں ہو سکا تھا۔ تو کیا اس وقت بھی علم نہ تھا جب مکّہ کے کوچے نعرۂ توحید سے گونج رہے تھے جب ہر آن کان میں "قُولُوا لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰه تفلحوا" کی آواز آ رہی تھی۔ یقیناً معلوم ہوا تھا تو کیا یہ بھی فرض کر لیا جائے کہ حضرت ابوطالبؑ میں مقابلے کی تاب و تواں نہ تھی یا پھر ان کے پاس اس تحریک کو دبانے کی صلاحیت نہ تھی۔ یا گود کے پالے ہوئے بچے کو بھی ختم کر دینا ممکن نہ تھا۔

یقیناً یہ سب کچھ ممکن تھا۔ لیکن ابوطالبؑ نے ایسا نہیں کیا اور یہی وہ تاریخی تجزیہ ہے جو ہر مؤرخ کے ذہن میں ابوطالبؑ کے ان نفسیاتی عوامل اور عقائدی محرکات کا تصور قائم کر سکتا ہے جو انھیں اس حیرت انگیز

موقف پر مجبور کر رہے تھے اور جن کی بنا پر وہ رسولؐ اسلام کی مسلسل کمک کر رہے تھے۔ میں نے مانا کہ رسولؐ کی ذاتی حفاظت اس رشتہ کی بنا پر تھی جو انھیں اپنے چچا سے حاصل تھا۔ وہ اس سلسلے میں اس قرابت کی پاسداری کر رہے تھے جس کا تصور ایک چچا کے دل میں اپنے یتیم بھتیجے کے لئے ہوتا ہے لیکن کیا اس کا مطلب یہ بھی ہے کہ اس کے دین کی بھی ترویج کی جائے اس کے مشن کو بھی کامیاب بنایا جائے؟ کیا قانوناً کا تقاضہ یہ نہ تھا کہ قرابت کا لحاظ کرتے ہوئے بچے کو سمجھا بجھا کر خاموش کر دیا جائے اور اگر وہ سکوت اختیار نہ کرے تو وہی کچھ اقدام کیا جائے جو عقیدہ و رشتے کے تصادم کے وقت کیا جاتا ہے۔

یقیناً قاعدہ یہی تھا لیکن یہاں تو معاملہ بالکل برعکس تھا۔ خاموش ہونا کیسا مزید بولنے کی دعوت دے رہے ہیں۔ روک دینا کیسا مزید تبلیغ پر آمادہ کر رہے ہیں ——— (طبری ج ۶ ص ۶۸-۶۴)

اس کا کھلا ہوا مطلب یہ ہے کہ حضرت ابوطالبؑ اس تحریک سے پوری طرح متفق تھے جسے رسولِ اسلام چلا رہے تھے۔ انھیں اس عقیدہ سے پوری ہمدردی تھی جو رسول اکرمؐ کے دل میں کروٹیں لے رہا تھا۔ انھیں دینِ الٰہی سے اسی طرح محبت تھی جس طرح ایک راسخ العقیدہ مسلمان کو ہوتی ہے۔

بات اسی حد پر ختم نہیں ہوتی بلکہ تاریخ ایک قدم اور آگے بڑھ جاتی ہے۔ اسلامی تحریک کی روز افزوں ترقی اور بڑھتی ہوئی کامیابی کو دیکھ کر کفار قریش حضرت ابوطالبؑ کے پاس آ کر یہ شکایت کرتے ہیں کہ اپنے بھتیجے کو اس تبلیغ سے روک دیجئے۔ حضرت نے اس مطالبہ کو باحسن وجوہ ٹال دیا۔ لیکن جب اُدھر سے اصرار بڑھا تو آپ نے اپنے موقف کی نزاکت کا خیال کرتے ہوئے بھتیجے تک یہ پیغام پہونچایا بیٹا!

"انّ بنی عمك هؤلاء زعموا انك تؤذيهم"

(یہ تمہارے رشتہ دار خیال کرتے ہیں کہ تم انھیں اذیت دیتے ہو۔)

میں اگر بفرضِ محال یہ تسلیم بھی کر لوں کہ حضرت ابوطالبؑ کچھ زیادہ حساس آدمی نہ تھے۔ ان کے دل میں اپنے مذہب کا درد نہ تھا۔ انھیں ذاتی طور پر اپنے دین سے کوئی خاص ہمدردی نہ تھی تو یہ بہرصورت قابلِ تسلیم نہیں ہے کہ کفار کے اس شدید اصرار و تاکید کے بعد بھی ان میں احساس نہیں پیدا ہوا اور انھیں اپنے دین کا درد پیدا نہیں ہوا۔

تو اب سوال یہ ہے کہ اگر ان میں اپنے مذہب سے ہمدردی تھی تو یہ انداز بیان کیا تھا؟ کیا انھیں سلیقۂ گفتگو اور اندازِ تخاطب سے بھی واقفیت نہیں تھی۔ چاہیئے تو یہ تھا کہ صاف صاف کہتے بیٹا! یہ سچ کہتے ہیں تم انھیں اذیت دیتے ہو' ان کے خداؤں کو برا بھلا کہتے ہو۔ ان کے مذہب کو انسانیت سوز اور توہینِ بشریت قرار دیتے ہو۔ تمہیں ان حرکتوں سے باز آجانا چاہیئے۔ ورنہ میں تمہیں ان کے حوالے کر دوں گا۔

لیکن یہاں تو معاملہ بالکل برعکس ہے۔ جب آنحضرتؐ نے فرمایا کہ اگر میرے داہنے ہاتھ پر سورج اور بائیں ہاتھ پر چاند بھی رکھ دیا جائے تو تبلیغ ترک نہیں کروں گا تو حضرت ابوطالبؑ نے صریح لہجہ میں کہہ دیا قریش والو!

واللہ ماکذب ابن اخی قط: خدا کی قسم! میرے بھتیجے نے غلط بات کہی ہی نہیں۔ (اسنی المطالب)

اگر کوئی ناقد بصیر اس کلمہ کی نفسیاتی تحلیل کرے تو اسے معلوم ہوگا کہ حضرت ابوطالبؑ ایمان و عقیدہ کے ساتھ اندازِ تخاطب پر کتنی قدرتِ کاملہ رکھتے تھے۔ رسولِ اکرمؐ سے بات نقول کی تو یہ کہہ کر کہ ان لوگوں کا خیال ہے اور ان لوگوں سے گفتگو کی تو یہ کہہ کر کہ میرا بھتیجا غلط گو نہیں ہے۔

مقصد یہ تھا کہ میرا اسلام نہ آج کے کفار و مشرکین پر ظاہر ہونے پائے اور نہ کل کے آنے والے مسلمانوں سے پوشیدہ رہ جائے۔ اس لئے آپ نے ایک ایسا امتزاجی قدم اُٹھایا جس سے رسولِ اسلام کا دل بڑھ گیا۔ ہمت بندھ گئی اور آپ نے یہ سمجھ لیا کہ یہ اندازِ کلام میری حمایت و نصرت کی طرف ایک کھلا ہوا اشارہ ہے چنانچہ ایک مرتبہ قوتِ قلب کا سہارا لے کر اُٹھ کھڑے ہوئے اور اعلان کر دیا کہ زمین و آسمان کے نظام میں تبدیلی ہو جائے لیکن تبلیغِ حق میں تبدیلی ناممکن ہے۔ اللہ رے قوتِ تدبیرِ ابوطالبؑ! آج کے ایک توریہ آمیز اقدام سے اسلام کی لاج رکھ لی۔ اور کفار کو حقیقت سے آشنا بھی نہیں ہونے دیا۔ کیا اتنا حکیمانہ موثر اقدام ابوطالبؑ کے علاوہ کوئی اور بھی کر سکتا ہے؟ اس مقام پر قریش سے گفتگو کرنے میں "خدا کی قسم" بھی خاص طور پر قابلِ توجہ ہے۔ ایک کافر اپنے ہم مذہب کے سامنے لات و عزیٰ کی قسم کھاتا ہے یا خدائے برحق کی!

میرا موضوعِ کلام چونکہ ایمان ابوطالبؑ کے ایجابی پہلو پر بحث کرنا ہے۔ اس کے مناظرانہ پہلوؤں کو چھیڑنا مقصود نہیں ہے اس لئے میں بعض ادلہ و براہین سے قطع نظر کئے لیتا ہوں ورنہ مجھے یہ کہنے کا حق ضرور حاصل تھا کہ شعب کی زندگی اور اس کی سختیاں برداشت کر کے نصرتِ رسولؐ کرنے والا مسلمان نہ ہوگا تو کیا وہ مسلمان ہوں گے جنھوں نے آل رسولؐ کے حق غصب کئے ان پر ظلم و ستم روا رکھا۔ مخدراتِ عصمت کو گرفتار کر کے کوفہ و شام کے بازاروں اور درباروں میں تشہیر کیا۔ کفار قریش کے مقابلہ میں اتنی جراُت مندی کے ساتھ نبوت کی تصدیق کر کے ان کے خیالِ خام کو زعم ناقص کا مرتبہ دینے والا مسلمان نہ ہوگا تو وہ معظمہ کیسے مسلمان ہوں گی جو ایک وقت میں جھلا کر رسولؐ اسلام ہی سے کہہ بیٹھیں کہ آپ کو یہ کیسے خیال ہوگیا کہ آپ نبی خدا ہیں۔؟

حقیقت امر یہ ہے کہ ان تمام بنیادی اقدامات اور اساسی خدمات کو رشتہ اور قرابت پر محمول کر دینا ایک ایسا جہالت خیز اور حیرت انگیز اقدام ہے جسے تاریخ و نفسیات، ضمیر و وجدان کے مذہب میں قابلِ معافی تصور نہیں کیا جا سکتا۔

ابوطالب جیسا لیق الفکر اور سلیم النظر انسان کسی وقت بھی ضمیر و وجدان، مذہب و دیانت کے خلاف ایسے اقدامات نہیں کرسکتا تھا جیسے اقدامات آپ کی پوری زندگی کے نمایاں پہلوؤں کی جگہ لئے ہوئے ہیں۔

آپ کے بارے میں بیانات

درحقیقت زیرِ نظر کتاب ہی وہ واحد کتاب ہے جس نے ترتیب و تنظیم ہمہ گیر و جامعیت کے اعتبار سے وہ انفرادی شان حاصل کی ہے جو اس موضوع پر تالیف شدہ کتابوں میں نظر نہیں آئی۔ طرفین کے بیانات کو جمع کرکے ان پر صحیح علمی تنقید کرنا مصنف کا ایک عظیم شاہکار ہے۔

میری نظر سے اب تک کوئی ایسی کتاب نہیں گزری جس نے اس انداز تحریر اور اس سلیقۂ ترتیب سے ان بیانات کو جمع کیا ہو، اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ سابق کے علماء نے سلیقہ سے کام نہیں لیا۔ بلکہ اس کی تمامتر ذمہ داری تاریخ کے سر ہے تاریخ اس قدر تیزی کے ساتھ آگے بڑھتی جارہی ہے کہ کل کی باتیں آج قدیم معلوم ہورہی ہیں کل کا سلیقہ آج کہنہ نظر آرہا ہے۔

یہ تمام تالیفات اپنے اپنے وقت کا شاہکار رہی ہوں گی۔ لیکن آج دُنیا تالیف کے جس سلیقے سے آشنا ہورہی ہے وہ ان تالیفات میں بڑی حد تک مفقود نظر آتا ہے اور زیرِ نظر کتاب میں نمایاں ہے۔

یہی وہ سلیقہ تحریر ہے جس کی داد "علامہ پولیس سلامہ" ادیب بیروت نے ان الفاظ میں دی ہے

"اگر مؤلف نے وکالت کا پیشہ اختیار کیا ہوتا تو وہ وکلاء کی صفِ اوّل میں ہوتے اس لئے کہ طریقۂ استدلال اور سلیقۂ استنتاج میں ان کی ایک انفرادی حیثیت ہے جو انکی کامیابی کی ضامن ہے"

میرا دل چاہتا ہے کہ اس مقام پر دو ایک باتوں کا اور اضافہ کردوں جو مؤلف کے قلم سے رہ گئی ہیں اور ان سے اسلام ابوطالبؑ پر اچھی خاصی روشنی پڑتی ہے۔

پہلی بات جناب ابراہیمؑ کی وہ دعا ہے جس میں آپ نے بارگاہِ الٰہی میں عرض کی تھی۔

وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَا أُمَّةً مُسْلِمَةً لَكَ "خدایا ہماری ذریت میں سے امتِ مسلمہ قرار دے"۔

ظاہر ہے کہ اُمت کا اطلاق ایک دو فرد پر مجاز ہوتا ہے۔ حقیقت کے لئے کم از کم تین فردوں کا ہونا ضروری ہے۔ حالانکہ حضرت عبداللہ کے یہاں ولادت سے پہلے اور حضرت حمزہ کے دنیا میں آنے کے قبل اُمت مسلمہ کے مصادیق میں حضرت عبدالمطلب اور حضرت عبداللہ کے سواء اور کوئی نہ تھا۔ لہٰذا اب اگر حضرت ابراہیمؑ کی دُعا کو با اثر اور مستجاب تسلیم کرنا ہے تو حضرت ابوطالبؑ کو امت مسلمہ کا ایک فرد تسلیم کرنا پڑے گا ورنہ دعائے خلیلؑ بے اثر اور طلب ابراہیمی بے اجابت رہ جائے گی۔

دوسری بات جناب ابوطالبؑ کا وہ خطبہ ہے جو آپ نے جناب فاطمہ بنتِ اسد سے عقد کرتے وقت پڑھا تھا جس سے ایمانِ کامل اور عقیدۂ راسخ کی شعاعیں پھوٹ پھوٹ کر نکل رہی ہیں۔ صاحب مواہب الواہب نے آپ کے اس تاریخی یادگار خطبہ کو ان الفاظ میں نقل کیا ہے۔

الحمد للہ رب العالمین رب العرش العظیم والمقام الکریم والمشعر والحطیم الذی اصطفانا اعلاماً وسادةً وعرفاء خلصاء وقادةً (تمام تعریفیں اس معبودِ برحق کیلئے ہیں جو تمام کائنات، عرش عظیم، مقام کریم اور مشعر و عظیم کا مالک ہے۔ اس نے ہمیں منتخب کرکے علم شرافت صاحب سیادت و معرفت اور اہلِ زعامت و ریاست قرار دیا ہے۔)

دنیا غور کرے کہ اعتراف ربوبیت و توحید سے بُت پرستی کی نفی اور اسلام کا اعتراف کس قدر نمایاں نظر آرہا ہے۔ مجھے تو حضرت ابوطالبؑ کی عظمت کی کوئی انتہا نہیں معلوم ہوتی جب میں آپ کے اس خطبہ کا آغاز الحمد للہ رب العالمین سے دیکھتا ہوں اور یہ دیکھتا ہوں کہ اس خطبے کے وقت تک قرآن کریم نازل نہیں ہوا تھا اور اس کا افتتاح اسی فقرہ سے ہوا ہے جس سے خالق کائنات نے اپنے کلام کا آغاز کیا ہے۔

تیسری بات ادیب بیروت پولیس سلامہ کا وہ فقرہ ہے جو انھوں نے اسی کتاب کی تقریظ میں تحریر کیا ہے۔ آپ فرماتے ہیں۔

"ان الیتیم استظل فی کنف عمہ صبیاً و یافعاً فلما بزغت شمس الیتیم مشی العم فی نورھا" (پہلے یتیم عبداللہ نے بچپن اور جوانی کی منزلیں اپنے چچا کے سایہ میں گزاریں اور بعد میں جب نورِ رسالت جگمگا اٹھا تو خود چچا بھتیجے کے سایہ میں چلنے لگا۔)

کیا کہنا اس نشوونما کا کہ نبیؐ کی تربیت کے ساتھ ساتھ اپنی روحانی منزلیں بھی طے ہورہی ہیں۔

میرا مقصد اس طولانی تمہید سے اظہارِ فضل و کمال یا کوئی دوسرا مطلب نہ تھا میں تو صرف یہ چاہتا تھا کہ آپ کتاب کے مطالعہ سے پہلے ہی اس کے انداز بیان سے آشنا ہوجائیں اور آپ کے سامنے وہ حقائق بھی آجائیں جو اصل کتاب میں درج نہیں ہوسکے تھے۔

اب آپ سے التماس ہے کہ کتاب کا مطالعہ کرتے وقت حسب ذیل نکات پر ضرور توجہ رکھیں۔

ا۔ یہ کتاب چونکہ "عربی" جیسی وسیع زبان کا ترجمہ ہے۔ اس لئے اس کے بیان میں وہ شگفتگی پیدا نہیں ہوسکی جس کی توقع ہر مطالعہ کرنے والے کو ہوتی ہے۔

۲۔ کتاب میں اکثر بیانات دوسرے لوگوں کے ہیں جو نظریاتی یا مذہبی اعتبار سے ہمارے مخالف ہیں اس لئے ان کے جسارت آمیز کلمات کو مؤلف یا مترجم کی رائے پر محمول نہ فرمائیں بلکہ ہر ایسے کلمہ کے ساتھ ایک "معاذ اللہ" یا "استغفر اللہ" ضرور کہہ لیا کریں۔

۳۔ چونکہ ارکان مکتبہ تعمیر ادب کی تعجیل، اپنی عادت اور ماہ رمضان کی برکت کی وجہ سے یہ ترجمہ اوّل ماہ رمضان سے لے کر نیم رمضان کے اندر تمام کیا گیا ہے۔ اس لئے اس میں ادبی یا غیر ادبی اغلاط نظر آجائیں تو مجھے براہ راست مطلع فرمائیں تاکہ آئندہ اشاعت میں اس کا تدارک کر دیا جائے یا پھر کسی دوسرے ذریعہ سے ناظرین کو متوجہ کر دیا جائے۔

اتنی سمع خراشی کے بعد میں آپ سے دوسری ملاقات تک کے لئے رخصت ہوتا ہوں۔

آپ کا مخلص اور آستانہ علی ابن ابی طالبؑ کا مجاور

حیدر جوادی

النجف الاشرف

۱۰ رشوال المکرم ۱۳۸۴ھ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝

وقال رجل مؤمن من آل فرعون یکتم ایمانہ أتقتلون رجلاً ان یقول ربی اللہ وقد جاءکم بالبیّنات من ربکم

آل فرعون کا وہ مرد مجاہد جو اپنے ایمان کو چھپائے ہوئے تھا۔ قوم سے مخاطب ہو کر کہنے لگا کیا تم کسی شخص کو صرف اس لئے قتل کرنا چاہتے ہو کہ وہ اللہ کو اپنا پروردگار کہتا ہے جبکہ وہ اللہ کی طرف سے تمہارے پاس دلائل بھی لایا ہے۔

وجاء من اقصی المدینۃ رجل یسعی قال یٰقوم اتبعوا المرسلین اتبعوا من لا یسئلکم اجراً وّھم مھتدون ومالی لا اعبد الذی فطرنی والیہ ترجعون ۝

آخر شہر سے ایک شخص دوڑتا ہوا آیا اور اس نے کہا اے قوم والو! رسولوں کا اتباع کرو یہ تم سے کسی اجرت کے طالب نہیں ہیں۔ اور ہدایت یافتہ ہیں۔ آخر ہم اپنے خالق کی عبادت کیوں نہ کریں جب کہ تم سب اسی کی بارگاہ میں پلٹ کر جاؤ گے۔

أَلَمْ یَجِدْکَ یَتِیْمًا فَاٰوٰی وَوَجَدَکَ ضَآلًّا فَھَدٰی وَوَجَدَکَ عَآئِلًا فَاَغْنٰی ۝

اے رسولؐ! کیا تمہیں پروردگار نے یتیم دیکھ کر پناہ نہیں دی۔ کیا تمہیں گم گشتہ پا کر متعارف نہیں کرایا کیا تمہیں غربت کے عالم میں مستغنی نہیں بنایا۔

آستانۂ تاریخ و تقدیس

اس وقت میرے سامنے ایک ایسے انسان کی سیرت ہے جس کی تاریخ زندگی کے ساتھ ہوا و ہوس کھیلتے رہے اور کرایہ کے قلم صراطِ مستقیم سے منحرف ہو کر حقیقت پر گہرا پردہ ڈالتے ہوئے ان کا ساتھ دیتے رہے کریں طرزِ عمل ان قلموں کا ہر اس واضح حقیقت کے ساتھ رہتا ہے جو ان کے خواہشات و جذبات پر پابندی لگانا چاہتی ہو۔

یہ وہ انسان تھا جس نے تاریخ میں اپنی سیرت کے خطوط سنہری حرفوں سے کھینچے ہیں اور اسی لئے یہ انسان مجاہدین کی صفِ اوّل اور انصارِ دین و پیغمبرانِ انسانیت کے طبقۂ اوّل میں شمار ہوتا ہے۔

یہ وہ انسان تھا جس نے دینِ محکم کی اس وقت نصرت کی جب تمام قلوب جور و جفا پر آمادہ تھے تمام آنکھوں کی تند نگاہی سے حسد و عداوت کے شرارے نکل رہے تھے۔ اور قدم قدم پر طغیان و عصیان اور ایسے انقلاب کے اندیشے تھے جو اس شعلۂ حقانیت کو خاموش کر دینے کے لئے مسلسل کوشاں تھے ـــــ لیکن ادھر نورِ الٰہی "دینِ جدید" کی طرف ہاتھ بڑھے اور ادھر یہ انسان پوری قوت کے ساتھ تحدی کر کے کھڑا ہو گیا اور ان تمام ہاتھوں کو پلٹا دیا جنھیں اپنی کامیابی کا پورا اطمینان تھا۔ چنانچہ اس نصرت کا لازمی نتیجہ تھا کہ حسد و کینہ کا رُخ اس ناصرِ اوّل ہی کی طرف مڑ جائے جیسا کہ مثل مشہور ہے کہ "گھوڑے کا غصہ لگام پر اُترتا ہے"۔

یہ وہ انسان تھا جس نے شجرِ اسلام کو اس وقت سینچا اور بچایا جب تند ہوائیں چل رہی تھیں اور وہ ایک نرم ناخن "بچّہ" کے مانند تھا چنانچہ وہ بڑا قوی ہوا اور اس کی شعاعیں پھیلیں اور دشمن اس وقت تک اس کا کچھ نہ بگاڑ سکے جب تک کہ چشمۂ فیض اُبلتا رہا اور یہ مخلص محافظ زندہ رہا۔

یہی وہ انسان تھا جس کی اسلام میں ایک حیثیت ہے جس نے آثارِ جمیلہ اور افضال باقیہ چھوڑے ہیں لیکن افسوس کہ ابنائے خواہشات ان آثار سے نظر موڑ کر اس انسان پر ظلم کرنے کے لئے

آمادہ ہو گئے اور جوہرِ حق و رونقِ فضیلت کو بدنام کرنے کے لئے خرافات وضع کرنے لگے۔

معروف خلافتِ راشدہ کا زمانہ ان آثار و احسانات کو اپنے دل پر ثبت کر کے گزر گیا اور اب اس ملوکیت اور ظالم سلطنت کا دور آ گیا جس کا فریضہ حضرت علیؑ کی تنقیص تھا اس لئے کہ اس کی بنیاد ہی حق علیؑ کے غصب پر تھی۔ چنانچہ انھیں وسائلِ تنقیص و تحقیر میں ایک یہ بات بھی تھی کہ ان کے والدِ محترم کی شان میں جسارت کی جائے۔

اب کیا تھا گھٹیا ضمیر کچے دل جو روزانہ ایک نئے رنگ کے عادی تھے جنھیں نہ فضیلت کی قدر و قیمت معلوم تھی اور نہ رذالت کی حدود تعریف باقاعدہ کرایہ پر چلنے لگے۔

اس تجارت میں ذمہ داریاں بکتی تھیں، عہد و پیمان ٹوٹتے تھے، حق کو باطل اور باطل کو حق بتایا جاتا تھا۔ دینِ خدا کو معمولی رقم یعنی چند ذلیل دینار کھوٹے درہم اور غصبی مال پر بیچا جاتا تھا تاکہ اپنے پست مقصد کو حاصل کیا جائے اور ذلیل دل کو راضی کر کے حکومتِ وقت کو خوش کیا جائے۔

یہی وجہ تھی کہ حکومت نے تمام وسائلِ انہدام کا رُخ اسی بنیادِ فضائل کی طرف موڑ دیا اور اپنے خیال میں یہ طے کر لیا کہ وہ اپنے مقصد میں فوراً کامیاب ہو جائے گی۔ ظاہر ہے کہ ایسی تجارت صرف سیاہ رات کی تاریکیوں میں ہو سکتی تھی۔ چمگادڑ کی تمام تر دوا دوش اور پرواز رات کی تاریکی میں ہوتی ہے جب نور کی شعاعیں نہیں ہوتی ہیں اس کی خواہش بھی یہی ہوتی ہے کہ یہ رات طولانی ہوتی جائے تاکہ پرواز کی فضا میں ہمارا کوئی شریک نہ ہو سکے۔

حکومتِ وقت نے بھی اپنی سیہ کاریوں کے تحفظ کے لئے ایسے اسباب مہیا کرنا شروع کر دیئے جس سے جہالت و ضلالت کی تاریکی باقی رہ جائے۔

(۴)

خواہشات اُٹھے اور انھوں نے تاریخ کا رُخ موڑ دیا۔ ارادہ یہ تھا کہ حالات کو بالکل منقلب کر دیا جائے۔ ضمیروں کو مسخر کر دیا گیا اور حسبِ خاطر حدیثیں وضع ہونے لگیں۔ وہ لوگ جن کے دل میں اسلام نے جڑ نہیں پکڑی تھی جنھیں جاہلیت سے پوری طرح نجات نہیں ملی تھی۔ دین کو منہدم اور تباہ و برباد کرنے پر آمادہ ہو گئے اور وضعِ احادیث ایک کامیاب سرمایہ کا کام دینے لگی۔

اس بلیک مارکٹ کے تین رکن تھے۔

۱۔ فضائلِ علیؑ کا مخفی کرنا

۲۔ حضرتؑ کے خلاف احادیث وضع کر کے آپ کی شان کی آیتوں کو دوسروں کی طرف اور دوسروں

کی مذمت کی آیات کو آپ کی طرف موڑ دیا۔

۳ ـ دیگر صحابہ کی شان میں روایتیں گھڑنا [1]

اس بازار کے تاجر اوّل معاویہ نے دیکھا کہ یہی تجارت اس کی سلطنت کی خشتِ اوّل ہے چنانچہ اس نے مختلف طریقوں سے کوشش کر کے اپنی بات کو کامیاب بنایا۔ متزلزل عقائد، لباتی اور بے جان دین، تڑپتے ہوئے خواہشات، مچلتے ہوئے اغراض، چمکتے ہوئے سونے کے سکے۔ سب مل کر اس سیہ کاری میں شریک ہو گئے۔

اربابِ غرض، اصحابِ ہوا و ہوس نے اس طریقے کو اپنی پیاس بجھانے کا بہترین وسیلہ تصور کیا۔ معاویہ نے موقع غنیمت دیکھ کر اس نرم و نازک زندگی پر ایک بھاری بھرکم بوجھ لاد دیا کہ سب اس کے امر کی اطاعت کرنے لگے بلکہ بغیر امر بھی جویائے تقرب ہو گئے۔

معاویہ نے اپنے عمال کو یہ فرمان بھیجا کہ جو شخص بھی ابو تراب اور اہلِ بیت کے فضائل بیان کرے گا میں اس کا ذمہ دار نہیں ہوں۔ اب کیا تھا خطباء ہر منبر سے آمادۂ طعن ہو گئے اہلِ بیت سے برائت اور ان کی مذمت شعار بن گئی۔ تقریباً (۷۰) ہزار اسلامی منبروں سے حضرت پر لعنت شروع ہو گئی (معاذ اللہ)

عوام تو خطیبوں پر ہی اعتماد کرتے ہیں اور انہی کی باتوں کی تصدیق کرتے ہیں۔ ستر ہزار منبروں کی مجلسوں میں کتنے افراد ہوں گے۔ پھر ان افراد کے زیرِ نگرانی کتنے اطفال و خواتین کے گروہ ہوں گے جو سب کے سب اس خطیب پر اعتماد کریں گے اور اسی کی بات پر عمل کریں گے

معاویہ نے دوبارہ حکم دیا "شیعیانِ [2] علیؑ و اہلِ بیتؑ کی شہادت قبول نہ کرو"

کیوں۔؟ تاکہ شیعہ تنگ دل ہو جائیں۔ ان کی عزت گھٹ جائے اور وہ شدائد اعداء اور آلامِ زمانہ کے ہدف بن جائیں۔ اس کے بعد اس کے مقابلے میں عثمان و پیروانِ عثمان کے فضائل میں روایت بیان کرنے کے لئے انعامات و عطایا مقرر کرائے اور فرمان جاری کر دیا کہ [3] عثمان کی شان میں روایتیں زیادہ ہو گئی ہیں، تمام شہروں اور دیہاتوں تک ان کی رسائی ہو گئی ہے۔ لہٰذا اس حکم کے بعد سے لوگوں کو صحابہ اور خلفاء کی شان میں روایتیں وضع کرنے کی دعوت دو۔ اگر ابو تراب کی فضیلت میں کوئی روایت نظر آجائے تو اس کی جوڑ پر

---

[1] شرح نہج البلاغہ ج ۳ ص ۱۵

[2] شرح نہج البلاغہ ج ۲ ص ۱۵

[3] شرح نہج البلاغہ ج ۳ ص ۱۵

صحابہ کی شان میں بھی تیار کرو۔ یہی بات میری پسندیدہ اور میری آنکھوں کی ٹھنڈک ہے۔ اسی بات سے ابو تراب کی دلیل باطل اور عثمان کے فضائل و مناقب مضبوط ہوں گے۔

ادھر کسی مقام پر خط پہنچا اور اُدھر خیالات گردش کرنے لگے۔ روایتیں تیار ہونے لگیں۔ احادیث کی افراط ہونے لگی۔ کچھ صحابہ کی فضیلت میں تو کچھ علیؑ کی منقصت میں۔ (جو ان تمام اعمال کا آخری اور واقعی مقصد تھا) ہمیں ضرورت نہیں ہے کہ ہم ان روایات کی قدر و قیمت ظاہر کریں جو فضائل صحابہ میں وضع کی گئی ہیں۔ اور جن میں غلو اور جہالت کے سوا کچھ نہیں ہے یا ان روایات کی حقیقت کا اعلان کریں جو حضرت علیؑ کی مخالفت میں وضع کی گئی ہیں اور جن میں بغض و عداوت کے علاوہ کچھ نہیں ہے اس لئے کہ میدانِ تنقید میں اُن کی قدر و قیمت سب کو معلوم ہو چکی ہے۔ اس میدان میں ایسی روایتیں کیونکر ٹھہر سکتی ہیں جو ناجائز طور پر پیدا ہوئی ہیں یا جن کی بنیاد حق نمک کی دیوار پہ ہے۔ ادھر ذرا سا پانی پہنچے گا ادھر ساری عمارت منہدم ہو جائے گی۔

اس کے باوجود برسرِ کار حکومت اور معاویہ کا شوقِ تجارت تھا جس نے اس بازار کو اس قدر رواج دیا کہ اب کسی متاع میں خسارہ کا اندیشہ نہ رہا اور کسی سرمایہ میں بے پناہ منفعت کے علاوہ کوئی اور احتمال ہی نہ رہا اب یہ حدیثیں نہ منبروں سے بیان اور مدرسوں میں پڑھائی جانے لگیں اور بچوں کو اس طرح حفظ کرائی جانے لگیں جس طرح قرآن حفظ کرایا جاتا ہے یا اس سے بھی کچھ زیادہ پُر زور طریقے پر۔

یہی وہ اسباب تھے جن کی بناء پر روایتیں عام ہوئیں۔ چار طرف ان کا رواج ہوا۔ مختلف مقامات پر ان کی شہرت ہوئی۔ دوسری طرف اس غیر محدود منفعت نے اثر دکھلایا جس سے صاحبِ کارخانہ اور درآمد برآمد کرنے والے سب ہی مستفید ہوتے تھے۔ یعنی روایت وضع کرنے والا بھی مستفید تھا اور اس کا تعلیم دینے والا بھی اور انھیں کے ساتھ تعلیم لینے والے بھی۔ !

اب تاجرِ اوّل معاویہ نے ایک نیا حکم جاری کیا۔

"دیکھو [4]! جس کے متعلق شہادت و بیّنہ قائم ہو جائے کہ علیؑ و اہلِ بیتؑ کا دوست ہے اس کا نام رجسٹر سے کاٹ دو اور اس کا عطیہ و رزق بند کر دو۔"

یہی ایک چیلنج اور اقتصادی مار نہیں بلکہ ایک خط اور بھی جاتا ہے:

"جو شخص محبتِ اہلِ بیت میں متہم ہو جائے اس پر بھی سختیاں کرو اور اس کا گھر منہدم کر دو۔"

---

[4] وہی سلسلہ آج تک جاری ہے

[5] شرح نہج البلاغہ

اب محاصرہ اور بھی سخت تر ہوگیا۔ ایک ذرہ برابر محبتِ اہلِ بیتؑ والے انسان کی سزا یہ قرار پائی کہ اسے بُرائی اور سختی کا ہدف و نشانہ بنایا جائے۔ اس کا نام رجسٹر سے کاٹ دیا جائے۔ اس کا وظیفہ بند کردیا جائے۔ اسے شہری حقوق نہ دیئے جائیں اس کی فکر و نقل و راے پر پابندی لگادی جائے اور ان تمام باتوں کے علاوہ اسے ذلیل و خوار اور اتنا خوف زدہ بنادیا جائے کہ وہ ہر آن اپنے لئے مصیبت یا انہدام خانہ کا منتظر رہے۔

معاویہ نے انہیں جفاکار اور عدل سوز احکام پر اکتفا نہیں کی بلکہ ان کی تطبیق کی فکر بھی شروع کردی۔ چنانچہ عراق میں اپنے خود ساختہ بھائی زیادؔ کو والی بنادیا تھا تاکہ شیعوں پر مصائب کی شدت ہوجائے۔ اس لئے کہ زیاد ان لوگوں سے واقف، ان کے مکانات سے باخبر اور اپنی گمراہی سے پہلے ان لوگوں سے قریب رہ چکا ہے[۱]۔

معاویہ نے اس متاع کی خرید و فروخت میں بڑی ذہانت سے کام لیا اور کوئی ایسا موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیا جس میں اس کا کوئی ذاتی فائدہ ہو۔ رشوت، تقسیم مال و منصب تو معمولی قیمتیں تھیں جن سے معاویہ اس بلیک مارکیٹ کے ضمیروں کو نہایت آسانی کے ساتھ ایک بڑی تعداد میں خرید رہا تھا۔ اس کے لئے یہ بات انتہائی آسان تھی کہ روزانہ ایک ضمیر خریدے، ایک ذمہ داری بیچے اور ایک باایمان کے ایمان کو تباہ کرے۔

اور ان تمام باتوں کا مقصد صرف ایک تھا کہ حضرت علیؑ کے منصب پر فائض ہونے کے لئے انہیں بدنام کیا جائے اس کے لئے ہر ممکن وسیلہ اختیار کیا جائے اور یہ معاویہؔ سے قطعی بعید نہیں تھا کہ وہ اہلِ شام کے درمیان جنھیں اونٹ اور اونٹنی کا فرق معلوم نہیں تھا۔ یہ مشہور کردے کہ "علیؑ تارک الصلوٰۃ ہیں۔ انھوں نے عثمان کو قتل کرایا ہے۔ لہٰذا اب سب کا فرض ہے کہ ان سے قصاص لیں۔"

معاویہ کو اس طغیان و سرکشی سے روکنے والی کوئی طاقت نہ تھی۔ نہ دین نہ اخلاق اور نہ انسانیت

---

[۱] مجھے یہ تصور بھی نہ تھا کہ آج بیسویں صدی میں جب کہ اُس تاریک ماضی کے اثرات ختم ہوچکے ہیں۔ ضمیر فروشی اور حق پوشی کے بازار سرد پڑچکے ہیں کوئی ایسا شخص بھی پیدا ہوگا جس کی فطرت میں اس ماضی قدیم کے اثرات موجود ہوں گے اور اسے بھی معاشرہ کی فضا مسموم بنانے سے دلچسپی ہوگی۔ لیکن افسوس محسن سندوبی کی ایک عبارت "البیان والتبیین" کی شرح میں زیاد کے حالات میں نظر پڑگئی۔ فرماتے ہیں:۔ "زیاد کا علیؑ سے اعراض کرکے معاویہ سے مل جانا کوئی ایسی بات نہیں ہے جس کی بنا پر اس کی عقل یا فضیلت پر حرف لایا جائے اس لئے کہ معاویہ نے اسے اپنا بھائی بنایا تھا اور رشتہ کی بات ہی اور ہوتی ہے کاش میرے پاس اس مہمل کلمہ کی تنقید کی گنجائش ہوتی ←

چنانچہ اس نے اپنے کو مطلق العنان اور آزاد محض فرض کرکے اپنا کام شروع کردیا۔ منکرات کی ایجاد اس تفنن سے شروع کی کہ کوئی مانع نہیں رہا۔ خرافات و مہملات میں یوں ڈوب گیا کہ کوئی روکنے والا نہیں رہا۔ کذب و افترا کی یوں انتہا کردی کہ کوئی منع کرنے والا نہیں رہا۔ باطل پر فخر و مباہات کا سلسلہ جاری کردیا۔ اور کسی کو غصہ بھی نہ آیا۔ سچ ہے ؎

اذا رزق الفتی وجہاً وقاحا | تقلب فی الامور کما یشاء

"جب انسان کی آنکھوں کا پانی مرجائے تو جو چاہے کرے سب ٹھیک ہے!"

میرے حیرت و استعجاب کی اس وقت کوئی انتہا نہ رہی جب میں نے اسی شرح کے ج ۲ ص ۱۹۳ پر سات سطروں کا وہ بیان دیکھا جس میں فاضل سندوبی نے متواتر احادیث، مسلّم الثبوت روایات اور صحاح مسلمہ میں مذکور اخبار کی مخالفت کرتے ہوئے فرقۂ اباضیہ کی موافقت فرمائی ہے۔ رسول اکرمؐ کا ارشاد ہے کہ "خوارج دین سے اس طرح خارج ہوں گے جس طرح کمان سے تیر نکلتا ہے"۔ اور فاضل موصوف انہیں "افضل اہلِ قبلہ" دشمنِ بدعت اور ان تمام اتہامات و افتراآت سے بری قرار دیتے ہیں جنھیں بعض مسلمانوں نے ان کی طرف منسوب کیا ہے۔

یہی نہیں بلکہ فرماتے ہیں کہ "سابقاً میں بھی اس فرقے کے دشمنوں کے بیانات سے فریب کھا گیا تھا اور اس لئے بعض اتہامات جلد اول میں درج کردیئے تھے لیکن بعد میں یہ انکشاف ہوا کہ یہ لوگ بہترین مسلمان اور ہر مسئلے میں کتاب و سنت کی طرف رجوع کرنے والے ہیں۔ آپ جاحظ کی مذمت سے متاثر نہ ہوں۔ اس لئے کہ سابقاً یہ فرقہ معتزلہ کا مخالف تھا۔ اس لئے جاحظ نے یہ باتیں درج کردی ہیں۔ خدا تمام مسلمانوں سے خوش رہے۔"

جنابِ فاضل دین سے تیر کی مانند نکل جانے والوں سے اس قدر خوش ہیں۔ خدا جانے ان روایات

← تو میں بتاتا کہ اس میں کس قدر گمراہی، ضلالت، کذب، افترا اور اسلام کشی کے جراثیم پائے جاتے ہیں اور موصوف نے ایک کلمہ سے اسلام کی مسلّم تعلیم "بچہ صاحبِ فراش کا ہوتا ہے" کی مخالفت کی پھر ولد الزنا کو زانی سے ملحق کیا اور امام وقت کی بغاوت کو معصیت شمار کرنے سے انکار کردیا۔

بلکہ ایسے افعال و اعمال کو عقل و فضیلت کے ارتقاء کی دلیل قرار دے دیا۔ افسوس!

کس قدر فرق ہے سندوبی کے اس بیان میں اور جاحظ کی اس تنقید میں جس میں معاویہ کے اس فعلِ قبیح کو باعث کفر قرار دیا گیا ہے۔

کے بارے میں آنجناب کی کیا رائے ہے۔ آخر یہ کیونکر ممکن ہے کہ اللہ تمام مسلمانوں سے خوش ہو جائے جبکہ ان کے درمیان وہ خوارج بھی داخل ہیں جو دین سے خارج ہیں۔ انھیں تو عام مسلمان علاوہ چند خارجی الفکر افراد کے اسی نظر سے دیکھتے ہیں جس نظر سے رسولِ اکرمؐ نے دیکھا ہے ان کی نمازوں کو تماشہ اور ان کی تلاوتِ قرآن کو لقلقۂ لسان تصور کرتے ہیں جیسا کہ آنحضرت نے فرمایا ہے۔ درحقیقت یہ خوارج ان منافقین کی بڑی تصویریں جو اپنے اعمال سے رسول اسلامؐ کو فریب دینے کی فکر میں تھے۔ یا ان منافقین کی مکمل تصویریں ہیں جو سادہ لوح عوام کو دھوکے دیا کرتے تھے جیسا کہ ہمارے فاضل سندوبی کو دے دیا۔

ہمارا خیال ہے کہ یہ حضرت کچھ خارجی المسلک ہیں کہ اس شرح میں جہاں بھی خوارج کا ذکر آتا ہے پورے حاشیہ میں مدح وثنا کے دفتر کھول دیتے ہیں۔ تعریف و توصیف کے پل باندھ دیتے ہیں اور جب کسی شیعہ کا ذکر آتا ہے تو یا اعراض کر جاتے ہیں یا پھر نہایت درجہ اختصار سے کام لیتے ہیں۔ علاوہ ان بعض افراد کے جن کی شخصیت نے خود ہی طولِ کلام پر مجبور کر دیا ہو۔

یہ زیادہ کی ہمدردی، خوارج کی محبت اور شیعوں سے عداوت ان تمام باتوں کا سرچشمہ صرف ایک ہے اور وہ ہے علیؑ کی دشمنی اور یہ اسی تخمِ عداوت و بغاوت کا ثمر ہے جسے اپنے عہدِ حکومت میں معاویہ نے بویا تھا تاکہ امیرالمومنینؑ کو اسلامی سلطنت سے الگ کر دے!

سمرہ بن جندب[1] جو روایات کا ایک بڑا تاجر تھا اس کو معاویہ نے بلا کر ایک لاکھ درہم دیئے کہ

---

[1] شاید اس مقام پر یہ بات مناسب ہو کہ ہم آپ کے سامنے سمرہ کی ایک مختصر داستان پیش کر دیں۔

"مسند احمد بن حنبل ج ۱ ص ۲۵ میں ابن عباس سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ حضرت عمر سے ذکر کیا گیا ان تک خبر پہونچی کہ سمرہ نے شراب بیچی ہے تو انھوں نے فرمایا کہ خدا سمرہ کا برا کرے۔ پیغمبر اکرمؐ نے فرمایا ہے کہ اللہ نے یہودیوں پر چربی حرام کی تھی لیکن انھوں نے اس کی بھی خرید و فروخت کی۔" سمرہ کی تاریخ میں ایسے دردناک جرائم بھی ہیں جن سے سنگ دل لوگوں کی آنکھوں سے آنسو نکل آئیں۔ بصرہ میں زیاد نے اسے عامل بنا دیا تو اس نے آٹھ ہزار افراد کو تہِ تیغ کر دیا (کیا کہنا نائب اور منوب عنہ کا) اس تعداد کو دیکھئے اور حکام جور کی خونریزی کا اندازہ کیجئے جب ایک وقتی حاکم ۸ ہزار خون بہا سکتا ہے اور وہ بھی اس دیدہ دلیری کے ساتھ کہ جب زیاد نے محاسبہ کیا "کیا تو نے کسی بے گناہ کو قتل کیا ہے۔" تو جواب دے دیا کہ میں اتنے ہی اور قتل کر سکتا ہوں۔ گویا امت کی کوئی قدر و قیمت ہی نہیں۔ اب تو یہ عالم ہے کہ سمرہ کی سواری نکلے اور راستہ میں جسے چاہے بے گناہ قتل کر دے۔ چنانچہ ایک مرتبہ اس کی سواری گزر رہی تھی کہ لشکر کے صفِ اول کے کسی آدمی نے ایک شخص کو زخمی کر دیا۔ وہ ←

اس آیتِ شریفہ کو علیؑ کی شان میں نازل کرو۔

ومن الناس من یعجبک قولہ فی الحیوٰۃ الدنیا ویشھد اللہ علی ما فی قلبہ وھو الد الخصام واذا تولی سعی فی الارض لیفسد فیھا ویھلک الحرث والنسل واللہ لا یحب الفساد ط

بقر ۲۰۴ - ۲۰۵

"بعض افراد ایسے ہیں جو رسولؐ سے باتیں ملاتے ہیں، خدا کو اپنا گواہ قرار دیتے ہیں حالانکہ بڑے دشمن ہیں۔ ان کا مقصد تباہی و بربادی ہے اور یہ اللہ کو پسند نہیں ہے۔"

اور اس آیت مبارکہ کو ابنِ ملجم کی شان میں روایت کر دے۔

ومن الناس من یشری نفسہ ابتغاء مرضات اللہ ط (سورہ بقرہ ۲۰۷)

"کچھ لوگ ایسے ہیں جو رضائے الٰہی کی خاطر اپنے نفس کو بیچ ڈالتے ہیں۔"

سمرہ نے خیال کیا کہ یہ معمولی رقم تو ایک آیت کی تحریف کے لئے بھی کافی نہیں ہے چہ جائیکہ دو دو آیتیں۔ چنانچہ اس نے بھاؤ بڑھانا شروع کیا اور دو آیتوں کا مقابلہ ۴ لاکھ درہم پر طے ہو گیا۔ اور سمرہ نے یہ بیان دے دیا۔[1]

معاویہ کا مقصد تھا کہ وہ ایک جماعت کو کرایہ پر لے لے جو حضرت علیؑ کی تنقیص کے لئے روایتیں وضع کرے۔ چنانچہ اس نے صحابہ اور تابعین کے ایک گروہ کا انتخاب کیا جو زمانہ کی نظر میں مقدس و

→ خون میں لوٹ رہا تھا کہ سمرہ قریب سے گزرا اس نے بغیر کسی درد و رنج کے اعلان کر دیا کہ جب ہماری سواری تیار ہو جائے تو ہمارے نیزوں سے بچو۔

سمرہ اس بے حیائی اور ذلتِ نفس کے بعد ان افراد میں کا ایک ہے جن کی نفسیات کا گہرا مطالعہ معاویہ نے کیا تھا اور یہ طے کر لیا تھا کہ یہ لوگ اس کی خواہش کو پورا کر سکتے ہیں اور اس کے ہوا و ہوس میں اس کے ہم سفر بن سکتے ہیں۔

چنانچہ خود سمرہ کہتا ہے کہ "اگر معاویہ کی طرح میں اللہ کی اطاعت کرتا تو کبھی مجھ پر عذاب نہ ہو سکتا" لیکن اس نے معصیتِ خدا کے ذریعہ معاویہ کی اطاعت کی تو اب عذابِ الٰہی کا اندازہ کیجئے۔ ہم نے اس مقام پر نہایت ہی اختصار سے کام لیا ہے۔ ورنہ اگر آپ سمرہ کے حالات زندگی کا جائزہ لینا چاہیں تو طبری ج ۴ ص ۱۷۶ - غدیر ج ۱۱ ص ۲۹ سے ۳۴ کا مکمل مطالعہ کریں۔

[1] شرح نہج البلاغہ ابن ابی الحدید ص ۳۶۱، الغدیر ج ۱۱ ص ۱۰۱، ۱۰۲، ۱۳۰

محترم تھا، تاکہ اسی کو اپنی کمزور بنیادوں کا ستون قرار دے۔[۱]

یہ گروہ جس نے معاویہ کے ساتھ دُنیا کا مفید ترین اور آخرت کا مضر ترین معاملہ کیا تھا اس میں ابوہریرہؓ عمرو بن العاص، مغیرہ بن شعبہؓ اور عروہ بن زبیر جیسے افراد نمایاں تھے۔ ان لوگوں نے ایسی روایتیں وضع کرنا شروع کیں جن سے حضرت علیؑ کی توہین ہو، ان سے برأت کی جائے اور اس کے صلہ میں معاویہ سے ایسے انعامات حاصل کئے جائیں جو ابنِ ابی الحدید کی زبان میں قابلِ رغبت حد تک وافر و دانی ہوں۔

زہری کے بیان کے مطابق عروہ بن زبیر نے حضرت عائشہ سے یہ روایت نقل کی کہ آپ نے رسول اکرمؐ کے پاس بیٹھ کر علیؑ و عباسؓ کو آتے دیکھا تو آنحضرتؐ نے فرمایا "اے عائشہ! یہ دونوں ہمارے دین و ملت کے علاوہ دوسرے دین پر مریں گے۔"[۲]

پھر دوسری روایت یہ وضع کی کہ حضرتؐ نے عائشہ سے فرمایا کہ اگر تم دو اہلِ جہنم کو دیکھنا چاہتی ہو تو

۱؎ مجھے بار بار حیرت ہوتی ہے ایسے افراد کو دیکھ کر جو تمام صحابہ کی تقدیس و تنزیہ پر اس طرح مُصر ہیں کہ کسی کے خلاف کچھ سننے پر تیار نہیں ہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ لوگ اپنے اس تصور کو قرآن و سنّت کے ان فرامین کے ساتھ کس طرح جمع کرتے ہیں جن میں عہدِ رسولؐ میں نفاق کے پھیل جانے کا تذکرہ ہے۔ کم از کم آیۂ انقلاب، ذکرِ منافقین مدینہ، ذکرِ اعراب، سورۂ منافقون اور صحاحِ معتبرہ میں حدیث حوض کا تذکرہ تو موجود ہی ہے بلکہ اگر یہ سب نہ بھی ہوتا تو بھی ہم تمام صحابہ کی تقدیس کے لئے تیار نہ تھے۔ ان کی جماعت میں معاویہ جیسے لوگ بھی شامل ہیں۔ جن کا مقصد ہی دین کی رسی کی گرہیں کھول دینا تھا۔ چہ جائیکہ وہ صریح آیات و اخبار جو ان کے حالات کو واضح کر کے ان سے ڈراتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان فرامین کا تعلق تمام صحابہ سے نہیں تھا۔ ان کے درمیان عدالت و حقانیت کی مثالیں اور تقدیس و اجلال کے مستحق بھی ہیں۔ لیکن اسے کیا کیا جائے کہ یہی عمومی تقدیس اس سرد جنگ کا سنگِ بنیاد تھی جو امامِ متقین اور بقول رسولِ اکرمؐ منافقین اور مومنین کے درمیان حدِ فاصل علیؑ کے خلاف لڑی جا رہی تھیں۔

۲؎ شرح نہج البلاغہ ج ۱، ص ۳۵۸ مغیرہ کی شخصیت کے بارے میں ہماری کتاب نص و اجتہاد کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ جس میں ان کے اس شہرۂ آفاق کارنامہ کا ذکر کیا گیا۔ حضرت عمرؓ نے پوری پوری ہمدردی سے کام لے کر حد جاری کرنے سے بچا لیا تھا۔ یہ کتاب مذہبی دنیا کی طرف سے منظرِ عام پر آنے والی ہے۔ جوادی

ان دونوں کو دیکھو۔ آپ فرماتی ہیں کہ میں نے نظر اٹھائی تو دیکھا علیؑ و عباسؓ ہیں۔[۱]

عمرو بن العاص نے متعدد روایتیں وضع کیں جن میں سے ایک یہ تھی کہ رسول اکرمؐ نے فرمایا ہے کہ ابوطالبؑ کی اولاد میرے دوستوں میں نہیں ہے۔ میرے دوستوں میں صرف خدا ہے اور صالح مومنین ہیں۔[۲]

ابوجعفر اسکافی نے اعمش سے نقل کیا ہے کہ جب ابوہریرہ عام الجماعۃ[۳] میں معاویہ کے ساتھ عراق آیا تو مسجد کوفہ کے پاس پہونچ کر لوگوں کا استقبال دیکھ کر مدہوش ہو گیا۔ گھٹنوں پر زور دے کر

۱؎ شرح حدیدی ج ۱ ص ۳۵۸

۲؎ شرح حدیدی ج ۱ ص ۳۵۸ ۔ شرح حدیدی ج ۳ ص ۱۵ ۔ صحیح مسلم ج ۱ ص ۱۳۶ تھوڑے تغیر کے ساتھ

۳؎ بعض ضمیر فروش مورخین کی خواہش ہے کہ اس سال کا نام عام الجماعۃ رکھیں۔ حالانکہ یہ لفظ اس سال کی الٹی تعبیر ہے۔ معاویہ تختِ سلطنت پر متمکن ہوا تو یہ تفرقہ و تنافر کا سال تھا، اسے اجتماع و اتحاد سے کیا تعلق ہے ان سطور کے لکھنے کے بعد ایک کتاب نظر سے گزری جس کا عنوان تھا: "معاویہ ابن ابی سفیان فی المیزان" اس کتاب کے بعض اقتباسات جو عام الجماعۃ سے متعلق ہیں۔ نقل کیے جا رہے ہیں۔ اگرچہ مولّف نے کتاب میں اکثر مقامات پر ایسے خلافِ واقعہ بیانات دیئے ہیں جن کی غلطی کو ہر ہاتھ لمس کر سکتا ہے اور ہر آنکھ دیکھ سکتی ہے لیکن ہمیں اس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

مولف ص ۶۶ پر لکھتے ہیں کہ "اگر اس سال کا صحیح تاریخی محاسبہ کیا جائے تو اس کا نام مفرق الجماعات ہوگا۔ لیکن تاریخ کے طالب علم کے لئے اقوالِ رجال کے پرکھنے میں بڑی عبرت اس بات سے حاصل ہوگی کہ بعض مورخین اس سال کو عام الجماعۃ کہتے ہیں جب کہ اس میں تفریقِ امت کے سوا کچھ نہ تھا اور جب اس شدید تفریق پر یہ نام رکھا گیا ہے تو اگر کہیں واقعی اتحاد و اتفاق کی کوشش ہوتی تو کیا نام رکھا جاتا" اس تفرقہ کی متعدد مثالیں ذکر کرنے کے بعد ص ۱۵۱ پر تحریر فرماتے ہیں "اس مورخ سے زیادہ جاہل اور گمراہ کوئی شخص نہیں ہے۔ جو سنہ ۴۱ھ کو عام الجماعۃ کہتا ہے۔ اس لئے کہ یہ سال معاویہ کی مطلق العنان بادشاہت کا ہے۔ اور اس سے زیادہ اختلافات و افتراقات کسی وقت بھی رونما نہ ہوئے۔"

اس کے بعد مولف نے معاویہ کے تفرقہ انداز اعمال کے کچھ نمونے پیش کئے ہیں جن کی بنا پر اسلام کی وحدت ختم ہو گئی۔ بنیاد متزلزل ہو گئی اور مسلمان مختلف بلاؤں میں گرفتار ہو گئے۔

جاحظ نے اس مقام پر ان خریدے ہوئے قلموں کے مقابلے میں ایک بڑی قیمتی بات کہی ہے جسے ہم پیش کرنا چاہتے ہیں۔ وہ بنی اُمیّہ کے بارے میں اپنے رسالہ کے صفحہ ۲۹۳ - ۲۹۴ پر لکھتے ہیں: "اس وقت

کھڑا ہو گیا۔ اور کہنے لگا: اے اہلِ عراق کیا تم خیال کرتے ہو کہ میں خدا و رسولؐ کے خلاف جھوٹ بول کر جہنم کا انتظام کر رہا ہوں[۱]۔

معاویہ سریرِ سلطنت پر متمکن ہو کر انصار و مہاجرین اور باقی مسلمین کا حاکمِ مطلق بن گیا پھر اس سال کا نام عام الجماعۃ رکھ دیا گیا۔ حالانکہ وہ سال اجتماع کا نہ تھا بلکہ سالِ افتراق و قہر و جبر و غلبہ تھا۔ یہی وہ سال تھا جب امامت کسرویت میں تبدیل ہو گئی۔ خلافت قیصری منصب بن گئی۔ پھر یہ سلسلہ یوں ہی جاری رہا۔ یہاں تک کہ رسالت کے فیصلے کی کھلی ہوئی مخالفت کی گئی۔ حکمِ الٰہی کا صاف صاف انکار کیا گیا۔ صاحبِ فراش و زانی کے احکام کو بھلا دیا گیا۔ جبکہ تمام اُمت کا اجماع تھا کہ سمیہ ابوسفیان کی زوجہ نہ تھی بلکہ اس نے زنا کیا تھا۔ جس کے بعد معاویہ فجار سے نکل کر کفار میں داخل ہو گیا۔

اگرچہ حجر بن عدی کا قتل کر دینا، عمرو بن عاص کو خراجِ مصر کھلا دینا۔ یزید پلید کی بیعت لینا، مالِ غنیمت پر آزادانہ تصرف کرنا۔ اپنی خواہش سے حکام متعین کرنا۔ سفارش و قرابت سے حدود و الٰہیہ کا معطل کر دینا کفر کے مترادف نہیں ہیں مگر زنا زادہ کو بیٹا بنا لینا حدیث کی کو، ہوئی مخالفتِ کتاب کا عتاب زیادہ ہے اور مخالفت سُنّت کا کم۔

اُمتِ پیغمبرؐ میں یہ پہلا کفر تھا اس کے بعد یہ سلسلہ خلافت میں جاری ہو گیا۔ یہاں تک کہ بہت سے لوگ اس کی تکفیر سے پرہیز کر کے خود ہی کافر ہو گئے۔ بلکہ ایک نئی منطق یہ نکال لی گئی کہ معاویہ صحابی ہے اور اس کو بُرا بھلا کہنا بدعت ہے۔ اس سے عداوت رکھنا خلافِ سنّت ہے۔ گویا اس نظریہ کے مطابق منکرِ سنّت سے برات بھی خلافِ سنّت ہے۔

ہم ابھی نقل پر اکتفا کرتے ہیں۔ اس سے معاویہ کے اعمال کا ایک پہلو تو واضح ہو جاتا ہے اب دوسرا پہلو بھی نظر میں لائیں جس میں اقدار کا انحطاط، حقائق کی بد نمائی، رونقِ حقانیت کی تباہی اور مفاہیم و موازین کا انقلاب ہے۔

اس قول کی اہمیت و قیمت اس لئے بھی زیادہ ہے کہ یہ جاحظ کی زبان سے صادر ہوا ہے۔

۱؎ خدا جانے دل میں کونسا چور تھا۔

"خدا کی قسم میں نے رسولِ اکرمؐ سے سنا ہے کہ ہر نبی کا ایک حرم ہوتا ہے۔ اور میرا حرم مدینہ ہے۔ عیر سے ثور تک[۱]۔ اب جو شخص بھی مدینہ میں کوئی بدعت ایجاد کرے گا۔ اس پر خدا و ملائکہ و انسان سب کی لعنت ہو گی۔ اب میں خدا کو حاضر و ناظر سمجھ کر کہتا ہوں کہ علیؑ نے حرمِ رسولؐ میں بدعت ایجاد کی ہے"۔

جب معاویہ کو اس روایت کی خبر ملی تو کثیر معاوضہ دے کر مدینہ کی ولایت بھی اس کے حوالے کر دی۔

حریز بن عثمان کا وقتِ وفات قریب آیا تو علیؑ کا تذکرہ کر کے آخری لمحات میں کہنے لگا۔ "یہی وہ شخص ہے جس نے حرمِ رسولؐ کو بدنام کیا ہے[۲]"۔ ظاہر ہے کہ ابن حریز سے یہ کلام عجیب نہیں ہے۔ اس نے یہ روایت بھی کی ہے کہ "نبی اکرمؐ نے وقتِ وفات علیؑ کے ہاتھ کاٹ دینے کا حکم دیا تھا[۳]"۔

کیوں! کیا علیؑ نعوذ باللہ چور تھے۔ جیسا کہ ولید بن عبدالملک نے اعلان کیا تھا۔ لعنۃ اللہ کان لص بن لص لعنت کو زبر دیا اور لص کو پیش۔ لوگ تعجب سے پکار اُٹھے۔ ارے یہ لیاقت اور یہ افترا! خدا جانے کونسی چیز زیادہ تعجب خیز ہے[۴]۔

معاویہ اس ذلیل ترین مقابلے کی آگ روشن کرنے کے لئے اموالِ اسلام و مسلمین کو غصب کر کے اس کا ایندھن مہیا کرتا تھا۔ چنانچہ ایک طرف یہ سرد جنگ جاری تھی۔ اور دوسری طرف اسی مال سے ان لوگوں کو جائزے تقسیم ہوتے تھے جو فضائل میں کوئی حدیث وضع کریں یا مناقبِ علیؑ کے روایات پر پردہ ڈالیں یا کسی آیت کے معنی میں تحریف کر کے اس کی شانِ نزول کو بدل دیں۔

۱؎ ابن ابی الحدید نے ج ۱ ص ۳۶۰ پر اس افترا کو نقل کرنے کے بعد کہا ہے کہ یہ لفظ ثور غلط ہے۔ اصل کلام عیر سے اُحد تک ہے۔ اس کے بعد بیان کیا ہے کہ ابوہریرہ کا یہ قول غلط ہے۔ علیؑ ایک مردِ متقی تھے۔ انھوں نے عثمان کی اسی طرح کمک کی ہے جس طرح جعفر کی کمک کرتے اگر وہ گرفتار ہو جاتے۔

۲؎ ۳؎ شرح النہج ج ۱ ص ۳۶۰، الغدیر ج ۱ ص ۲۰۱ پر حریز کے بہت سے قبیح افعال کا تذکرہ موجود ہے لیکن ہمیں ان کے تذکرہ کی ضرورت نہیں ہے جبکہ یہ معلوم ہے کہ یہ شخص حضرت علیؑ پر ستر لعنتیں کیا کرتا تھا۔ الغدیر ج ۸ ص ۲۵۰ ج ۱۱ ص ۸۸ اور نہ اس کے بیان کی ضرورت ہے کہ امام حاکم نے اسے ناجی قرار دیا ہے۔ الغدیر ج ۱۱ ص ۵۷، بلکہ صرف یہ کہنا ہے کہ یہ بخاری کا معتبر راوی ہے۔ افسوس!

۴؎ شرح النہج ج ۱ ص ۳۵۶ جاحظ نے البیان والتبیین کے ج ۲ ص ۲۰۱ پر یہ روایت نقل کر کے ولید پر یہ اعتراض کیا ہے کہ اس نے لص کے لام پر پیش دیا ہے۔ اور یہ ایک واضح جہالت ہے۔ حالانکہ یہ اعتراض غلط ہے۔ یہ پیش علماء پر لعنت کی نظر میں جائز ہے۔ اصل اعتراض وہ ہے جو ہم نے نقل کیا ہے۔ جاحظ کے کلام کا سیاق و سباق بتا رہا

اس کے ساتھ ساتھ ایک دوسری سرد جنگ بھی جاری تھی جس کا شعار یہ تھا کہ جس کے دل میں علیؑ کی محبت ہو یا زبان پر ان کا ذکرِ خیر ہو اسے فوراً گرفتار کر لیا جائے۔ اس کے بعد یا برأت یا بے رحمی سے قتل۔

چنانچہ حجر بن عدی وغیرہ نے اس میدان میں قربانی کی وہ مثالیں پیش کی ہیں جن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ راسخ ایمان اور پختہ عقیدہ کو زمانہ کی تیز و تند ہوائیں یا باطل کی خوں ریز تلواریں متزلزل نہیں کر سکتیں۔

تختِ سلطنت پر متمکن ہونے اور خلافت اسلامیہ کے قیصریت میں بدل دینے کے بعد بھی معاویہ کی سرکشی کسی پر موقوف نہیں ہوئی کہ سبِ علیؑ کا سلسلہ صرف اپنے ہی دورِ حکومت تک جاری رکھتا بلکہ اس نے چاہا کہ بدعت باقی رہ جائے تاکہ زمانہ تاریخ کے اوراق کو اِن بدعتوں سے سیاہ کرتا رہے۔

کہا جاتا ہے کہ اُمویین کی ایک جماعت نے معاویہ سے کہا کہ اب تو تجھے اپنا مدعا حاصل ہو گیا ہے اب اس مرد پر لعنت کا سلسلہ بند کر دے تو اس نے جواب دیا کہ ہرگز نہیں۔ یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رہے گا جب تک بچے بڑے بوڑھے نہ ہو جائیں۔ اور کوئی علیؑ کا ذکرِ خیر کرنے والا باقی نہ رہے[1]۔

معاویہ نے اپنے طغیان کا سلسلہ صرف علیؑ کی ذات تک محدود نہیں رکھا۔ بلکہ آگے بڑھ کر اس سیلاب میں ذاتِ رسولؐ کو بھی لپیٹ لیا۔ چنانچہ مطرف بن مغیرہ بن شعبہ کا بیان ہے کہ میں اپنے باپ مغیرہ کے ساتھ معاویہ کے پاس گیا۔ اس کے پہلے میرا باپ برابر وہاں جایا کرتا تھا۔ اور واپس آکر مجھ سے معاویہ کی ذہانت و ذکاوت کے

ہے کہ اِن بیانات میں ان کا مقصود ولید ہے لیکن سندوبی نے اس کی شرح میں اس واقعہ کو یزید بن ابی مسلم کی طرف منسوب کر دیا ہے بلکہ شاہد یہ ہے کہ جاحظ نے اس سے پہلے اور اس کے بعد ولید ہی کی غلطیوں کا تذکرہ کیا ہے اور اسی کی جہالت کو آشکارا کیا ہے۔ یہاں تک کہ اس کے باپ نے کہہ دیا کہ "میرے لڑکے کو میری محبت نے مار دیا۔ میں نے دیہاتوں میں نہ جانے دیا کہ زبان سیکھ لیتا۔" سندوبی نے ہر ہر لفظ پر ولید کی حمایت کرتے ہوئے یہاں پر یہ بھی کہہ دیا کہ "لڑکے سے مراد ولید یا محمدؐ دو میں سے ایک بھائی ہے۔

اب اس کے بعد واضح ہو گیا کہ حضرت علیؑ پر تہمت دانستہ ولید سے یزید کی طرف کیوں موڑ دیا گیا اور اس کی غرض و غایت کیا ہے۔ ہماری نظر میں تو یہ تمام باتیں ہمارے اس نظریے کی دلیل ہیں جو ہم سابق میں سندوبی کے بارے میں قائم کر چکے ہیں۔

[1] شرح حدیدی ص ۲۵۶، الغدیر ص ۱۰۲ (جاحظ سے نقل کرتے ہوئے) الغدیر جلد (۱) میں ص ۱۵۷ سے ص ۲۸۱ تک معاویہ کے ان مظالم کا مفصل تذکرہ موجود ہے۔

تذکرے کیا کرتا تھا۔ ایک دن جب وہ رات کی نشست سے واپس آیا تو کھانا نہیں کھایا بلکہ مغموم رہا۔ میں نے یہ خیال کیا کہ میرے اعمال میں شاید کوئی چیز ناپسند خاطر ہو گئی ہے۔ عرض کی آخر آپ اتنے مغموم کیوں ہیں۔ کہنے لگے کہ میں خبیث ترین اور کافر ترین انسان کے پاس سے آ رہا ہوں۔ میں نے کہا آخر قصہ کیا ہے؟ کہنے لگے کہ میں نے تنہائی میں معاویہ سے کہا کہ "اب تو حکومت مل گئی ہے اب کچھ انصاف اور خیر سے کام لو اب تو کبیر السن بھی ہو گئے ہو۔ بنی ہاشم کے ساتھ صلۂ رحم کرو۔ اِن بے چاروں میں خوف کھانے کی بھی طاقت نہیں رہ گئی ہے۔"

معاویہ نے جواب دیا

"افسوس! ایک تیمی نے ان مسلمانوں پر حکومت کی انصاف کیا لیکن نتیجہ یہ ہوا کہ مرتے ہی سب اسے ابوبکر کہنے لگے۔ اس کے بعد عدوی نے حکومت کی دس سال تک زحمتیں برداشت کیں لیکن مرتے ہی وہ عمر ہو گیا۔ اس کے بعد بھائی عثمان کو حکومت ملی ایسا شریف النسب انسان لیکن اسے یوں قتل کر دیا گیا کہ اب اس کے خدمات کا تذکرہ ہی نہیں رہا۔ بس اس کے عیوب کا ذکر باقی ہے۔

ذرا دیکھو تو یہ بنی ہاشم روزانہ پانچ مرتبہ اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰه کہتے ہیں۔ اس کے بعد سوائے اس کے کیا چارہ ہے کہ اس شہادت کو دفن دیا جائے[1]۔"

بھلا اس گفتگو کے بعد کچھ کہنے کی گنجائش باقی رہتی ہے۔ یہ بدبخت جو اسلام کا خلیفہ اور مسلمانوں کا حاکم بنا ہوا۔ ان کے حقوق پر تصرف کرتا ہے اور ذکرِ رسولؐ اس کے دل میں تیر کی طرح چبھ رہا ہے کہ اسے نیند تک نہیں آتی۔

ہم اس شخص کے بارے میں کیا کہیں جس نے مغیرہ جیسے بدکار انسان کو ایسا بدحواس بنا دیا کہ چہرے کے خطوط سے لڑکے نے پریشانی کا احساس کر لیا اور یہ تصور کر لیا کہ شاید ہم سے کوئی خطا ہو گئی ہے۔ ظاہر ہے کہ جب مغیرہ جیسے افراد کفر کا احساس کر لیں اور یہ سمجھ لیں کہ یہ شخص رسولِ اکرمؐ کی توہین پر تلا ہوا ہے تو پھر دوسروں کا کیا ذکر ہے۔ مثل مشہور ہے کہ "اس کے کفر میں کیا کلام ہے جسے نمرود کافر کہے۔"

ہمیں اس امر کی ضرورت نہیں ہے کہ ہم معاویہ کے اِن تمام اقوال و افعال کی فہرست پیش کریں جن میں اس نے اپنے کفر کا اظہار کیا ہے اور رسولِ اکرمؐ کی صریحی مخالفت کی ہے۔ اسلام قول و عمل اور عقیدہ

---

[1] صلح حسن ص ۳۲۰ مروج الذہب ج ۲ ص ۳۴۳ شرح النہج ج ۲ ص ۳۵۷ قدرے اختلاف کے ساتھ الغدیر ج ۱۰ ص ۲۸۳، ۲۸۴، دعوتِ حنیزی ج ۱ ص ۲۴۳-۲۴۴

کا نام ہے۔ اور معاویہ نے ہر پہلو سے آنحضرتؐ سے معاوضہ کیا ہے۔ اور اس کے بعد اس کے کفر میں کوئی شک نہیں ہو سکتا ہے۔

ہم ان تفصیلات میں چلے جائیں تو کتاب اپنے موضوع سے خارج ہو جائے گی۔ اس لئے ناظرین کرام کو الغدیر جلد عاشر کی طرف رجوع کرنے کی دعوت دیتے ہیں۔ اس کتاب میں ان تمام اطراف و جوانب سے مکمل و مفصل بحث کی گئی ہے۔ اور یہ ثابت کیا گیا ہے کہ معاویہ اپنے قصدی عنادِ رسولؐ تکلیف دہ تعدی اور مسخرہ پن سے رسولِ اکرمؐ کی مسلسل مخالفت کرتا تھا اور ان تمام باتوں کا باعث وہ حسد و کینہ و شرک اور وہ عداوت و دنیا پرستی و عناد غرضی تھی جو اپنے خاندان سے میراث میں ملی تھی۔

یہ تاریک دور گزرنے کے بعد لگا کہ اس کے بعد ایک ایسا دور آئے جو اس سے زیادہ سیاہ، تاریک اور ظلمت خیز ہوا جس میں اس وقت تک تاریکیاں بڑھتی رہیں۔ جب تک کہ نورِ فجر آنکھوں سے یہ سیاہ پردے نہ اٹھا دے

اب وہ دور آگیا جس میں سبِ علیؑ کو سنّت قرار دے دیا گیا۔ خواہشات نے دل کی گہرائیوں میں جگہ کر کے اس طریقۂ کار کو وسیع تر بنا دیا۔ اب اگر خطیب لعنت کرنا بھول جائے تو چاروں طرف سے آوازیں بلند ہو جائیں۔ سُنّت! سُنّت! تاکہ اسے احساس ہو جائے کہ کسی غلطی کا ارتکاب کیا ہے اور کس سُنّت کو ترک کیا ہے!

معاویہ نے ہر اموی النسب یا اموی الخیال شخص کے دل میں یہ کلمہ اس طرح اُتار دیا تھا کہ ہر خطیب خطبۂ جمعہ کا اختتام ان کلمات سے کرتا تھا۔

"خداوندا! ابوترابؑ نے تیرے دین میں الحاد کیا ہے۔ تیرے راستے سے لوگوں کو روکا ہے لہٰذا اس پر بدترین لعنت اور سخت ترین عذاب نازل کر۔" (معاذ اللہ)

یہ طریقہ دلوں اور زبانوں سے اس وقت تک محو نہ ہو سکا جب تک کہ عمر بن عبد العزیز کو خلافت نہ ملی۔ لیکن اس تک خلافت پہونچنے سے پہلے ہی ایسے بدترین حالات رونما ہوئے کہ جنھوں نے اوراقِ تاریخ کو سیاہ اور جبینِ انسانیت کو عرق آلود کر دیا۔ تاریخ کا رُخ بدل گیا اور حق کی شادابی ختم ہو گئی۔ اس سلسلے میں حجاج غدار و سرکش جو معاویہ کا شاگرد اکبر تھا (سیرت و کردار کے اعتبار سے) اس کا دور قابلِ فراموشی نہیں ہے۔ وہ دور جس میں معاویہ کے مظالم کی بنیادیں مضبوط کی جا رہی تھیں بلکہ اس بلند ترین عمارت میں مزید خشتوں کا اضافہ کیا جا رہا تھا۔ شیعوں کے سروں پر ظلم و جور کی تلواریں لٹک رہی تھیں۔ معمولی معمولی تہمتوں اور خیالوں پر خون بہائے جا رہے تھے۔

یہ حضرت علیؑ کی اس بد دعا کا اثر تھا جو آپ نے اہلِ عراق سے بددل ہو کر فرمائی تھی کہ ان کی بے وفائی کو اس حد پر پایا کہ معاویہ کو دس آدمی دے کر ایک آدمی لینے پر آمادہ ہو گئے تو عرض کی کہ خداوندا ان پر بنی ثقیف کے اس لڑکے کو مسلط کر دے جو ان کو ان کی حرکتوں کا مزا چکھائے۔

حجاج ایک انتہائی انتقام پسند آدمی تھا، اس نے اپنے ضمیر کی پستی اور حسد و کینہ و عداوت کی آگ کو بجھانے کے لئے بالکل معاویہ کے طریقے پر حضرت علیؑ پر لعنت کرنا شروع کی اور دوسروں کو لعنت کرنے کا حکم دیا۔

ایک دن حجاج کہیں جا رہا تھا، راستہ میں ایک شخص نے ملاقات کی۔ اور کہنے لگا: "اے امیر! میرے بزرگوں نے مجھ پر ظلم کیا ہے کہ میرا نام علی رکھ دیا ہے۔ میں فقیر ہوں آپ کے رحم و کرم کا محتاج ہوں۔ یہ سن کر حجاج کے دل میں بغض و حسد کی آگ سلگنے لگی۔ تھوڑی دیر کے بعد دلی جذبات نے یہ اثر ظاہر کیا کہ اس شخص کا نام بدل کر اپنا مقرب بارگاہ بنا لیا۔[1]

عبد اللہ بن ہانی جو حجاج کا شریکِ عمل تھا ایک مرتبہ حجاج نے اس سے پوچھا کہ "ان زحمات کے صلے میں سردار فزارہ اسماء بن خارجہ اور رئیس الیمانیہ سعید بن قیس ہمدانی کی لڑکیاں دلوا دے"؟ ان دونوں نے عقد سے انکار کیا تو ایک کیلئے تازیانہ کا انتظام کر دیا اور دوسرے کے لئے تلوار کا۔ یہ دیکھتے ہی دونوں نے قبول کر لیا اور اس طرح عقد تمام ہو گیا۔

امیر المسلمین کے ہاتھ سے اسلامی احکام یونہی جاری ہوتے ہیں۔!

حجاج نے عبد اللہ پر یہ احسان رکھنا شروع کیا کہ میں نے ان زحمتوں سے تمہیں یہ لڑکیاں دلوائی ہیں۔ اس نے جواب دیا کہ آپ ایسی باتیں نہ کریں۔ میرے فضائل تو ایسے ہیں جن کا عرب میں کوئی جواب ہی نہیں ہے۔

حجاج نے پوچھا وہ کیا۔!

جواب دیا وہ یہ ہے کہ ہماری کسی محفل میں عبد الملک کو بُرا نہیں کہا گیا۔

حجاج بولا بیشک یہ فضیلت ہے۔

پھر عبد اللہ نے کہا کہ ہمارے قبیلے کے ستر افراد صفین میں معاویہ کے ساتھ تھے اور علیؑ کے ساتھ صرف ایک آدمی تھا اور وہ بدترین آدمی تھا۔

حجاج بول اٹھا خدا کی قسم یہ فضیلت ہے۔

---

[1] شرح النہج جلد ۱ ص ۳۵۶، جلد ۳ ص ۱۶

عبداللہ نے کہا کہ ہمارے جس آدمی سے بھی ابوتراب پر سب وشتم کرنے کے لئے کہا گیا۔ اس نے قبول کرلیا اور اس پر عمل کیا بلکہ ابوتراب کے ساتھ حسنؑ وحسینؑ اور ان کی ماں فاطمہؑ کا بھی اضافہ کرلیا۔

حجاج بول اٹھا' واللہ یہ فضیلت ہے۔

عبداللہ نے کہا کہ پورے عالمِ عرب میں ہمارے برابر کوئی حسین وملیح نہیں ہے۔

چونکہ عبداللہ نہایت بدصورت اور کریہہ المنظر تھا۔ جلد سخت' چہرہ داغدار' سر بڑا اور منہ ٹیڑھا صورت خراب۔ اس لئے حجاج نے کہا کہ اب اس حسن وجمال کا تذکرہ نہ کرو۔ سلہ

معاویہ نے سب وشتم علیؑ کو ایسی بدعت بنا کر جس میں بچے جوان اور جوان بوڑھے ہو جائیں اپنی خواہش کو پورا کرلیا لیکن حق کی جوہریت کو کوئی نقصان نہ پہونچا سکا اس لئے کہ پروردگار عالم اپنے نور کو مکمل کرنے کا حتمی ارادہ کرچکا ہے۔

معاویہ کا دور گزرا تو اخلاف میں شرارت کو اور بھی عروج ملا۔ پستی ضمیر نے شرارت کے نئے نئے ڈھنگ سکھانا شروع کیے۔

ہشام کی طرف سے عراق کا امیر خالد بن عبداللہ قسری منبر پہ جاتا ہے اور کہتا ہے۔

"خدایا اس علی پر لعنت کر جو ابوطالب بن عبدالمطلب بن ہاشم کے فرزند' رسول اللہؐ کے داماد' فاطمہؑ کے شوہر اور حسنؑ وحسینؑ کے باپ ہیں۔" (معاذاللہ)

نشۂ دولت وامارت میں سرشار خطیب ایسے کلمات استعمال کرتا ہے جن میں کسی تاویل کی گنجائش ہی نہ ہو۔ نہ پردہ نہ استعارہ نہ کنیت نہ کنایہ' اس کے بعد بھی قوم سے سوال کرتا ہے کوئی کنایہ تو نہیں ہوا۔ سلہ

اس کے بعد ایک درجہ اور آگے بڑھا اور معاویہ کے نقشے کو بروئے کار لانے کے لئے رسولِ اکرمؐ کی شان میں جسارت کرنے لگا' کیوں نہ ہو' سب اسی خبیث سرزمین کے پروردش یافتہ ہیں جس میں شجرۂ ملعونہ کی نشوونما ہوئی ہے۔

خطبۂ جمعہ میں حضرت علیؑ پر سب وشتم کرنے کے بعد کہتا ہے:۔

"خدا کی قسم رسولؐ کو علی کی حالت معلوم تھی لیکن وہ ان کو اس لئے بڑھانا چاہتے تھے کہ یہ ان کے داماد تھے" خطبۂ جمعہ کے ذریعے تقرب الٰہی کا وسیلہ یہ ہے کہ رسالت کی پاکیزگی' نبوت کی طہارت کی توہین کرکے

سلہ شرح النہج جلد ۱ صـ۲۵۷' الدعوۃ جلد ۱ صـ۳۱۰

سلہ نہج جلد ۱ صـ۳۵۶ کامل مبرو جلد ۲ صـ۶۶۷-۶۶۸ (قدرے ناشائستہ الفاظ کے ساتھ)

رسولؐ کو خواہش پرست' مخالفِ حق اور جذباتی انسان ثابت کیا جائے۔

سعید بن مسیب جس کی علیؑ دشمنی معروف ہے وہ بھی اس خطبہ میں شریک تھا۔ خالد کے یہ کلمات سن کر چونک اٹھا' گھبرا کر کہنے لگا۔ ارے خدا سمجھے اس خبیث سے اس نے یہ کیا کہا۔ میں تو یہ دیکھ رہا ہوں کہ قبر رسول شگافتہ ہو رہی ہے اور آپؐ فرما رہے ہیں غلط کہتا ہے اے دشمنِ خدا سلہ

ایسے ہی قبیح افعال اور ذلیل اسلوب سے حق کا مقابلہ کیا گیا جس میں نہ اخلاق کا کوئی عنصر تھا اور نہ انسانیت کی کوئی آبرو! اس کے باوجود طامع طبیعتیں خوش نہ ہو سکیں اور انھیں چین سے بیٹھنے کا کوئی موقع نہ مل سکا (یہ اور بات ہے کہ جہنم میں بیٹھنے کا ٹھکانہ بن گیا)۔

یہی وہ اعمال ہیں جن سے تاریخ کے صفحات سیاہ اور جن کے شمار سے قلم کار کا قلم عاجز ہے۔ دردناک اور غم انگیز بات یہ ہے کہ ان بدترین افعال کا ارتکاب ان عظیم شخصیتوں سے ہوا ہے۔ جن کو تاریخ اسلام میں خلیفۂ رسول اور امیر المومنین کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔ جبکہ ان میں طلیق' منافق' چور' زانی' ظالم' شراب خوار' فاسق اور فاجر کے علاوہ کوئی اور نہ تھا۔ معاویہ' منافق یزید شراب خوار اور مروان وغیرہ سے ہوتی ہوئی یہ اسلامی خلافت عبدالملک یزید اور مروان تک پہنچ گئی۔

مزید لطف یہ ہے کہ ان تمام جعلی اقوال' وضعی احادیث' تحریفی کلمات اور خواہشاتی تفاسیر کا سرچشمہ وہ لب ہائے نجس ہیں جو ان تمام باتوں کو رسول اکرمؐ کی طرف منسوب کرتے ہیں۔

ہم جب ان احادیث واقوال کے افتراپردازیوں کا جائزہ لیتے ہیں تو ہمیں اصحاب رسولؐ کا ایک سلسلہ نظر آتا ہے جہاں صحابیت کی مستحکم دیوار ہے اور اس کی آڑ میں خباثت ورذالت کی پردہ پوشی کی جارہی ہے۔ اب کوئی پس دیوار کا جائزہ لینا چاہے یا اس پردہ کو چاک کرنا چاہے تو وہ اس بلیک مارکٹ کی اصطلاح میں حق کا مخالف' صحابہ کا دشمن اور بزرگوں کا حاسد شمار کیا جانے لگا۔ اس لئے کہ ان کے چہرے پر صحابیت کی نقاب پڑی ہے یہ اور بات ہے کہ ان حضرات نے خود ہی اپنے کو انسانیت کے درجہ سے گرا کر اپنے قصرِ فضائل کو ڈھایا ہے اس کی بنیادوں کو مسمار کرکے اپنی خیانتوں اور جنایتوں کے پردہ کو چاک کردیا ہے ان کا خیال تھا کہ رقیبوں کی آنکھیں سو رہی ہیں یا ان پر غفلت کے پردے پڑے ہوئے ہیں۔

یہ لوگ برابر اپنے عمل میں مشغول تھے روایات وضع کرکے اس کے عوض میں وہ مال خدا اور امت جمع کر رہے تھے۔ جو ان کی قبروں کو آتشکدہ بناسکے اور جس سے ان کی پیشانی اور ان کے پہلو داغے جاسکیں۔

سلہ اعیان الشیعہ جلد (۵) صـ۷۵

یہ اموال کثیرہ ان مجرم ہاتھوں سے لیتے تھے جو اپنی سلطنت اور اپنے اقتدار کے تحفظ کی خاطر ہر گراں اور ارزاں کو قربان کرسکتے تھے۔ ان کا مقصودِ اصلی دوامِ سلطنت تھا ان کی منطق میں حصولِ مقصد کے لئے ہر وسیلے کا اختیار کرنا جائز تھا۔

یہ لوگ "خلفاء المسلمین" اور "امراء المومنین" بھی تھے۔ اُمت گمراہی کے گڑھے میں گر رہی تھی، زندہ ضمیر دل کو پامال کیا جارہا تھا۔ عدالت کا تمسخر، حق کی مخالفت، افتراپردازی، حرام خوری، کذب و بہتان سب شعار بن چکے تھے اور اس طرح اقتدار کی پیاس بجھائی جارہی تھی۔

یہ تھا بعض صحابہ کرام کا کردار، جھوٹ بولیں، روایتیں گڑھیں، افتراپردازی کریں اور اس کے عوض میں چند چھینے ہوئے دینار، لوٹے ہوئے درہم، رشوت کے طور پر لے لیں۔ عطا کرنے والا بھی انتہائی اسخی کہ اس کی سلطنت رہ جاوے چاہے ساری اُمت کا مال کام آجائے۔ سب ذلیل ہو جائیں سب ننگے ہو جائیں۔ صرف اپنا تاج و تخت باقی رہ جائے۔ خونریزی، حق تلفی، توہین و تذلیل، ظلم و جور، منکرات و محرمات اور اُمت کے فقر وفاقے کو اِن مظالم کے تیمہ میں شمار کیجئے۔ یہ اس عہدِ ظلم کا فطری نتیجہ تھا جس کا حاکم معاویہ جیسا انسان ہو اور جس کی تاریخ اتنی سیاہ و تاریک ہو۔

اپنے بہیمانہ خواہشات اور سیاہ اغراض و مقاصد کی تکمیل کے لئے مختلف فسادات اور دسیسہ کاریاں کرکے یہ بزرگ دنیا سے چل بسے کہ اس کے بعد ایک دوسری نسل آئے اور وہ ان کے بیانات کو سنے اور انھیں حق سمجھ کر قبول کرے۔

کاش یہ آنے والے لوگ ہی کچھ فکر کرتے قوتِ نظر سے کام لیتے، بحث و تحیص کرتے تو انھیں معلوم ہو جاتا کہ یہ بیانات صرف اس قابل ہیں کہ انھیں زمین میں دفنا دیا جائے۔ تاکہ آئندہ کی فضاء کو متعفن نہ کرسکیں اور ان سے دین کا پرنور چہرہ داغدار نہ ہوسکے۔

اس نسل میں ایسے افراد بھی پیدا ہوئے جن کی افتراپردازی محدود نہ ہوسکی۔ آزادی کے ساتھ گمراہی میں چلتے رہے۔ نہ دین کی نگرانی کا خیال تھا۔ اور نہ ضمیر کے محاسبہ کا تصور، نہ حق کی روک تھام تھی اور نہ عذابِ الٰہی کا خوف و خیال۔!

میرا خیال یہ تھا کہ اس طرح کے افترا و بہتان کا زیادہ حصہ معاویہ اور اسکے شجرۂ ملعونہ کے برگ و بار سے مربوط ہوگا۔ یا پھر ان لوگوں سے متعلق ہوگا جو اس کے وظیفہ خوار یا کرایہ دار رہتے ہوں۔ مجھے یہ تصور بھی نہ تھا کہ اس افتراپردازی میں سیوطی کا بھی ہاتھ ہوگا اور وہ بھی ـــــــ

یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوۃَ وَاَنْتُمْ سُکٰرٰی حَتّٰی تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ ۔ ـــــــ (النساء - آیت ۴۳)

"اے اہلِ ایمان حالتِ مستی میں نماز کے قریب نہ جاؤ جب تک کہ تمہیں ہوش نہ آجائے ـــ"

کو حضرت علیؑ کی طرف موڑ دیں گے اور وہ بھی اس طرح کہ خود حضرت ہی نے فرمایا ہے کہ ایک روز عبدالرحمٰن بن عوف نے ہماری دعوت کی اور اس میں شراب پلادی۔ شراب کا خمار زیادہ ہوگیا اور لوگوں نے مجھے نماز کے لئے کھڑا کردیا۔ میں نے آیت یوں پڑھ دی۔ قُلْ یٰاَیُّھَا الْکٰفِرُوْنَ لَا اَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ وَنَحْنُ نَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ[1] ـــ تو یہ آیت نازل ہوگئی۔

میں سیوطی سے نہ روایت کی سند پر بحث کرنا چاہتا ہوں اور نہ اس کے تناقض پر اور نہ ہی یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ اس میں علیؑ کا نام کہاں سے آگیا۔ جب کہ اس آیت کے سلسلے کی اکثر روایتیں بے نام کی ہیں اور بعض میں دیگر صحابہ کا نام بھی ہے۔

میں تو صرف یہ دکھانا چاہتا ہوں کہ یہ روایت قرآن مجید اور احادیثِ نبویہ سے کس طرح مخالفت رکھتی ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ شراب پینا اس تطہیر کے بالکل متضاد ہے جس میں علیؑ کا داخل ہونا قابلِ شک و انکار نہیں ہے جس طرح یہ فعلِ حرام رسولِ اکرمؐ کا نفس ہونے سے بالکل متناقض ہے جسے آیتِ مباہلہ نے بیان کیا ہے اس لئے کہ اس بنیاد پر یہی نسبت رسولؐ اکرم کی طرف بھی ہوجائے گی۔

اس کے علاوہ یہ روایت سارے مسلمانوں کے اس اجماع کی بھی مخالف ہے جس میں اعتراف کیا گیا ہے کہ حضرت علیؑ نے ایک لمحہ کے واسطے بھی کفر و شرک نہیں اختیار کیا جس کے بعد یہ ناممکن ہے کہ "معاذ اللہ" آپ نماز میں کافروں سے خطاب کرکے یہ کہہ دیں کہ میں تمہارے خداؤں کی عبادت کرتا ہوں۔

ہم اس قسم کے ذلیل اور پست بیانات پر تفصیلی بحث کرنا نہیں چاہتے۔ ہمارا مقصود تو صرف دور سے ایک اشارہ ہے کہ نکتہ رس حضرات بات کی حقیقت تک پہونچ جائیں۔

البتہ اس مقام پر یہ بتلا دینا انتہائی ضروری ہے کہ بعض مفسرین نے اس آیت کے ذیل میں شراب پینے والوں میں بعض صحابہ کا ذکر کیا ہے جن کے عیب کو چھپانے کے لئے یہ کوشش کی گئی ہے کہ ان کی جگہ پر حضرت علیؑ کا نام لکھ دیا جائے۔

شاید اس ناکام کوشش کرنے والے کو یہ خبر نہیں تھی کہ یہ افترا نفسِ رسولؐ سے ذاتِ رسولؐ تک پہونچ

---

[1] اسباب النزول ص۶۳

جائے گا۔ اور بعض مفسرین کی نظر میں تو اس مقام پر نشہ سے مراد شراب کا نشہ نہیں ہے۔ بلکہ نیند کا خمار ہے[1]

ہم جب اس نسل کے ان خرافات کا جائزہ لیتے ہیں جن سے اختلاف و انتراق کی خلیج بے حد وسیع ہوگئی ہے اور جن کا تعلق نہ حق و صداقت سے ہے اور نہ حسن نیت سے تو ہمیں غزالی کا وہ جواب نظر آتا ہے جو انھوں نے اس سوال کے سلسلے میں پیش کیا تھا کہ ——

"کیا یزید پر لعنت کرنے والا فاسق ہے اور کیا یزید کے لئے دعائے رحمت جائز ہے ——؟" تو انھوں نے جواب دیا۔

"جی ہاں! یزید پر لعنت کرنے والا فاسق و گنہ گار ہے (عجیب) اس لئے کہ عام مسلمان بلکہ جانوروں تک پر لعنت کرنا حرام ہے جیسا کہ حدیث پیغمبرؐ میں وارد ہوا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ مسلمان کی حرمت کعبہ کے برابر ہے۔ یزید کا اسلام ثابت ہے اور اس کا قتل امام حسینؑ کے لئے حکم دینا یا اس سے راضی ہونا ثابت نہیں ہے۔ پھر مسلمان سے بدظنی بھی حرام ہے جب تک کہ واقعہ کی تحقیق نہ ہو۔ اس وقت تک حسن ظن ضروری ہوا کرتا ہے علاوہ بریں قتل حسینؑ کفر بھی تو نہیں ہے۔ صرف ایک گناہ ہے۔ رہ گیا دعائے رحمت کا معاملہ تو وہ جائز بلکہ مستحب ہے۔ اس لئے کہ ہم نماز میں اَللّٰھُمَّ اغْفِرْ لِلْمُؤْمِنِیْنَ وَالْمُؤْمِنَات پڑھتے ہیں۔ اور یزید مومن تھا"[2]

ارباب دانش یہ تناقض اور جعلسازی ملاحظہ فرمائیں۔ مومن سے بدظنی حرام ہے۔ قتل حسینؑ کفر نہیں ہے۔ مومن کی حرمت بنص رسولؐ کعبہ سے زیادہ ہے لہٰذا یزید پر لعنت حرام ہے۔ یعنی امام حسینؑ کی کوئی حرمت نہیں ہے۔ ان کے خون مقدس کی کوئی قیمت نہیں ہے۔ ان کے بارے میں رسول اکرمؐ کے ارشادات کا کوئی وزن نہیں ہے۔ ان کے قتل سے یزید کے احترام میں کوئی فرق نہ آئے گا۔ وہ خلیفۂ رسولؐ اور امیر المومنین تھا لہٰذا وہ ہر نماز کی دعا میں داخل رہے گا۔

حقیقت یہ ہے کہ اس کے باپ کو قتل کر کے اس کا سر منہ میں شراب پینے والے اور اپنی ماں سے زنا کرنے والے شخص سے ایمان کا قائل ہونا حق و صداقت پر ظلم اور انصاف سے علیحدگی کے اعتبار سے اتنا اہم نہیں ہے جس قدر یزید کے ایمان کی اہمیت ہے جس کی ساری زندگی فسق و فجور

---

[1] مجمع البیان جلد (۵) ص ۱۱۲، الکشاف جلد (۱) ص ۳۹۷

[2] سیرۃ حلبیہ جلد (۱) ص ۱۹۵

شراب خوری و مستی اور عیاری و عیاشی میں گزر گئی۔

لیکن یزید کا قاتل امامؑ ہونا ہی ایسا محرک تھا جس نے غزالی کو اس ذلیل و پست موقف پر لا کھڑا کیا اور وہ پوری قوت سے یزید کی حمایت پر تل گئے۔

خدا جانے کیا بات ہے کہ غزالی نے یزید سے دفاع کرنے میں اسی بیان پر اکتفا نہیں کی بلکہ بار بار ضرورۃً یا بلا ضرورت اس کا اعادہ کیا ہے۔ چنانچہ ایک مقام پر فرماتے ہیں:۔

"اگر کوئی سوال کرے۔ کیا حسینؑ کو قتل کرنے یا ان کے قتل کا حکم دینے کی بنا پر یزید پر لعنت کرنا جائز ہے؟ تو جواب دیا جائے گا کہ یہ ثابت نہیں ہے لہٰذا بلا تحقیق یہ نسبت ہی جائز نہیں ہے چہ جائیکہ لعنت اس لئے کہ مسلمان کی طرف گناہ کبیرہ کی نسبت دینا حرام ہے"[1]

غزالی کی نظر میں اتنا دفاع یزید کے لئے اور حقائق و مسلمات سے اس قدر انکار کافی نہیں تھا اس لئے کہ وہ اس امر سے واقف تھا کہ اس نے اپنے جعل و فریب سے ایک اور ایک دو ہونے کا انکار کیا ہے۔ چنانچہ اس نے ایک مرتبہ پھر نئے انداز سے دفاع کرنے کی کوشش کی اور چاہا کہ فقط یزید نہیں بلکہ تمام قاتلان امام حسینؑ کو بری کر دیا جائے تاکہ اگر یزید کا قاتل ہونا ثابت بھی ہو جائے تو کوئی داغ دامن یزیدیت پر نہ رہ سکے۔

فرماتے ہیں کیا یہ جائز ہے کہ قاتل حسینؑ یا حاکم قتل حسینؑ کو لعنہ اللہ کہا جائے۔؟

جواب:۔ حق تو یہ ہے کہ اگر لعنت کی جائے تو اس شرط سے کہ اگر توبہ نہ کی ہو تو لعنت ورنہ توبہ کا احتمال باقی ہے۔

اس کے بعد وحشی قاتل حضرت حمزہ کے افسانۂ توبہ سے استدلال کرنے کی کوشش کی ہے جبکہ وحشی کے متعلق یہ معلوم ہے کہ اس نے زندگی کے کسی لمحہ میں اپنی وحشیت ترک نہیں کی بلکہ ساری زندگی شراب میں ڈبو دی اور کبھی اس نشہ سے افاقہ نہ ہو سکا۔[2]

بہر حال غزالی کی یہ ناکام کوشش کہ کسی فاسق و فاجر، عاصی و کافر کی توہین نہ ہونے پائے اور اس پر لعنت نہ ہو سکے۔ اس حد تک ترقی کر گئی کہ اس نے ابلیس کی حمایت کا اعلان کر دیا۔ "ابلیس پر لعنت کرنے

---

[1] احیاء العلوم ج ۲ ص ۱۲۱۔ اگرچہ غزالی نے سر العالمین میں اس رائے کی مخالفت کی ہے لیکن ان تمام تناقضات و اختلافات کا منشاء وہ لوگ ہیں جن کے اشاروں پر یہ کتابیں تالیف ہوئی تھیں۔

[2] استیعاب جلد (۳) ص ۶۱

سے سکوت میں کوئی مضائقہ نہیں ہے چہ جائیکہ غیر ابلیس [1]۔"

افسوس کہ یہی غزالی جو ایسے ذلیل و رُسوا کن موقف میں کھڑے ہو کر یزید، ابلیس اور اس کی اولاد سے دفاع کرتا ہے۔ ایک مرتبہ نہایت بیباکانہ انداز میں یہ اعلان کر دیتا ہے۔

"دوسرا مرتبہ اوصاف کے ذریعہ لعنت کا ہے، جیسے یہود، نصاریٰ، مجوس، قدریہ، خوارج، رافضی، زانی، ظالم، سود خوار پر لعنت اور یہ جائز ہے۔" [2]

بعض لوگ یہ خیال کریں گے کہ غزالی کے ان دونوں فتوؤں میں اختلاف ہے کہ یہاں ان جماعتوں پر لعنت کو جائز قرار دیا ہے اور وہاں یزید بلکہ ابلیس پر لعنت کو حرام کیا ہے۔ حالانکہ ابلیس اِن تمام جماعتوں کا سرغنہ ہے۔

لیکن اگر ذرا سا غور و تامل کیا جائے تو معلوم ہو جائے گا کہ اِن دونوں بیانات میں کوئی تضاد نہیں ہے۔ بلکہ ایک گہرا ربط ہے۔ اِس لئے کہ طائفہ روافض (جو شیعوں کی چڑ نکالی گئی ہے) پر لعنت اور یزید سے دفاع مقصد و غایت کے اعتبار سے بالکل متحد ہیں۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ یہ تمام بیانات اس عداوت و نفرت کا نتیجہ ہیں۔ جو ان مولفین کو خاندانِ رسالت سے حاصل تھی اور جب مقصد معلوم ہو گیا تو ہمیں کوئی تعجب اس امر سے نہیں ہے کہ اس مؤلف نے شیعوں کو خوارج اور قدریہ کے ساتھ کیوں جمع کر دیا اور ان پر لعنت کیونکر جائز کر دی؟ ظاہر ہے کہ اس کی نظر میں تشیع ایک ایسا گناہ ہے جس کی توبہ نہیں اور ایک ایسا مرض ہے جس میں کوئی خیر نہیں ہے۔ بلکہ اگر غزالی اپنے دل کے راز کھول سکتا تو یہ بھی کہہ سکتا کہ تمام فرق و مذاہب شیعوں سے بہتر ہیں۔ اس لئے کہ علیؑ کی محبت اس فرقہ کا وہ جرم ہے جو قابلِ عفو نہیں ہے۔ وہ میل ہے جو دھل نہیں سکتا ہے۔

کتنا عظیم فرق ہے غزالی کی اس یزید دوستی اور جاحظ کے انصاف پسند موقف میں جہاں اس نے یزید کی حقیقت کا اعلان کرتے ہوئے "عام الجماعۃ" کے حالات میں تحریر کیا ہے کہ "اس کے بعد معاویہ کے بیٹے یزید اس کے عمال اور اس کے انصار و اعوان کے اعمال ہیں۔ مکہ پر حملہ، کعبہ کی تباہی اور مدینہ کی بے حرمتی کا مسئلہ ہے۔ امام حسینؑ نے یہ کہہ دیا تھا کہ میں اپنے گھر، حرم رسولؐ یا کسی ایسی جگہ جا کر قیام کر سکتا ہوں۔ جہاں حکومت کو کوئی گزند نہ پہنچ سکے۔ لیکن دشمنوں کی نظر میں سوائے قتل کے کوئی اور چارہ نہ تھا۔ [3]

---

[1] احیاء العلوم جلد (۲) ص ۱۲۱

[2] احیاء العلوم جلد (۲) ص ۱۲۰

[3] رسائل جاحظ ص ۲۹۴

اس کے بعد یزید کے اعمال سے اس کے کفر پر استدلال کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

"ذرا اس کے ان اشعار کا بھی حساب کرو جن کا کہنا کفر اور جن سے ممانعت شرک ہے پھر یہ دیکھو کہ حسینؑ کے دندانِ مبارک سے جسارت، بناتِ رسولؐ کو سر برہنہ ناقوں پر سوار کرنا علی ابن الحسینؑ سے اطفالِ مشرکین کا سا سلوک کرنا کیا اس کی بھی کوئی تاویل ہو سکتی ہے؟ کیا تاویل ہو گی عبید اللہ بن زیاد کے اس قول کی جو اس نے اقارب و اعزائے حسینؑ سے کہا تھا: میں چاہتا ہوں کہ اس (امام سجادؑ) کو بھی قتل کر دوں تاکہ یہ شاخ ہی ختم ہو جائے یہ مرض ہی مٹ جائے اور یہ مادہ ہی قطع ہو جائے"؟

مجھے کوئی بتائے کہ قتلِ امامؑ کے بعد یہ سختیاں، یہ شقاوتیں کس بات کی دلیل ہیں۔؟

کیا یہ سب دشمنی، غلط رائے، حسد، بغض، نفاق اور بے ایمانی کی علامتیں نہیں ہیں۔؟

کیا اخلاص و محبتِ رسولؐ، حفظِ اولادِ رسولؐ، حسنِ سیرت و برأتِ ذمہ کی نشانیاں یہی ہیں۔؟

اگر یہ تمام باتیں فسق و فجور اور گمراہی ہی کی حد تک ہوں تب بھی فاسق بہرحال ملعون ہوتا ہے اور ملعون کی لعنت سے روکنے والا بھی ملعون ہوتا ہے"۔ [1]

مجھے اس بیان پر کسی تبصرہ کی ضرورت نہیں ہے کہ اس تقریر میں جاحظ نے ارادی یا غیر ارادی طور پر غزالی کے اس موقف کی مکمل رد کر دی ہے جس میں اس نے خاندان جور و ظلم، مجموعۂ رذائل و خباثت شجرۂ ملعونہ کی حمایت کی تھی۔

ہم غزالی کی ان تمام غلط بیانیوں کا جائزہ لے کر یہ دیکھ لیتے ہیں کہ ایسا بے باک اور لاپروا انسان بھی حجۃ الاسلام کا لقب پا سکتا ہے تو ہمیں اس کے اس فتوے سے کوئی تعجب نہیں رہ جاتا کہ —— "واعظ و غیر واعظ پر مقتل حسینؑ کا روایت کرنا اور صحابہ کے باہمی اختلافات کا بیان کرنا حرام ہے۔ اِس لئے کہ اس سے صحابہ کا بغض اور ان پر طعن و طنز کی جرأت پیدا ہوتی ہے حالانکہ یہ سب دین کے پرچم تھے۔ ان کے اختلافات کو اچھے مقاصد پر محمول کرنا چاہیئے اور شاید یہ تمام باتیں خطائے اجتہادی کی بناء پر تھیں۔ انھیں حبِ جاہ اور طلبِ ریاست سے کوئی تعلق نہیں تھا"۔ [2]

---

[1] رسائل جاحظ ص ۲۹۵

[2] الغدیر جلد (۱۰) ص ۲۱۱۔ تفسیر روح البیان جلد (۴) ص ۱۷۱

ارباب نظر جانتے ہیں کہ اس جعل سازی اور فریب کاری کے ساتھ ایک ایسے عظیم سانحہ کے تذکرہ کا حرام کرنا۔ جس کی نظیر عالم انسانیت میں نہیں ہے اور نہ ایسے حادثہ سے افرادِ نوعِ بشر دوچار ہوسکتے ہیں۔ کیا مقصد رکھتا ہے ! اور یزید جیسے افراد کو رحیمِ دین قرار دینے کا مطلب کیا ہے۔ !

یزید — بنیادِ دین۔ یزید کا مخالف باطل پسند باطل کوش !! (العیاذ باللہ)۔ یہی نہیں بلکہ اس ایک دنائی مشن سے ہر باطل پرست کی حمایت کردی گئی اور جنگِ صفین جیسے معرکہ کو اجتہادی غلطی قرار دے دیا گیا۔ معاویہ کا اقدام غزالی کی نظر میں تعمیرِ اسلام کے لئے تھا۔ اس میں حبِ جاہ و ریاست کو دخل نہ تھا۔ یہ اور بات ہے کہ خود یزید کے باپ، ابوسفیان کے بیٹے اور امیہ کے پوتے نے اس کی تردید اپنے اس خطبہ میں کردی تھی۔ جس میں اہلِ کوفہ سے خطاب کرتے ہوئے کہا تھا:

"اے اہلِ کوفہ! کیا تم خیال کرتے ہو کہ میری جنگ نماز روزہ زکواۃ اور حج کے لئے ہے؟ یہ قطعاً غلط ہے۔ میں جانتا ہوں کہ تم نماز گذار زکواۃ کے پابند اور حج کے ادا کرنے والے ہو۔ میں نے تو صرف اس لئے جنگ کی ہے کہ تمہاری گردنوں پر حکومت کروں۔ اللہ نے مجھے یہ نعمت دی ہے۔ اب چاہے تم اسے ناپسند کرو۔ یاد رکھو اس معرکہ کا ہر مال اور ہر خون مباح ہے۔ اور میرے شرائط میرے قدموں کے نیچے ہیں۔" [1]

ہم اس مقام پر غزالی کی ان تمام افتراپردازیوں کا محاسبہ نہیں کرنا چاہتے جو اس نے احیاء العلوم میں درج کی ہیں۔ اس لئے کہ اس کتاب میں کذب و بہتان، جعل و فریب، تدلیس و تلبیس کی بہتات ہے ہم تو صرف ان اقدامات کے نمونے پیش کرنا ہے کہ جن میں ملّتِ اسلامیہ اس وقت مبتلا ہوگئی ہے رجالِ سوء عالم بنے اور دین، دنیا کے عوض بکنے لگا۔

اس لئے اگر ایسے مقام پر سرکار نہ ہوتے تو یہ اعلان بھی نہ ہوسکتا کہ "حسینؑ اپنے نانا کی شریعت سے مارے گئے۔"

یہ قائل کون تھا؟ ابوبکر بن عربی! جس کی نظر میں یزید امامِ زمانہ تھا اور (معاذ اللہ) حسینؑ خارجی تھے۔ اور ظاہر ہے کہ دینِ رسولؐ میں باغی کا قتل معین ہے۔ اس مقام پر ابن عربی کو غزالی پر یہ امتیاز حاصل ہے کہ اس نے اپنے دل کے راز کو فاش کردیا۔ جبکہ غزالی شہد میں زہر ملا کر دینے کا قائل تھا۔

اس کے بعد ابن خلدون کی باری آتی ہے۔ وہ یہ نہیں چاہتا کہ اہلِ بیتؑ میں سے فقط کسی ایک

---

۱ شرح النہج جلد (۴) ص ۱۰۶، الغدیر جلد ( ) ص ۲۳۶

فرد کی توہین کرے بلکہ اس نے کھلے لفظوں میں یہ اعلان کردیا۔

"اہلِ بیت ایک جداگانہ فقہ اور بدعتی مذہب کے بانی تھے۔ ان کے اصول لغو اور ان کے مبانی خوارج سے ملتے جلتے تھے۔ جمہور نے ان کی طرف اعتنا بھی نہیں کی ہے بلکہ ان کا انکار کیا ہے۔ ان کی ردّ و قدح کی ہے ہم نہ ان کے مذہب کو پہچانتے ہیں اور نہ ان کی کتابیں نقل کرتے ہیں۔ ان کے مذاہب انہی کے شہروں تک محدود ہیں۔ شیعوں کی کتابیں اس وقت رائج تھیں جب تک مغرب و مشرق میں ان کی حکومت قائم تھی اور خوارج کی بھی یہی شان ہے۔ دونوں کی کچھ کتابیں ہیں کچھ تالیفات ہیں اور عجیب و غریب فقہی خیالات ہیں۔" [1]

ابن خلدون کو اگر یہ فخر ہے کہ اس نے اہلِ بیتؑ کو ترک کردیا ہے تو ہوا کرے۔ لیکن یہ طے شدہ ہے کہ اہلِ بیتؑ نے کوئی بدعت ایجاد نہیں کی۔ ان کی طہارت پر نص قرآن موجود ہے اور کیا کہنا اس بدعت کا جس کا سرچشمہ قرآن کریم ہو۔ جس کے سوتے قرآن کی زمین سے پھوٹتے ہوں۔

ابن خلدون کے لئے دوسری قابلِ فخر بات یہ ہے کہ اس نے اہلِ بیتؑ کو خوارج سے ملا دیا ہے اور دونوں کو شاذ و اہلِ بدعت قرار دے دیا ہے جس کا کھلا ہوا مطلب یہ ہے کہ اہلِ بیتؑ بھی خوارج کی طرح دین سے خارج اور احادیثِ پیغمبر اسلامؐ کا مصداق ہیں۔

تیسرا فخر یہ ہے کہ اس نے مذہب اہلِ بیتؑ کو انکار و ردّ و قدح کی منزل میں قرار دیا ہے۔ اور بعض لوگوں نے یہاں تک ترقی کی ہے کہ اپنے یہاں کے اخبار و روایات سے ثابت شدہ احکام کو بھی صرف اس لئے ٹھکرا دیا ہے کہ ان میں مذہب شیعہ سے مشابہت پائی جاتی ہے۔

اس مقام پر انتہائی ضروری ہے کہ ہم ان مخالفتوں کے بھی چند نمونے پیش کریں تاکہ اس وسیع خلیج کے طول و عرض کا اندازہ کیا جاسکے جو مذہب شیعہ و سنی کے درمیان پیدا کی گئی ہے۔ اور جس میں شیعوں کا جرم احادیث رسولؐ کی طرح اخبار ائمہ معصومینؑ سے تمسک و تعلق تھا۔

قبر کے بارے میں سنت یہ ہے کہ اس کی سطح برابر ہو لیکن بعض حضرات نے اسے کوہان نما بنانا اولیٰ قرار دیا ہے [2]۔ صرف اس لئے کہ مسطح قبر شیعوں کا شعار ہے۔ (اگرچہ یہی شافعی کا بھی فتویٰ تھا)۔

---

۱ مقدمہ ابنِ خلدون ص ۴۴۶

۲ الغدیر جلد (۱۰) ص ۲۰۹ - ۲۱۰

چنانچہ غزالی اور ماوردی نے کہا ہے کہ ــــ "اگرچہ قبر کا مسطح ہونا ہی حکم شریعت تھا لیکن چونکہ رافضیوں نے اِسے اپنا شعار بنا لیا ہے لہٰذا ہم نے اس سے عدول کر لیا ہے"۔ ؎۱

انگشتری کے بارے میں سنّت یہی ہے کہ داہنے ہاتھ میں پہنی جائے۔ لیکن بعض حضرات کا فتویٰ یہ ہے کہ ــــ "اگرچہ حکم شریعت یہی ہے کہ انگشتری داہنے ہاتھ میں ہو لیکن اِسے رافضیوں نے اپنا شعار بنا لیا ہے۔ لہٰذا اب بائیں ہاتھ میں ہونی چاہیئے"۔ ؎۲

اس فتوے میں ایک طرف مذہب شیعہ یعنی سنّت رسول کی مخالفت کی گئی ہے اور دوسری طرف معاویہ کا اتباع کیا گیا ہے کہ سب سے پہلے بائیں ہاتھ میں انگوٹھی کی ایجاد اسی نے کی ہے۔

شیعوں کی مخالفت! یہ ایک ایسا جملہ ہے جو اکثر مقامات پر نظر آتا ہے۔ چنانچہ ملاحظہ ہو۔

"یہ امامیہ کا شعار ہے لہٰذا اس سے اجتناب کیا جائے" ؎۳

"اس سے رافضیت کا اتہام پیدا ہوتا ہے"۔ ؎۴

"کسی مومن کے لئے مناسب نہیں کہ وہ یزید لعون، شیعہ رافضی یا خوارج سے تشبّہ اختیار کرے" ؎۵

اکثر مقامات پر سنّت کو اس لئے ترک کیا گیا ہے کہ "یہ رافضیوں کا شعار ہے"۔

"سنّت کا ترک کرنا بھی سنّت ہے اگر وہ اہلِ بدعت کا شعار بن جائے جیسے کہ انگشتری کا مسئلہ ہے کہ اصل سُنّت دائیں ہاتھ میں پہننا تھا۔ لیکن چونکہ اہلِ بدعت نے اِسے اپنا طریقہ بنا لیا ہے اس لئے اب سُنّت یہ ہے کہ اسے بائیں ہاتھ میں پہنا جائے" ؎۶

رفتہ رفتہ شیعوں کی مخالفت معمول میں داخل ہو گئی اور اس کے ذریعہ سنّت کی مخالفت بھی شروع ہو گئی۔ اب کوئی ایسا نہ تھا کہ جو اس کا انکار کر سکتا۔ حد ہو گئی کہ بعض لوگوں نے رافضیوں سے مشابہت کی بحث میں یہ تک کہہ دیا کہ

"اِسی لئے بعض فقہا نے مستحبات کو ترک کر دینے کا فتویٰ دے دیا ہے اس وقت جبکہ وہ رافضیوں کا شعار بن جائیں اگرچہ مشابہت کی بناء پر ان کا ترک کرنا واجب

؎۱ ــــ الغدیر جلد (۱۰) صفحہ ۱۰۹ ــ ۱۱۰

؎۲ ــــ الغدیر جلد (۱۰) صفحہ ۱۰۹ ــ ۱۱۱

؎۳۔ ؎۴۔ ؎۵۔ ؎۶ ــــ الغدیر جلد (۱۰) صفحہ ــــ ۱۰۹ ــ ۱۱۰

؎۷ ــــ الغدیر جلد (۱۰) صفحہ ۲۰۹ ــ ۲۱۱

نہیں ہے لیکن چونکہ اِس سے شیعہ و سنّی کا امتیاز ختم ہو جاتا ہے اور مصلحت اِسی میں ہے کہ یہ امتیاز باقی رہے۔ تاکہ ان سے ترکِ موالات کی جا سکے اِس لئے اس کا ترک کرنا ہی بہتر ہے علاوہ اِس کے کہ اِس مخالفت کی مصلحت اتباعِ سُنّت کی مصلحت سے زیادہ اہم ہے"

یہی وہ مقام ہے جہاں ذہنی سوالات کی بوچھار اور علامات استفہام کی بھرمار ہو جاتی ہے۔ آخر یہ انکار سُنّت مخالفت شرع اور فرقۂ حقّہ امامیہ پر مظالم کیوں؟ جبکہ اس فرقہ کا کوئی قصور سوائے اس کے نہیں ہے کہ اس نے دینِ حنیف کی تعلیمات قرآن کریم کے اوامر، سُنّتِ پیغمبر اسلام کے احکام پر عمل کرتے ہوئے قوانینِ شریعت کو ان صاف و شفاف چشموں سے لیا ہے جن کی طہارت و نظافت پر متعدد نصوص و ارشادات دلالت کرتے ہیں۔

کیا سُنّت انہی لوگوں کی مخالفت کا نام ہے؟ کیا اِس مخالفت میں اتنی اہمیت ہے کہ اس میں ہر وہ فرقہ و جماعت داخل ہو جائے جس کی رائے ان حضرات کی رائے سے ہم آہنگ نہ ہو۔ یا اِس کا تعلق صرف شیعوں سے ہے۔؟

واضح لفظوں میں یوں کہا جائے کہ کیا وہ مخالفت جو عین سُنّت ہے صرف ان اہلبیتؑ کی مخالفت ہے جو ثقلین کی ایک فرد ہیں۔ جن کے تمسک سے نجات اور جن کی مخالفت سے ہلاکتِ دائمی ہے۔

کیا سُنّتِ پیغمبرؐ قابلِ تغیر و تبدل ہے۔؟ کیا حلالِ محمدؐ قیامت تک کے لئے حلال اور حرام محمدؐ قیامت تک کے لئے حرام نہیں ہے۔؟

بھلا اس شخص کی جزاء کیا ہے جو ایک عمل کو سُنّتِ پیغمبرؐ کہہ کر حرام کرتا ہو، یا اس کی مخالفت کرتا ہو یا اسکو ختم کر کے شیعہ و سُنّی افتراق و امتیاز پیدا کرنا چاہتا ہو۔؟

شیعہ نماز پڑھتے ہیں زکواۃ دیتے ہیں 'واجبات شرعیہ ہی نہیں بلکہ رضائے الٰہی کے لئے اکثر مستحبات پر بھی عمل کرتے ہیں تو کیا کیا مخالفِ شیعہ کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ ان تمام واجبات اور مستحبات کو ترک کر دے یا صرف اتنا کافی ہے کہ ان کی مخالفت کے لئے صرف بعض مستحبات کو بدعت قرار دے دے!

جب ہم مخالفت سُنیت کے اس واضح اعلان کو دیکھ لیتے ہیں۔ تو ہمیں شیعوں پر ہونے والے اعتراضات کی حقیقت اس ایک مثل میں اجاگر نظر آتی ہے۔

رمتنی بدائها وانسلت ــــ "وہی ذبح بھی کرے ہے وہی لے ثواب الٹا"

اُمّتِ اسلامیہ کی مصیبت یہ ہے کہ اس پر ایسے افراد مسلط ہو گئے جن کا علم و عرفان خدمتِ انسانیت اور سعادتِ البشریت کا ذریعہ نہ تھا بلکہ ان کا تمام تر فریضہ انسانیت کی بنیادوں کا منہدم کرنا تھا۔ تاکہ اس کے نتیجہ

میں اختلافات و افتراقات پیدا ہو سکیں۔ اب عقلوں کا مصرف انکشافِ حقائق نہیں تھا بلکہ ان کا کام حقائق و معارف کو ضائع و برباد کرنا تھا۔ منصب و رُتبہ، مال یا جاہ کی خاطر!

ہم ان افراد سے تو متعجب ہیں جنھوں نے حدیثیں وضع کیں، کذب و افتراء اور جعل کئے، منکرات و واہیات وغیرہ جمع کیا۔ ہمیں معاویہ پر تو تعجب ہے جس نے ضمیر خرید لئے، عہد توڑ دیئے۔ پیمان بھلا دیئے۔ مالِ خدا کو اپنی گھاس کی طرح چر لیا۔ امت پر مسلط ہو گیا، حقوق کو ضائع کر دیا۔

لیکن ان سے زیادہ تعجب ان لوگوں پر ہے جنھوں نے حق کو اندھی گیند کر دیا۔ بانسری میں نغمات کا اور اضافہ کر دیا۔ یعنی ان تمام اقوال و خرافات کو اس طرح قبول کیا کہ گویا یہ سب قابلِ تنقید ہی نہیں ہیں۔ جھوٹی حدیثوں کو اس طرح تسلیم کیا گیا گویا ان کے راوی سب موثق و معتبر اور یہ سب رسول اکرمؐ کے دہن مبارک سے نکلی ہوئی ہیں ——— استغفر اللہ!

ہمارا تعجب ان حضرات کے بارے میں کسی حد پر رکتا ہوا نظر نہیں آتا اس لئے کہ وہ لوگ روایات کو وضع کرتے تھے۔ آخرت کو دنیا، ضمیر و انسانیت کو مال و منصب کے مقابلے میں فروخت کر کے چمکتا ہوا سونا اور جگمگاتی ہوئی چاندی لیا کرتے تھے۔

ان کا مشتری معاویہ وہ تاجر کبیر تھا جس کی نظر میں فضیلت کا کوئی وزن نہیں تھا۔ وہ صرف اپنے مقصد کا خواہاں تھا۔ اور اسی کے پیچھے دوڑا کرتا تھا۔ اس کے حصول کے لئے ہر وسیلہ کو اختیار کرتا تھا خواہ کتنی ہی دولت خرچ ہو جائے اور کس قدر خسارہ کیوں نہ ہو جائے۔

اس کی نظر میں مقصد کی خاطر ہر وسیلہ جائز تھا۔ خواہ دین کے ارکان متزلزل ہو جائیں، ضمیر کی سانس اکھڑ جائے، اخلاق کا گلا گھٹ جائے اور انصاف کی آوازیں ہوا میں منتشر ہو جائیں۔

اس کی سیاست کا تقاضا یہ تھا کہ ان تمام اقدار و مفاہیم کا انکار کر دے۔ جو اس کے پست مقصد کی راہ میں حائل ہو سکیں۔

بادشاہِ عباسی کا قبرِ رسولؐ کے پاس آکر یہ کہنا کہ "ملک بانجھ ہے اگر صاحبِ قبر بھی مجھ سے اس میں نزاع کرے تو تلوار سے اس کی ناک کاٹ لوں"۔ اس وقت کی خلافت کے حالات کی صحیح عکاسی کر رہا ہے۔

یہی وہ خلافت تھی جس سے اسلام بیزار تھا اور جس سے جہاد کا حکم دے رہا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ خلافت اس کے ہاتھ میں جائے جو اس کے تمام شرائط سے آراستہ و پیراستہ ہو۔ لیکن افسوس کہ ایسا نہ ہو سکا اور اس کے تخت پر ایسے عباسی بادشاہ متمکن ہو گئے۔

جب ہم ان کتابوں کا مطالعہ کرتے ہیں جن میں کسی دورِ تاریخ کے حالات درج کئے گئے ہیں یا مختلف احادیث پیغمبرؐ کو اس لئے جمع کیا گیا ہے کہ آئندہ نسل کے لئے ایک عمدہ و تابندہ میراث بن سکیں۔

تو اپنے کو اس ڈوبنے والے کی مانند محسوس کرتے ہیں۔ جیسے چاروں طرف سے موجوں نے گھیر لیا ہے اور اس کے سامنے تاریکیاں ہی تاریکیاں ہوں۔ نور کی شعاعیں دور تک نظر نہ آتی ہوں اور اُمید کی کرنیں تک روپوش ہو گئی ہوں۔

اس لئے کہ یہ کتابیں خرافات سے پُر اور موضوعات و مجہولات کا خزانہ ہیں۔ ان کے مولفین کو اپنی غلط بیانیوں اور افترا پردازیوں کی حقیقت معلوم تھی۔ لیکن ان میں کسی نے کتاب وزیر کے لئے لکھی ہے اور کسی نے بادشاہ کے لئے تاکہ اپنی خواہش بھر مال حاصل کرے اور اپنی مادی پیاس بجھا سکے۔ ظاہر ہے کہ ایسی حالت میں وہ کتاب میں ان تمام باتوں کو درج کرے گا جو اس امیر یا وزیر کے پسندِ خاطر ہوں اس کی خواہشات کا علاج کر سکیں اور اُجرت بقدرِ ضروریات مل سکے۔ خدا ناراض ہوتا ہے۔ تو ہوا کرے۔

یہی وہ سبب تھا جس نے کتاب میں اختلاف کی بنیاد ڈالی۔ ایک ہی مولف ایک کتاب میں ایک بات لکھتا ہے۔ اور دوسری میں بالکل اس کے متضاد لکھتا ہے صرف اس لئے کہ ایک کتاب امیر کے نظریہ کے مطابق لکھی گئی ہے۔ اور دوسری وزیر کے نقطۂ نظر کے مطابق۔ ظاہر ہے کہ خواہشات کے اختلاف سے بیانات میں اختلافات ناگزیر ہے۔ یہاں کا صحیح وہاں کا غلط اور وہاں کا حق یہاں کا باطل۔

ہم ان تمام اختلافات کی مثالیں پیش کرنا شروع کر دیں تو ہماری مسافت زیادہ ہو جائے گی۔ اور مقصد صرف یہ ہے کہ اس ڈیوڑھی سے گزر کر اصل منزل تک پہونچ جائیں۔

اس کے باوجود چند مثالیں آپ کے سامنے پیش کی جا رہی ہیں تاکہ آپ اندازہ کر سکیں کہ لوگوں نے اپنی خواہشات کی تکمیل کے لئے کس طرح حقائق کو مسخ کیا ہے۔

بھلا کون ایسا ہے جو اس امر کا انکار کر سکے کہ حضور اکرمؐ نے حکم بن العاص اور اس کی اولاد پر لعنت کی ہے۔ مروان کو دیکھ کر لعون ابن لعون[1] کے نام سے یاد کیا ہے۔ بلکہ ولادت سے قبل ہی اس پر لعنت کی ہے جیسا کہ حضرت عائشہ کے قول سے معلوم ہوتا ہے کہ مروان رسول اکرمؐ کی لعنت کا ایک جزو ہے۔

اس کے علاوہ حضرتؐ نے حکم کو مدینہ سے باہر نکال دیا۔ اور اپنی زندگی بھر داخل نہ ہونے دیا۔

---

[1] ینابیع المودۃ ص۱۵۶ ۔ النزاع والتخاصم ص۸ ۔ شرح النہج ص۱۵۵ ۔ کشف الاستار ص۸۵، الاصابہ ص۱۲۶، الدرۃ ج (۱) ص۱۱۹ ۔ الغدیر ج (۵) ص۱۲، ج (۸) ص۲۴۹-۲۶۱ ۔ مستدرک حاکم ج (۴) ص۴۸۱-۴۸۲ ۔

بلکہ ابوبکر و عمر کے دورِ حکومت میں بھی جب اس کے بارے میں کوئی سفارش کی گئی تو دونوں نے نہایت ہی شدت کے ساتھ جواب دے دیا کہ "ہم رسولؐ کے نکالے ہوئے کو پناہ نہیں دے سکتے ہم حضرتؐ کے بست و کشاد کے پابند ہیں"۔ حضرت عمر نے عثمان کی سفارش پر یہ کہہ دیا کہ رسول اکرمؐ نکال باہر کریں اور ہم داخلہ کی اجازت دے دیں۔ ایسا کریں گے تو لوگ کہہ دیں گے کہ عہدِ رسولؐ کو متغیر کر دیا۔ خدا کی قسم مجھے یہ گوارا ہے کہ میرے جسم کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے جائیں لیکن مخالفتِ رسولؐ گوارا نہیں ہے۔ اے ابنِ عفان! دیکھو اب دکھانا۔[1]

کیا ان تمام حقائق و معارف کے بعد بھی یہ تصور ہو سکتا تھا کہ جناب شہاب خفاجی اپنے دور میں حکم کے تائب اور پاکباز ہونے کا اعلان کر دیں گے۔[2]

(ا)

اگر معاویہ کی دولت نہ ہوتی تو کون سا انسان ہوتا جو ابوسفیان جیسے دشمنِ دین کے ایمان بلکہ اسلام کا قائل ہوتا جس کے متعلق مشہور ہے کہ عباس اُسے امان دے کر رسول اکرمؐ کی خدمت میں لائے تو آپ نے فرمایا "اے ابوسفیان! کیا ابھی وقت نہیں آیا ہے کہ تو کلمۂ توحید کا اقرار کرے"۔ اور اس نے جواب دیا کہ میرے ماں باپ فدا! آپ جیسا صلۂ رحم کرنے والا حلیم و کریم کون ہوگا۔ مجھے معلوم ہو گیا کہ اگر کوئی اور خدا ہوتا تو میرے کام آتا۔ جس پر حضرتؐ نے فرمایا تھا کیا ابھی میری رسالت واضح نہیں ہوئی تو اس نے عرض کیا کہ آپ حلیم و کریم ضرور ہیں لیکن مسئلے میں کچھ تردد ہے۔ اور عباس نے بگڑ کر کہا تھا "کم بخت شہادت دے دے ورنہ گردن اڑ جائے گی"۔[3]

ابھی اس واقعہ کو کچھ عرصہ نہ گزرا تھا کہ ابوسفیان نے ایک مجمع کو حضور اکرمؐ کے پیچھے چلتے ہوئے دیکھا اور دبے لفظوں میں کہنے لگا "کاش اس شخص کی یہ حیثیت نہ ہوتی!" حضرتؐ نے یہ دیکھ کر ایک ہاتھ اس کے سینے پر مارا اور فرمایا "خدا تجھے رسوا کرے"۔ یہ سن کر ابوسفیان کو غیظ آگیا اور غصّے میں اپنے دل جذبات کا اظہار ان الفاظ میں کرنے لگا "مجھے ابھی تک آپ کی رسالت کا یقین نہیں ہے"۔[4]

---

[1] شرح النہج ج (۱) ص۶۶، الغدیر ج (۸) ص۲۵۰، رسائل جاحظ ص۸۰

[2] شرح النہج ج (۱) ص۲۲۲ [3] السیرۃ النبویہ ج (۱) ص۲۲۹

[4] استیعاب ج (۲) ص۱۰، شرح النہج ج (۴) ص۳۰، الغدیر جلد (۳) ص۲۲۳، رسائل جاحظ ص۸

[5] الاصابہ ج (۲) ص۱۰۱۔ الغدیر ج ۸ ص۲۸۵ ج (۱۰) ص۸۳

سچ تو یہ ہے کہ ابوسفیان کو اس کے بعد بھی یقین نہیں ہو سکا اور یہی وجہ ہے کہ اس کے لئے سب سے زیادہ تکلیف دہ کلمات وہ تھے جن سے رسالت کا اقرار ظاہر ہو سکے۔ چنانچہ پیغمبر اسلامؐ کو اپنے عظیم لشکر اور فدا کار انصار کے مجمع میں دیکھ کر عباس بن عبدالمطلب سے کہنے لگا۔ "خدا کی قسم تمہارے بھتیجے کا ملک بہت بڑا ہو گیا ہے"۔[1]

ایک اور موقع پر ابوسفیان نے آنحضرتؐ کو مسجد میں دیکھا تو ایسی نظر سے جس سے بغض، حسد، کینہ، عداوت، حسرت و رنج کے آثار نمایاں تھے۔ صرف اس لئے کہ رسول اکرمؐ کی تبلیغ ناکام نہیں ہو سکی۔ اور جس باطل کے لئے اس نے دائمی رسوائی اختیار کی تھی۔ وہ حق پر غالب نہ آسکا۔ یہ دیکھ کر دل ہی دل میں اپنے کو غلاب کرنے لگا اور کہنے لگا "کاش! مجھے معلوم ہو جاتا کہ یہ کیسے غالب آگئے"؟!

حضرتؐ نے یہ دیکھ کر چاہا کہ ابوسفیان پر یہ حقیقت واضح کر دیں کہ غلبہ کا معیار اکثریت اور مغلوبیت کا معیار اقلیت نہیں ہے۔ چنانچہ آپؐ نے اس کی پشت پر ایک ہاتھ مار کر فرمایا۔

"اے ابوسفیان! میں نے تجھ پر اللہ کے ذریعہ غلبہ حاصل کیا ہے"۔[2]

اس کے علاوہ جب اسے عثمان کی بیعت کی اطلاع ملی تو فوراً ان کے پاس پہنچ گیا، کہنے لگا یہاں کوئی اور تو نہیں ہے۔ اور جب اطمینان ہو گیا کہ تنہا سازگار ہے۔ تو کہنے لگا۔ "اب تیم و عدی کے بعد خلافت تمہیں ملی ہے۔ اسے گیند کی طرح نچاؤ اور اس کا مرکز بنی امیہ کو قرار دو۔ اس کی قسم جس کی قسم ابوسفیان کھاتا ہے۔[3] میں مدت سے اس کا امیدوار تھا اور اب تو یہ تمہاری اولاد میں میراث کے طور پر چلے گی۔ یاد رکھو خلافت ایک سلطنت ہے اس کے علاوہ جنّت و دوزخ کچھ بھی نہیں ہیں"۔[4]

اس کے بعد جناب حمزہ کی قبر کی طرف متوجہ ہوا تاکہ دل میں بھڑکنے والے شعلوں کو بجھا سکے اور قبر مبارک کو ٹھوکر مار کر کہتا ہے؛

---

[1] الامام علی صوت العدالۃ الانسانیۃ ج۱ ص۱۹۵، حیاۃ محمد ص۴۰۰

[2] صوت العدالۃ ص۲۰۸ ج ۴ ص۸۸

[3] ناظرین کرام ان ہستیوں سے بھی واقف ہیں جن کی قسم ابوسفیان کھاتا ہے۔ جن کا تعارف مختلف جنگوں میں ہو چکا ہے اور جن کے نام پر اصل میں شعار جنگ بن چکا ہے۔

[4] الاستیعاب ج ۴ ص۸۷-۸۸، شرح النہج ج ۱ ص۱۳۰، الامام علی ج ۱ ص۳۱۹، النزاع والتخاصم ص۲۰-۲۱، معجم القبور ص۱۹۳، اصل الشیعہ ص۵۵-۵۶، الغدیر ج ۸ ص۲۸۵-۲۹۳ ج ۱۰ ص۸۳، صوت العدالۃ ص۱۱۲ ج ۴ ص۹۱۵

"اے ابوعمارہ! دیکھو جس کام کے لئے تم نے شمشیر زنی کی تھی آج وہ ہمارے بچوں کا کھیل بن گیا ہے"[1]

افسوس! کہ اس کے بعد بھی آپ کتب احادیث کی سیر کریں گے تو ابوسفیان کے فضائل کا ایک پورا باب نظر آئے گا۔

ان واضعین حدیث نے اسی پر اکتفا نہیں کی کہ ابوسفیان کے بارے میں اسلام لانے کے بعد روایات وضع کرتے بلکہ اسلام لانے سے پہلے کے لئے بھی حدیثیں گڑھ ڈالیں۔

غالباً یہ فضائل اسلام کو تباہ کرنے اور رسول اکرمؐ سے خونریز جنگیں لڑنے سے پیدا ہوئے تھے۔

یہی نہیں بلکہ ایک کھلا ہوا جھوٹ یہ پیش کیا گیا کہ آنحضرتؐ نے فرمایا ـــــ

اسلام کو ہمیشہ ابوسفیان کی تائید حاصل رہی ہے۔ قبل اسلام اور بعد اسلام جب میں اللہ کی طرف سے ابوسفیان کے پاس محاسبہ کے لئے آیا تو میں نے دیکھا کہ وہ ہاتھ میں یاقوت سرخ کا ایک کاسہ لئے ہے اور کہتا ہے میرے دوست! نوش کیجئے۔ لوگ ابوسفیان کی مذمت کرتے ہیں حالانکہ انھیں رضا ہی رضا حاصل ہے۔ خدا ان پر رحم کرے۔ بھلا ان کمالات و فضائل کے بعد ابوسفیان کا مثل کون ہو سکتا ہے؟[2]

ہم اس افترا پردازی پر کسی تنقید سے اس لئے معذور ہیں کہ ابوسفیان کی پوری زندگی ایک مستقل تنقید ہے۔ تاریخ کے وہ صفحات جن میں اغراض و مقاصد اور خواہشات کی پوری داستانیں درج ہیں ہمیں کسی مزید تبصرہ سے روک رہے ہیں۔

آپ جس طرح کتب احادیث میں ابوسفیان کے فضائل دیکھیں گے اسی طرح آپ کو ایک بڑی ذخیرہ مغیرہ بن شعبہ بدکار، مروان بن حکم لعون، عمرو بن عاص اور معاویہ جیسے ائمۂ ضلال[3] اور اس کے علاوہ محقق اولاد زنا اور صاحبان پرچم فاحشہ کے فضائل نظر آئیں گے۔

ابن حجر نے اپنی کتاب صواعق محرقہ کے بیانات پر اکتفا نہیں کی بلکہ معاویہ کی خلافت کے اثبات کے لئے ایک مستقل کتاب لکھ ماری اور اس کا ایک بھاری بھرکم نام "تطهير الجنان واللسان عن الخطور والتفوة بثلب سيدنا معاوية بن ابی سفيان" رکھ دیا۔

۱؎ النزاع ص۷۲، شرح النہج ج ۴ ص۵۱، مروج الذہب ج ۲ ص۳۵۱، الامام علی ص۲۲۲، الغدیر ج (۱۰) ص۸۲، صوت العدالۃ ص۲۰۹، ج ۴ ص۷۲ ـــ ۲؎ الغدیر ج ۱۰ ص۱۶۹–۱۷۰ ـــ ۳؎ شرح النہج ص۶ میں ابن ابی الحدید نے جناب امیرؑ کے کلام کی شرح کرتے ہوئے ائمۂ ضلال سے معاویہ و عمرو بن عاص وغیرہ کو مراد لیا ہے۔

عنوان کا رعب داب دیکھ کر اگر آپ اس عنوان سے مرعوب ہو گئے تو اپنے دل و زبان کو طاہر بن طاہر سردار ابن حجر، سرفہرست تاجرین معرفت کی شان میں جسارت سے پاک کر لیجئے۔

وہ کیا علیؑ سے جنگ کرنا، ان کے خلاف بغاوت کرنا، مسلمانوں کا خون بہانا، علیؑ کو لعن و طعن، سب و شتم سے یاد کرنا۔ عمرو و حجر اور دیگر اصحاب کو قتل کرا دینا، امام حسنؑ کو زہر دے دینا، مالک اشتر کو شہید کرانا، زیاد کو اپنا بھائی بنا لینا اور دیگر قبیح اعمال کا معاملہ تو اس کا صاف حل یہ ہے کہ معاویہ مجتہد تھا اور مجتہد کو غلطی پر بھی ایک اجر ملتا ہے۔ پھر وہ تو وحی کا امین ہفتم یا سیوم بھی تھا[1]۔

اگر آپ اس کتاب کی چند سطروں کا بھی مطالعہ کر لیں تو رنج و غم سے آپ کا دل پاش پاش ہو جائے گا اور آپ حیرت زدہ رہ جائیں گے کہ حقائق یوں بھی مسخ کئے جاتے ہیں۔ اور حق سے یوں بھی دشمنی کی جاتی ہے۔ اس کتاب میں وہ حدیثیں بھی نظر آئیں گی جو آنحضرتؐ نے معاویہ کی مذمت میں ارشاد فرمائی ہیں اور صاحب کتاب نے انھیں تاویل کر کے مدح کے موڑ پر لگا دیا ہے۔

اس کے علاوہ کتاب دبستان کا ایک استبداد ہے جیسے رسول اکرمؐ اور امیر المومنینؑ کی زبان مبارک سے ادا کیا گیا ہے۔ اب اس مقام پر ابن حجر کو معذور سمجھئے اس لئے کہ اس نے یہ کتاب شہنشاہ ہند ہمایوں کی خواہش پر تالیف کی ہے۔ اور ظاہر ہے کہ ایسی تالیف کا معیار ہی یہ ہے کہ سلاطین و امراء کے چشم و ابرو کے اشاروں پر قلم کو گردش دی جاتی ہے۔

بعض لوگ ابن حجر جیسے ضمیر فروش، باطل کوش اور حق پوش لوگوں کو واقعاً معذور سمجھتے ہیں اور ان کی دنیاداری و زر پرستی کو مجبوریوں پر محمول کرتے ہیں۔ لیکن ہمارا خیال یہ ہے کہ یہ عذر لنگ ان لوگوں کے موقف کو جائز نہیں بنا سکتا۔ اس جعل و فریب کی مکمل مسئولیت انھیں مؤلفین کے سر ہے۔ انھیں لوگوں نے خلافت ظالمہ کی بنیاد رکھی ہے اور اس کے ارکان مستحکم کئے ہیں۔ اب اگر ان حضرات کو بھی معذور تسلیم کر لیا جائے تو ان لوگوں کے لئے کیا عذر ہو گا۔ جو عصر نور و حریت میں واضح حقائق کو دیکھنے کے بعد بھی تسلیم کرنے پر تیار نہیں ہیں۔ ماضی کے افسانوں پر اعتماد کرتے ہیں۔ اور آزادیٔ فکر کے ساتھ بحث و تمحیص، تحقیق و تفتیش کی زحمت گوارا نہیں کرتے۔

۱؎ انہی جعلی حدیثوں میں ایک افسانہ یہ بھی ہے کہ "امین سات ہیں لوح، قلم، اسرافیل، جبرئیل، میکائیل، محمدؐ، معاویہ" اور بعض روایات کے اعتبار سے صرف تین ہیں۔ جبرئیل، پیغمبرؐ، معاویہ، آنحضرت کا ارشاد ہے کہ قریب تھا کہ معاویہ نبی بن جائے اس کا علم اتنا اور وہ امین کلام الٰہی تھا۔ خدا اس کے گناہ بخشے، اسے حساب سے بچائے اسے ہدایت یافتہ قرار دے (الغدیر ج ۵ ص۳۰۲) اس کتاب میں صفحہ ۲۵۲ سے ۲۸۴ تک ان خرافات کی ایک فہرست درج کی گئی ہے جنکی تعداد تقریباً ایک سو پانچ تک پہنچ جاتی ہے۔

مانا کہ اُس دَور کی بدنام سیاست ایسے ہی موقف کی خواہاں تھی۔ افتراق اور اختلاف ہی کو پسند کرتی تھی، کرایہ پر زبان وقلم خریدنے کی عادی تھی۔ اپنے کمزور اور بے بنیاد تصور کو محکم ہی کرنا چاہتی تھی۔ خلافت اسلامیہ کے نام پر "لڑاؤ اور حکومت کرو" کے اصول پر عامل تھی۔ تو آج کا دور تو ویسا نہیں ہے آج کے حالات تو کل سے مختلف ہیں۔ آج کی دنیا تو دوسری ہو چکی ہے۔ آج وحدت واتفاق کا زمانہ ہے۔ آج مشترکہ دشمن کے مقابلے میں تمام سابقہ کینوں کو دلوں سے نکال کر برابر سے صف آرا ہونے کی ضرورت ہے۔ آج فضاء کو گمراہیوں اور جعل سازیوں کے بادلوں سے صاف کردینا چاہیئے۔ لیکن افسوس کہ حالت اس حالت اس کے بالکل برعکس ہیں۔

اب جو انسان بھی واقعہ کی حقیقت تک پہنچنا چاہتا ہے اُس کا فریضہ ہے کہ پہلے اپنے جذبات وعواطف اور سوم وتعالید کی اصلاح کرے۔ اس کے بعد ایک مخلص، پاکباز اور طالب حقیقت کی حیثیت سے خالصاً لوجہ اللہ تحقیق شروع کرے اس کا مقصد صرف حقائق کا اجاگر کرنا اور حق کی نورانیت کو عالم آشکار کرنا ہو۔ اور اگر کسی شخص کو یہ کیفیات میسر نہ ہوں تو ایسے چاہئے کہ ماضی کو بالکل فراموش کردے۔ ان تاریکیوں میں قدم نہ رکھے' ایسا نہ ہو کہ بلا علم وعرفان فیصلے شروع کردے اور اس طرح خواہشات وجذبات پرستی میں بدنام بھی ہو اور اسلامی وحدت کے شیرازہ کو منتشر بھی کردے۔

آہ افسوس! افسوس!! محرومی' ناکامی . . . . لوکِ قلم سے اشک جاری ہیں۔ یہ "لیکن" کہاں سے آگیا۔ خدا برا کرے اس "لیکن" کا! یہ تمدن وروشن فکری' علم وایلم' بحث وتمحیص وتحقیق کا زمانہ اور اس میں ایسے اشخاص جن کا جسم حال کے قید وبند میں ہے اور دماغ ماضی کے ظلمات میں گردش کر رہا ہے۔ یہ عہد سنگ کی یادگار تعلیں صرف اس لئے رہ گئی ہیں کہ مسلمانوں میں فساد برپا کریں۔ عوام کو گمراہ کریں' علوم ومعارف کا چہرہ بگاڑ دیں اور پھر علماء و عرفاں ہی بنے رہیں۔

ہم اس مقام پر ان لوگوں سے محاسبہ یا ان کی تردید کرنا نہیں چاہتے۔ اس کام کے لئے بڑا وقت درکار ہے۔ ہم تو صرف یہ پوچھنا چاہتے ہیں کہ جب رافعی نے "تحت رایۃ القرآن" لکھی جو ایک غیر شیعہ مؤلف کا جواب تھی تو اس کی کیا ضرورت محسوس کی کہ شیعوں پر بھی افتراء وبہتان رکھ دے؟ اگر دل میں کچھ نہ تھا۔

ڈاکٹر احمد امین اپنی ان کتابوں میں جن کا نام "صبح دشام دلام" رکھا گیا ہے۔ اس بات پر کیوں اڑے ہوئے ہیں کہ شیعوں کی توہین کی جائے یہاں تک کہ بعد میں علامہ کاشف الغطا طاب ثراہ سے یہ معذرت کرنا پڑے کہ ان بیانات کا کوئی رنگ وماخذ نہیں تھا۔

کیا عبداللہ القصیمی' محمد رشید رضا' محب الدین الخطیب جیسے استعماری وزر خرید افراد جنھوں نے اپنے حسد' کینہ' بغض وعداوت' مرض قلبی وبے تربیتی کی بنا پر اپنے قلبی مفاسد وامراض کے رد عمل کے طور پر فضائے اتحاد کو مسموم اور معاشرۂ اتفاق کو فاسد بنا دیا ہے۔ ان حضرات کے لئے یہ مناسب نہ تھا کہ اپنے علوم ومعارف کو ان راہوں میں صرف کرتے جن سے عمومی منفعت اور دائمی فائدہ حاصل ہوتا۔ خدا وضمیر اور حق ودین راضی ہوتے ہیں۔ دین کے سرچشمہ سے سیراب ہوا جاتا۔ محبت وغیرت اسلامی کے جذبات کار فرما رہتے' الفت واتحاد کا اضافہ ہوتا اور اس طرح مسلمان سیسہ پلائی ہوئی دیوار کے مانند باطل کے مقابلے میں جم جاتے۔

لیکن افسوس ان لوگوں نے ذلیل اغراض کے لئے ٹیڑھے راستوں کو اختیار کیا۔ راستے الگ الگ ہو گئے' مرکز فراموش ہو گیا۔ ہدایات کے نشانات گم ہو گئے۔ گمراہی کے گڑھے سامنے آگئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان تاریخی جنایتوں نے لقمہ گلوگیر کر دیا اور آنکھوں میں کھٹک پیدا کردی۔

---

[1] موصوف نے اپنی کتاب "الصراع بین الاسلام والوثنیۃ" میں اسلام سے سُنّی اور بُت پرست شیعوں کو مراد لیا ہے۔ والد مرحوم طاب ثراہ نے اس کتاب کی علمی رد نہایت ہی سنجیدہ انداز میں تحریر فرمائی ہے۔ اور اس طرح کتاب کے بہتان وافتراء کو واضح کر کے اتحاد واتفاق کی فضا کو خوشگوار بنایا ہے۔ والد مرحوم کی کتاب کا اسلوب نہایت ہی پاکیزہ ہے۔ ان کا مقصد صرف احقاق حق اور اتحاد المسلمین تھا۔ اجل نے والد مرحوم کو کتاب کی تکمیل کا موقع نہ دیا۔ لیکن اس کے باوجود قصیمی کی رد کے لئے کافی ذخیرہ موجود ہے۔ اس لئے کہ اس کی دو جلد کتاب میں سب وشتم کے علاوہ کچھ بھی نہیں ہے۔

[2] آپ کی کتابیں "المنتقد الشیعۃ" ہے اس کتاب میں افتراء وبہتان' سب وشتم' طعن وطنز کا ایک کافی ذخیرہ موجود ہے۔

[3] آپ نے اکثر حواشی وتحریرات میں ایسی شرمندہ کن سب وشتم سے کام لیا ہے جس سے نہ اسلام راضی ہے نہ عربیت بالخصوص آپ کا حاشیہ "مختصر منہاج السنۃ" پر انتہائی تکلیف دہ ہے جس میں علماء شیعہ قدماء ومعاصرین کے بارے میں ایسے کلمات استعمال کئے گئے ہیں۔ جن کو تہذیب وحیاء سے کوئی ربط نہیں ہے۔ اس کے علاوہ مجلہ "الازہر" کے مقالات آپ کی نفسانی کیفیات کے صحیح عکاس وترجمان ہیں۔ افسوس کہ یہ رسالہ جامعۂ ازہر کی طرف سے نکلتا ہے جس کا نام دینی اور کلم اتحاد بین المسلمین ہے لیکن اس کے باوجود ایسے مقالات کو بھی جگہ دے دی جاتی ہے۔ شیخ الازہر حضرت شلتوت نے جہاں فقہ جعفری کی تعلیم کا انتظام کیا ہے۔ وہاں ان کا فریضہ یہ بھی ہے کہ خطیب جیسے افراد کی زبان بندی کریں اس لئے کہ یہ آوازیں اتحاد کو برقرار رکھ سکتی ہیں اور نہ اسلامی بنیادوں کو برقرار رہنے دیں گی۔ اگر دنیا میں اسم ومسمّی میں مطابقت کا خیال ہوتا تو اس شخص کا نام محب الدین نہ ہوتا اسلئے کہ نام گمراہ کن جعلساز' فریب دہ اور سراپا سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا ــــــــ (مولف)

(شیخ الازہر اس دنیا سے رحلت کر چکے ہیں۔ اس لئے یہ ذمہ داری مصر کے موجودہ علماء اور اہل قلم پر ہے ــــ جوادی)

شاید اس کے بعد بھی یہ لوگ یہی خیال کرتے تھے کہ انھوں نے اپنے فریضہ کو نہایت ہی حسن و خوبی کے ساتھ انجام دیا ہے۔ حالانکہ اگر وہ ذرہ برابر فکر کرتے اور ذرا بھی تامل کرتے تو ان کے سامنے وہ تلخ حالات آجاتے اور وہ اپنے کو دین کے سرچشمہ سے بہت دور پاتے' ان پر یہ واضح ہو جاتا کہ انھیں دین سے وہی تعلق ہے جو بھیڑیئے کو جناب یوسفؑ کے خون سے تھا۔

ہمارا مقصد یہ نہیں ہے کہ علماء میں ایسے افراد نہیں ہیں جنھوں نے دینی تعلیمات کو حاصل کیا ہے۔ اپنے کو ان خرافات کے مقابلے کے لئے وقف کر دیا ہے اور اپنے فرائض کو پوری طرح انجام دیا ہے۔ جس میں سوائے خوشنودی اور رضائے خدا کے ان کی کوئی غرض و غایت نہ تھی۔ ان حضرات نے اس آواز کو بلند کیا جس کا مقصد واضح اور نمایاں تھا۔ اتحاد کے قصر کی بنیادوں کو مستحکم بنایا' افتراق پسند باطل کوش حق پوش اور سیاہ کار عناصر کا شدت سے مقابلہ کیا۔

ہیں اور یقیناً ہیں۔ لیکن ہماری گفتگو کا تعلق فی الحال ان سچے خدمت گزاروں سے نہیں ہے۔ ہماری بحث تو ان سیاہ کاروں سے ہے جن سے فضائے اسلام مکدر ہوئی ہے اور جن کی ذات افتراق کا اہم سبب ثابت ہوئی ہے ہم ان لوگوں کا ذکر بھی نہ کرتے لیکن جناب ابوطالب کی سیرت کے بارے میں گفتگو کرنے کے لئے اس موضوع کا زیر بحث لانا انتہائی ضروری تھا۔ اس لئے کہ وضع احادیث کے سلسلے میں جن افراد کو نشانہ ستم بنایا گیا ہے۔ ان میں سے ایک آپ کی ذات گرامی بھی ہے۔

معاویہ نے زبان و قلم' شمشیر و خنجر کوئی وسیلہ ایسا نہیں چھوڑا جس سے حضرت علیؑ کا مقابلہ نہ کیا ہو اور ظاہر ہے کہ اس طوفانی سیلاب کی زد میں جناب ابوطالبؑ کو بھی آنا چاہیئے تھا۔ اس لئے کہ آپ انھیں کے باپ تھے بلکہ شاید اگر یہ رشتہ نہ ہوتا تو یہ حملے بھی نہ ہوتے جیسا کہ میرے والد مرحوم فرماتے تھے[1]

یہی وہ تاریک و سیاہ حالات تھے جنھوں نے حقائق کو مسخ کر کے کتم عدم میں ڈال دینے پر کمر باندھ لی تھی۔ اب کیا تعجب تھا اگر یہ حالات شیخ بطحا پر اس وقت حملہ آور ہو جائیں جب آپ دنیا کو خیرباد کہہ کر تشریف لے جا رہے تھے۔ احتضار کا عالم تھا۔ روح تن سے کھنچ رہی تھی۔ آنکھوں میں خنکی تھی۔ دل کو راحت تھی۔ صرف اس بات سے کہ آسمانی پیغام کی پوری طرح حمایت کی جا چکی ہے۔

جانے والے کو اس بات کی مطلق فکر نہ تھی کہ آنے والے زمانے کو مسخ شدہ تاریخ اس کے حالات میں کتنا بیونت کرے گی۔ اس کے اس عظیم کردار بلند و فارع' ہمت آزما مواقف کو فراموش کر دے گی جن میں عقیدہ سے دفاع' بنیادوں کا استحکام' رسالت کے نغمے اور فضائل و کرامات نبوت پر افتخار کے آثار نمایاں طور پر نظر آتے ہیں۔

تاریخ نے ان کارہائے نمایاں میں بعض کا تذکرہ ضرور کیا ہے لیکن مورخ کو جب یہ یاد آگیا کہ ابوطالب حضرت علیؑ

---

[1] مؤلف المحترم کے والد مرحوم نے اپنے ایک درس میں اس مقصد کی وضاحت فرمائی ہے۔ (مترجم)

کے باپ تھے تو قلم بہکنے لگا۔ رفتار بدل گئی' راستہ تبدیل ہو گیا اور صراط مستقیم کو مجبوراً چھوڑنا پڑا۔ اس لئے کہ دل کے تقاضے اپنے اتباع پر مجبور کرتے ہیں۔

یاد رکھیئے! ابر کس قدر کیوں نہ جمع ہو جائیں۔ آفتاب کا چہرہ کتنا ہی کیوں نہ چھپا دیا جائے لیکن وہ ہمیشہ ان دراڑوں اور روزنوں کی فکر میں رہتا ہے جن سے اپنی شعاعوں کو عالم تک پہنچا کر دنیا کو منور کر سکے۔ آفتاب یہ کیونکر برداشت کر سکتا ہے کہ اس کی میر باقی رہے۔ اور دنیا تاریک رہے۔

یہی وجہ ہے کہ آپ تاریخ کے اتنے مظالم کے باوجود ایسے صفحات بھی دیکھیں گے جن میں اس مرد مجاہد کے سوانح حیات کے کلمات نمایاں حروف میں جلوہ گر نظر آتے ہیں۔

میں نے ابتدائے امر میں یہ خیال کیا تھا کہ اس اہم اور متنازعہ فیہ مسئلے پر قلم اٹھانا انتہائی دشوارگزار امر ہوگا۔ اس لئے کہ ماخذ قلیل اور مدارک کم ہیں۔ لیکن میں اپنی راہ پر چلتا رہا' قدم آگے بڑھاتا رہا اور آخرکار اس مرد مجاہد کی مدد سے ایک بڑا ذخیرہ ہاتھ آگیا۔ مختلف کتابوں سے مطالب جمع کئے اور حق کو حق کی خاطر نمایاں کرنے کا سامان ہو گیا۔

دل نے کہا۔ "حق کو ناصر و مددگار ضرور مل جاتے ہیں۔ باطل کو بقا نصیب نہیں ہو سکتی۔ کذب و بہتان کی عمر کم اور نور الٰہی کی تمامیت مسلم ہے۔"

بادل کتنے ہی کیوں نہ چھائے رہیں ایک ایسی ہوا بھی آئے گی جو ان کو پارہ پارہ کر دے۔ آسمان کتنا ہی ابرآلود اور تاریک کیوں نہ ہو' فضا کی صفائی' افق کی چمک اپنی راہ ضرور بنائے گی۔

وَمَا تَوْفِیْقِیْ اِلَّا بِاللّٰہِ

عَلَیْہِ تَوَکَّلْتُ وَاِلَیْہِ اُنِیْبُ

الجزءِ اوّل

مدارجِ زندگانی

خاندان

وہ تاریک سماج اور جاہل معاشرہ جس میں دینی نقطۂ نظر سے حیاتِ انسانی انتہائی پستی میں پڑی تھی' اصنام کی فراوانی تھی' ہر قبیلہ کا صنم الگ' ہر گھرانے کا معبود جدا' بلکہ ہر شخص کا ایک جداگانہ خدا تھا جس میں دوسرے کی شرکت غیر ممکن تھی۔

وہ ماحول اور معاشرہ جس میں شعور مردہ' احساس مفقود' آنکھیں بند اور علاماتِ ربوبیت ناقابلِ توجہ تھے

وہ سماج جس میں ایسی تند و تیز آندھیاں چل چکی ہوں۔ جن سے دینِ فطرت اور ابراہیمی ملتِ سنگ و چوب کی پرستش میں بدل گئی ہو جس کے معبود انسانی ہاتھ کے تراشے ہوئے ہوں کہ نہ بولیں نہ فائدہ پہنچا سکیں نہ نقصان' مختلف رنگوں سے رنگے جائیں۔ مختلف زینتوں سے آراستہ کیے جائیں اور پھر انھیں خدا بنا لیا جائے یا ان کے ذریعہ خدا تک پہنچا جائے۔

ایسا ماحول جس میں جہالت و ضلالت کی بدلیاں چھائی ہوئی ہوں' آنکھیں بند' دل مقفل' احساس مردہ اور بشریت قعرِ مذلت میں ہو۔

ایسے ماحول میں ایک ایسے انسان کا پیدا ہو جانا انتہائی دشوار تھا۔ جس کی آنکھیں دور رس' دل کشادہ اور فکر صحیح ہو۔ جو نور کو دیکھ کر اس کی شعاعیں حاصل کر سکتا ہو۔ اپنے راستوں کو خود ہی روشن بنا سکتا ہو' کتبِ سماویہ کا مطالعہ کر کے دل کو مطمئن کر سکتا ہو۔ ضمیر کو راحت پہنچا سکتا ہو۔ زندگی کے سخت ترین مراحل کو جھیل کر اطمینان حاصل کر سکتا ہو۔ جو آسمانی ستاروں اور عالمِ طبیعت کے کیفیات میں ضروریاتِ رسولؐ کے آثار کا مطالعہ کر سکتا ہو' ارضِ مکّہ کو مرکزِ انوار سمجھ کر خوشی سے مست و مگن ہو جاتا ہو۔

جس کا دل اس امید پر رقص کرتا ہو کہ ہم بھی اس نورِ کامل سے شعاعیں حاصل کریں گے ہم بھی اس ضیاء مجسم کی کرنوں سے استفادہ کریں گے۔

ایسا پست و انحطاط پذیر ماحول جس میں کوئی مکان بھی کسی لکڑی یا پتھر کے ٹکڑے سے خالی نہ ہو۔ وہ ٹکڑا جسے سب گھر والے سجدہ کریں۔ جس کی بارگاہ میں تضرع و زاری کریں۔ اس سے طالبِ امداد ہوں اور اس سے توفیقات کا مطالبہ کریں۔ اس کی بارگاہ میں وہ ہاتھ اٹھائیں جنھوں نے اسے حل کیا ہے تراشا ہے۔ بنایا ہے اور پھر اسی سے خوفزدہ اور امیدوار ہوں۔

مگر کیا کہنا اس گھر کا جو ایسے ہی تنگ و تاریک ماحول میں خلیلی شعاعیں پیش کر رہا تھا۔ اس کی روشنی دائم اور اس کا ثبات قائم تھا۔ اس پر نہ کفر کی تاریکیاں مسلط تھیں نہ جہالت کی ہوائیں۔ اس کا ایمان اتنا مستحکم تھا کہ ملتِ ابراہیم' توحیدِ الٰہی' شریعتِ فرّاء کے بارے میں کبھی شک کو اپنے دل میں جگہ نہیں دی

اس گھرانے کو خلیلِ خدا سے دو قسم کے تعلقات حاصل تھے۔ ایک نسل و ابوت کا رشتہ اور ایک دین و عقیدہ کا تعلق' گویا کہ یہ مکان وراثتِ خلیل کا ایک تسلسل تھا جو اس وقت تک باقی رہ گیا تھا۔

اسی عمیق الایمان اور راسخ العقیدہ گھرانے میں جناب ابوطالبؑ نے آنکھیں کھولیں اور حیات کے مدارج طے کئے ظاہر ہے کہ اس گھر کی زندگی دوسری زندگیوں سے اور اس کا رہن سہن دوسرے لوگوں کے طور طریق سے بالکل مختلف ہوگا

اس گھر کے ذمہ دار حضرت عبدالمطلب دوسرے انسانوں سے بالکل مختلف شخصیت کے مالک تھے وہاں پورے سماج میں ڈیل ڈول جسم و ہیکل کو زندگی تھی۔ انسانی چہروں پر دل لبھانے والے محاسن کی کثرت تھی۔ عقل کا گذر نہ تھا عالم یہ تھا کہ انسان اگر کبھی فریبِ نظر میں مبتلا ہو بھی جائے تو ایک مرتبہ گھبرا کر اسی طرح چیخ پڑے جس طرح دعبل نے ایک ادنیٰ توجہ کے بعد فریاد شروع کر دی تھی۔ "ادھر سے تعداد تو بہت ہے۔ لیکن کوئی ایک نظر کیوں نہیں آتا"

لیکن یہ ذمہ دار انسان قوم میں محترم' باوقار اور باہیبت ہے اس کا قول مسموع اور اس کا حکم نافذ ہے اس کی سخاوت شہرۂ آفاق اور اس کا کرم غیر منقطع ہے یہ مسافر کو اس کی سواری پر کھانا دیتا ہے اور طیور و وحوش کے لئے ان کے مساکن اور آشیانوں تک غذائیں پہنچاتا ہے۔ اس کا لقب ایک طرف "فیاض" ہے۔ تو دوسری طرف "مطعم طیر السماء" (اڑتی چڑیوں کو کھلانے والا) اس کی دعائیں مستجاب ہیں' اس کے مطالبات معقول اور اس کی طلب پر لبیک ہے۔ گویا وہ آسمان کا محبوب اور زمین کا ہر دلعزیز ہے۔ اسی لئے تو اسے "شیبۃ الحمد" کہا جاتا ہے۔

اس میں جاہلیت کی کثافتیں' گمراہی کی پستیاں نہیں ہیں۔ وہ احکام بناتا ہے تو ایسے جو اس کے پاکیزہ اور بلند نفس ہونے پر دلالت کریں۔ وہ اپنے طور طریقوں سے ملتِ ابراہیمی کو باقی رکھنا چاہتا ہے۔ اس کی نظر میں شراب خوری' محرم عورتوں سے نکاح حرام ہے۔ کعبہ کا طواف سات مرتبہ ضروری ہے ننگے ہو کر طواف کرنا ناجائز ہے۔ چور کے ہاتھ کاٹنا ضروری ہے۔ زناکاری' لڑکیوں کو دفن کرنا' قمار بازی' جوا باز کا ذبیحہ سب حرام ہے

اور نذر کا پورا کرنا واجب ہے۔[1] اس لئے یہ احکام اتنے مقدس اور پاکیزہ ہیں کہ اسلام نے سب ہی کو قائم و دائم رکھا۔

ابوسفیان کے باپ حرب ابن امیہ بن عبد شمس سے ایک یہودی کا جھگڑا ہو گیا۔ یہودی نے سرِبازار اسے برا بھلا کہہ دیا۔ حرب کو غیرت آ گئی، اپنی موروثی مکاری سے کام لینے کی ٹھان لی اور ایک شخص کو آمادہ کر کے اس شخص کو قتل کرا دیا۔

جناب عبدالمطلب کو ان مکاریوں کی اطلاع نہ تھی اور آپ یہ بھی نہ چاہتے تھے کہ اس یہودی کا خون رائیگاں ہو جائے۔ اس لئے آپ نے حرب کو اس بات پر مجبور کیا کہ وہ یہودی کے عزیزوں کو سو اونٹ بطور دیت پیش کرے۔[2]

ان تمام باتوں کے علاوہ آپ نے نہ کبھی بوسیدہ لکڑی کے ٹکڑے کو سجدہ کیا اور نہ کبھی کسی تراشے ہوئے پتھر کو۔ آپ ایک بافہم و باشعور اور دانش مند و ذکی انسان تھے۔[3]

غارِ حرا میں عبادت کی بنیادیں آپ ہی نے قائم کی تھیں۔ جب ماہ رمضان ہوتا تھا تو آپ پہاڑ پر چلے جاتے تھے۔ اور چند دنوں تک عظمت و جلالتِ الٰہی میں تفکر و تامل کیا کرتے تھے۔

جناب ابوطالب نے اپنے باپ کا وہ وقت بھی دیکھا تھا جب ابرہہ خانۂ کعبہ کو منہدم کرنے کے لئے آیا اور اس نے جناب عبدالمطلب کے جانوروں پر قبضہ کر لیا۔ آپ اس سے اپنے جانوروں کا مطالبہ کرنے کے لئے گئے تو اس نے نہایت درجہ توہین آمیز نظروں سے دیکھ کر کہا۔

"افسوس! کہ تمہیں اپنے اونٹوں کی فکر ہے اور اس گھر کی فکر نہیں ہے جو تمہاری نظر میں مقدس ترین مکان ہے"

آپ نے نہایت سنجیدگی کے ساتھ اپنے ایمانِ محکم اور قلبِ مطمئن کا ثبوت دیتے ہوئے فرمایا۔

أَنَا رَبُّ الْإِبِلِ وَلِلْبَيْتِ رَبٌّ يَحْمِيهِ

"میں اونٹوں کا مالک ہوں مجھے ان کی فکر ہے۔ اس گھر کا مالک کوئی اور ہے وہ خود ہی حفاظت کرے گا"

پھر اس کے بعد خانۂ کعبہ کے قریب گئے اور زنجیر پکڑ کر مناجات کرنے لگے۔

---

[1] السیرۃ الحلبیہ ج ۱ ص ۴، السیرۃ النبویہ ج ۵ ص ۱۱، البحار ج (۶) ص ۱۳۵، العباس ص ۱۲، ینابیع المودۃ ج ۲ ص ۱۰

[2] السیرۃ الحلبیہ ج ۵ ص ۴، ابن اثیر نے تاریخ کامل ص ۱۰ پر اس واقعہ کو مختلف انداز سے نقل کیا ہے جس میں فیصلہ کو نوفل بن عبد العزیٰ، عمر بن خطاب کی طرف منسوب کیا۔

[3] ابن ابی الحدید نے اپنی شرح کے جلد (۱) ص ۶۲ پر دورِ بعثت کے حالات لکھتے ہوئے تحریر کیا ہے کہ اس دور میں بھی بعض ایسے حضرات موجود تھے جو موحد، متقی اور خدا شناس تھے۔ جیسے جناب عبداللہ، جناب عبدالمطلب اور جناب ابوطالب۔

یارب لا ارجو لهم سواكا	یارب فامنع منهم حماكا
خدایا اب تیرے سوا کوئی نہیں ہے	تو ہی اپنے حرم کی حفاظت کر
ان عدو البیت من عاداك	امنعهم ان یخربوا فناكا
خدایا دشمنِ کعبہ تیرا بھی دشمن ہے	اسے اتنا موقع نہ دے کہ اس مکان کو برباد کر سکے

اللہ اللہ کیا ایمان افروز اور توحید آمیز مناجات ہے۔

اس کے بعد دل کی آواز سنی ـــــ "ضرور کوئی انتظام ہوگا" ـــــ اور کہنے لگے۔

لاهم ان العبد یمنع رحله فامنع حلالك

خدایا! بندہ اپنے مال کی حفاظت کرتا ہے تو اپنے مال کا تحفظ کر

لا یغلبن صلیبهم و محالهم عدوا محالك

خدایا! ایسا نہ ہو کہ مسیحیت کے آثار تیرے گھر پر غالب آ جائیں

ولئن فعلت فانه امات تتم به فعالك

آج کے تیرے فعل سے تمام افعال کی تکمیل ہوگی۔

انت الذی ان جاء باغ نرتجیك له فذالك

تو ہی وہ ہے کہ جب کسی باغی کے مقابلے میں تجھ سے کچھ چاہتے ہیں تو ملتا ہے۔

ولوا ولم یحووا سوی خزی وتهلكهم هنالك

خدایا یہ رسوا ہو کر پلٹیں اور انھیں ہلاک بھی کر دیا جائے

لم استمع یوما بارجس منهم یبغوا قتالك

میں نے اتنی گندی ذہنیت سنی بھی نہیں کہ اب تجھ سے بھی جنگ ہوگی

جروا جموع بلادهم والفیل کی یسبوا عیالك

یہ اپنے وطن کا سارا اجتماع مع ہاتھی کے لیکر آئے ہیں تاکہ تیری پناہ والوں کو پکڑیں

عمدوا حماك بكیدهم جهلا وما رقبوا جلالك

یہ تیرے حرم کا قصد کر چکے ہیں اور تیرے جلال کو بھول گئے ہیں۔

ان كنت تاركهم وكعبتنا فامر ما بدا لك[1]

---

[1] کامل ابن الاثیر ج (۱) ص ۲۶۰، بحار ج (۲) ص ۱۳۳، مروج الذہب ج (۳) ص ۱۲۸

اگر آج تو نے انھیں چھوڑ بھی دیا تو تیری خاص مصلحت ہوگی۔

پھر آپ نے قریش سے خطاب کر کے فرمایا۔

"یاد رکھو! یہ لوگ اس گھر تک نہیں پہونچ سکتے" اس لئے کہ اس کا محافظ موجود ہے۔"

پھر چپکے چپکے دعائیں شروع کر دیں۔ اُدھر آسمان پر ابابیل اڑنے لگے۔ خاموش طیارے؟ مگر ایٹم بم سے بہتر بم گرائیگا ——— وہ بم جو مجرم کے علاوہ کسی کو نقصان نہ پہنچائیں۔ بے قصور کو ہلاک نہ کریں۔ آج کا سا ایٹم بم نہیں۔ جو پوری بشریت کو ہلاک کر دے اور گنہ گار و بے گناہ کے امتیاز کو مٹا دے۔ یہ انسان کی ایجاد ہے اور وہ خالق بشریت کی تخلیق۔!

ابوطالبؑ نے اپنے باپ کی وہ مناجات سنی ہے۔ جب اللہ نے آپ کو دس ,, لادیں عطا کر دیں اور ایفائے عہد کے لئے آپ نے قرعہ ڈالنا شروع کیا۔

یارب انت الملك المحمود

خدایا! تو قابل تعریف بادشاہ ہے

وانت ربی الملك المعبود

خدایا تو قابل پرستش شہنشاہ ہے

من عندك المطارف والتليد

خدایا نیا پرانا جو کچھ ہے تیرا ہی عطیہ ہے[1]

جناب ابوطالبؑ نے وہ مواعظ بھی سنے ہیں جن میں ظلم و جور اور مکارم اخلاق کی تعلیم شامل تھی جن میں اس دن سے ڈرایا جاتا تھا جب ہر اچھے برے کو اس کے عمل کا بدلہ لے گا۔

انھوں نے اکثر جناب عبدالمطلب کے یہ فقرات سنے ہیں۔

"دنیا سے کوئی ظالم اس وقت تک نہیں جا سکتا جب تک اس سے انتقام نہ ہو جائے یا اس پر عقاب نہ ہو جائے۔"

جس پر کسی شخص نے اعتراض بھی کر دیا کہ ایسے لوگ مرے ہیں۔ اور ان پر کوئی عقاب نہیں ہوا ——— تو آپ نے نہایت ہی اطمینان سے جواب دیا۔

"خدا کی قسم! اس گھر کے بعد دوسرا گھر بھی ہے جہاں احسان کا بدلا اور گناہوں کی پاداش ملے گی[2]

[1] السیرۃ النبویہ ج (۱) ص ٦٦

[2] السیرۃ النبویہ ج (۲) ص ۱۲۱، سیرۃ حلبیہ ج (۱) ص ۷، العباس ص ۱۷، الغدیر ج (۷) ص ۳۵۲

یہی حضرت عبدالمطلب ہیں جو اپنے فرزند عبداللہ کے یہاں ایک ایسے مولود کا استقبال کرتے ہیں جس کے نور سے سارا عالم منور ہو جاتا ہے۔ جس کی شعاعوں سے دنیا میں روشنی پھیل جاتی ہے۔

کیف و سرور کا یہ عالم ہے کہ اُدھر بچہ عالم ہستی میں قدم رکھتا ہے ادھر دادا مالک کے پاس پہنچ جاتا ہے تاکہ ان آثار کا علم حاصل کرے جو وقت ولادت عالم ایجاد میں رونما ہوئے ہوں۔ تھوڑی دیر بعد بچے کو گود میں لے کر خانہ کعبہ کی طرف چلے تاکہ بارگاہ الٰہی میں اس کے فضل و کرم نعمت و احسان کا شکریہ ادا کریں۔ زبان پر یہ کلمات جاری تھے۔

الحمد لله الذى اعطانى	هذا الغلام الطيب الاردان
قد ساد فى المهد على الغلمان	اعيذه بالله ذى الاركان
حتى اراه بالغ البنيان	اعيذه من شر ذى شنان

من حاسد مضطرب العنان[3]

"شکر ہے ایسے معبود کا جس نے مجھے یہ طیب و طاہر بچہ عنایت کیا ہے۔ اللہ اسے بچائے یہ تو گہوارہ ہی سے آثار سعادت رکھتا ہے اللہ اسے ہر افتراق پرواز سے محفوظ رکھے اور اسے کامیاب بنائے۔ خدا اسے حاسدوں کے شر سے اپنی پناہ میں رکھے۔"

جناب عبدالمطلب نے اس بچے کی سرپرستی شروع کر دی اور اس کی حفاظت و حمایت میں ہر ممکن کوشش کرنے لگے۔ اس لئے کہ آپ کی دور رس نگاہیں اس بچہ کا مستقبل دیکھ رہی تھیں۔ آپ کو معلوم تھا کہ ایک دن شرق و غرب عالم اسی کے زیر اقتدار ہوں گے۔ سارے سر اس کی بارگاہ میں خم ہوں گے ساری پیشانیاں اس کے سامنے جھکیں گی۔ دل اس کی محبت سے سرشار ہوں گے۔ زبانیں اس کے تذکرے کریں گی۔ تعظیم و تجلیل اس کے قدم چومے گی۔

عالم یہ ہے کہ عبدالمطلب جیسا باہیبت و جلال، باعظمت و شکوہ انسان خانہ کعبہ کے اطراف میں اپنا فرش بچھاتا ہے۔ کسی شخص میں اتنی جرأت نہیں ہے کہ اس فرش پر قدم رکھ سکے۔ سب دور ہی دور سے مشاہدہ کر رہے ہیں لیکن یہ طفل یتیم نہایت ہی سکون و اطمینان کے ساتھ آتا ہے اور بیباکانہ انداز سے مجمع کو چیرتا ہوا اپنے دادا کے پاس پہنچ جاتا ہے۔ اب اس بچے کے قدم ہیں اور دادا کا وہی فرش! اب اگر لوگ ہٹانا بھی چاہتے ہیں تو آپ منع کر دیتے ہیں۔ اور فرماتے ہیں؛ ——— "اس کی ایک حیثیت ہے" اسے پہلو میں جگہ دیتے ہیں

[3] اعیان الشیعہ ج ۲ ص ۲، مروج الذہب ج ۲ ص ۱۵۱، بحار ج ۱ ص ۹۵، بحار ج (٦) ص ۹۱ (قدرے اختلاف کے ساتھ)

اور پشت پر بٹھاتے ہیں۔ چہرہ سے فرحت اور انبساط کے آثار نمایاں ہیں۔ خطوطِ رُخ مسرت کی غمازی کر رہے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس سے لگی ہوئی آس ضرور پوری ہوگی اور اس سے بندھی ہوئی اُمیدیں ضرور پوری ہوں گی۔ کبھی کبھی روکنے والے سے کہتے ہیں۔ "میرے بیٹے کو بیٹھنے دو اس لئے کہ یہ اپنے دل میں کچھ عظمت محسوس کرتا ہے۔ مجھے اُمید ہے کہ اسے وہ شرف نازہ حاصل ہوگا۔ جو کسی عرب کو نہ اس سے پہلے ملا ہے اور نہ اس کے بعد مل سکے گا۔

کبھی فرماتے ہیں :-

"میرے بچے کو میری جگہ پر آنے دو' اس کے دل میں ملک عظیم کے جذبات ہیں' عنقریب اس کی ایک عظمت و حیثیت ہوگی۔" [۱]

کبھی جناب ابوطالبؑ سے کہتے ہیں :-

"اے ابوطالبؑ! اس بچے کی بڑی شخصیت ہے اس کو بچاؤ' اس سے تمسک کرو' یہ تنہا ہے اس کو ماں کی طرح سے پرورش کرو' دیکھو کوئی ناگوار خاطر بات نہ ہونے پائے۔" [۲]

یاد رکھیئے! جناب عبدالمطلب کے یہ کلمات بے ربط نہیں تھے۔ آپ کو فضول گوئی کی عادت نہ تھی آپ بے جا گفتگو کے قائل نہ تھے۔ آپ چہرہ کے خطوط سے اندازہ کر رہے تھے کہ اس کا مستقبل ایک عظیم شخصیت اپنے ہمراہ لا رہا ہے۔

آپ کو اپنی رائے پر اعتماد اور اپنے عقیدہ پر کامل وثوق تھا۔ آپ کے لئے زندگی کا ہر پہلو اور ماحول کا ہر اندازہ ایک پیشین گوئی کی حیثیت رکھتا تھا۔ بنی مدلج جو عرب کے مشہور اور ماہر ترین قیافہ شناس تھے۔ آپ سے کہا کرتے تھے: "محمدؐ کو بچاؤ' اس لئے کہ اس کے قدم ابراہیمؑ کے قدم سے بہت زیادہ مشابہ ہیں۔"

سیف بن ذی یزن الحمیری بادشاہ یمن سے مقابلے میں کامیاب ہوتا ہے۔ حبش کی حکومت ہاتھ آتی ہے۔ سارے عرب کے وفد مبارکباد کے لئے آتے ہیں۔ سب سے آگے آگے قریش کا وفد ہے جس کے نمائندے اور امیرِ کارواں حضرت عبدالمطلبؑ ہیں۔

بادشاہ کے سامنے پہنچتے ہی آپ کا وہ خطبہ شروع ہوتا ہے جو فصاحت و بلاغت کا معجزہ ہے۔

---

[۱] السیرۃ الحلبیہ (ج) ۱۰ ص ۱۲۵' السیرۃ النبویہ ج (۱) ص ۲۲۷' السیرۃ ہشام (ج) ۱ ص ۱۶۸' بحار ج (۶) ص ۲۲۳' الکبس ص ۱۸' حاشیہ سیرت ج (۱) ص ۱۹۵'

[۲] مجالس سنیہ ج (۴) ص ۲۶ ـ

وہ خطبہ جسے سُن کر سیف جیسا بادشاہ عظمت و جلالت شخصیت و حیثیت سے مرعوب ہو کر جھک جاتا ہے۔ استقبال کرتا ہے تعظیم و تکریم بجا لاتا ہے اور معزز مہمانوں کی طرح قیام کا انتظام کرتا ہے ایک مہینے تک یہ مہمانی باقی رہتی ہے۔ ایک دن سیف جناب عبدالمطلب کو طلب کرتا ہے کہ انھیں ایک بشارت دے۔ اس کا خیال ہے کہ آپ کو اس کی خبر نہیں ہے سیف کی نظر میں خبر یہی ہے جس کے چار طرف فضیلت کے آثار ہیں عالم کی روشنی ہے۔ دنیا کی سیادت ہے اور اس میں جناب عبدالمطلب کا بھی حصہ ہے کہتا ہے :-

"جب مکّہ میں ایسا بچّہ پیدا ہو جس کی پشت پر نشان ہو تو سمجھ لینا کہ وہ امام ہے اور اس کے ذریعہ تمہارے لئے قیامت تک کی ریاست و زعامت ہے۔"

اس کے بعد بیان کو جاری رکھتے ہوئے کہتا ہے :- "اس کا نام محمدؐ ہوگا۔ اس کے ماں باپ مر جائیں گے اور اس کی تربیت دادا اور چچا کے ہاتھوں ہوگی۔"

دل بے چین ہو جاتا ہے۔ اور مزید اسرار کھولتے ہوئے کہتا ہے :-

"اس گھر کی قسم! علامات واضح ہیں۔ اور اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ تم ہی اس کے دادا ہو۔"

یہ سننا تھا کہ آپ سجدہ میں گر پڑتے ہیں۔ شکرِ خدا بجا لاتے ہیں۔ مناجات کرتے ہیں۔ اب جو سر اٹھاتے ہیں تو سینے میں خنکی' چہرے پر سُرخی' لبوں پر تبسم اور زبان پر اس نبی کی زندگی کے قصّے ہیں۔ فرماتے ہیں :-

"اس کے ماں باپ مر چکے ہیں اور اب ہم اُس چچا اور ہم اس کے کفیل ہیں۔" [۱]

یہ دلائل ایک طرف اور پیغمبر اکرمؐ کی زندگی کے کثیر معجزات و علامات ایک طرف ہر علامت ایک مستقل برہان اور ہر کرامت ایک سکون بخش دلیل اور ان تمام دلائل و براہین کا خلاصہ یہ ہے کہ یہی محمدؐ وہ ہے جس کا ذکر کتب سماویہ میں پایا جاتا ہے۔ اور یہی رسولؐ وہ ہے جس کی بشارت گزشتہ رسولوں نے دی ہے۔

ایک مرتبہ قحط کا زمانہ آیا۔ بارش کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ صحرا کی گھاس سیاہ اور جانوروں کا دودھ خشک ہو گیا۔ زندگی سخت' حیات دشوار' دنیا تاریک' عالم سیاہ' چار طرف غم و الم' شش جہت میں خوف و ہراس' چہرے پر زردی' جسم زرد و سیاہ' کوئی ایسا نہیں ہے جس کے پاس جائیں اور نہ اپنے پاکیزہ نفس اور مقدس زبان سے بارگاہ احدیث میں فریاد کرے کہ آسمان چند قطرات ہی سے کرم کر دے اور دنیا کی گئی ہوئی شادابی پلٹ آئے۔

---

[۱] سیرۃ الحلبیہ ج (۱) ص ۳۵-۳۶ سیرۃ النبویہ ج (۱) ص ۶۶' ۶۸' ۶۹' بحار ج ۶ ص ۲۹

تلے پہونچی ہے تو مرف جناب عبدالمطلب پر۔ یہی اگر چاہیں تو قریب مرگ نفوس و حیوانات اور نزدیک ہلاکت دیہاتی اموال پر رحم کھاکر اللہ کی بارگاہ میں التماس کریں دعا کریں۔ سفارش کریں کہ بارش ہو۔

لوگ جناب عبدالمطلب کے پاس آئے آپ ان کی خواہش پر چلے گود میں محمدؐ ہیں۔ چاروں طرف سے نوجوان حلقہ کیئے ہوئے، نجابت کی خوشبو پھیلی ہوئی ہے۔ شرافت کی نسیم چل رہی ہے۔ کوہ ابوقبیس پر پہونچتے ہیں رقت و رحمت سے بھرے ہوئے دل اور ایمان سے لبریز سینے سے کچھ کلمات نکلتے ہیں۔ لب ہائے مبارک کو جنبش ہوتی ہے آواز آتی ہے۔

"اللھم ھٰؤلاءِ عبیدك و بنو عبیدك وَاماؤك وبنو
امائك و قد نزل بماتری وَ تتابعت علینا ھذہ السنون
فذھبت بالظلف والخف وَ الحافر ناشفت علی الانفس
فاذھب عنا الجدب وائتنا بالحیاء والعصب ۔"

"خدایا! یہ تیرے بندے اور تیرے بندوں کی اولادیں ہیں، خدایا! یہ تیری کنیزیں اور تیری کنیزوں کی ذریت ہیں۔ انھیں قحط نے ستا رکھا ہے۔ سارے جانور ہلاک ہوگئے ہیں اور جانوروں کی باری آگئی ہے خدایا اس قحط کو دور کردے اور ہمیں ابرکرم سے شاداب کرکے ہماری زمینوں کو سرسبز کردے۔"

کیا کہنا اس ایمان بھری دعا کا۔ اسے تو خدائے رحیم ضرور ہی سنے گا۔ اور قبول بھی کرے گا۔ ابھی مجمع دامن کوہ سے آگے نہ بڑھا تھا کہ ابر گھر کر آنے لگا بارش کے ساتھ شادابی کے آثار نمایاں ہوگئے۔ بادل فیاضی پر اتر آئے آسمان سخاوت پر کمربستہ ہوگیا۔ وادیاں سیلاب کی تیاریاں کرنے لگیں۔ لبوں پر تبسم دلوں میں راحت آنکھوں میں شوخی نظر آنے لگی۔ اور اسی کے ساتھ کچھ چہروں پر غیظ و غضب کچھ دلوں سے بغض و حسد اور کچھ آنکھوں سے عداوت و کینہ کے شرارے اڑنے لگے۔

قریب تھا کہ ان شراروں کی راہیں بند ہو چکی تھیں۔ اور ان مسکراہٹوں کے دروازے کھلتے جا رہے تھے ابھی قافلہ مکہ کے قریب پہنچا تھا کہ ایک باریک اور سُریلی آواز کانوں میں آنے لگی۔ لہجہ شیریں، تاثیر دل پذیر اور ترنم کیف آور تھا۔

یہ کیا تھا؟ ابی صیفی بن ہاشم کی لڑکی کا ترنم تھا جو انتہائی کیف و سرور کے عالم میں کچھ شعر گنگنا رہی تھی: ــــــ

بشیبة الحمد اسقی اللہ بلدتنا   وقد عدمنا الحیا و اجلوذ المطر

فجا بالماء جونی لہ سیل   وان فعاشت بہ الانعام والشجر

منا من اللہ بالمیمون طائرہ   وخیر من بشرت یوما بہ مضر

مبارك الاسم یستقی الغمام بہ   ما فی الانام لہ عدل ولا خطر[1]

اللہ نے شیبۃ الحمد کے طفیل میں اس وقت سیراب کیا جب بارش کا سلسلہ منقطع ہو چکا تھا۔
بادلوں نے وہ موسلا دھار پانی برسایا کہ درختوں اور جانوروں کی زندگی بن گئی۔
یہ اللہ کا کرم اس کے صدقے میں تھا جو قبیلہ مضر کا بہترین انسان تھا۔
جس کا نام مبارک جس کی ذات بے مثل و عدل اور جس کے وسیلے سے بادل مائل بکرم ہوتے ہیں۔

پانی برسا سیل رواں ہوئی، سبزہ اگنے لگا۔ دنیا مطمئن ہوگئی۔ لیکن قیس و مضر کے شہر والے تک اس کا ایک قطرہ بھی نہ پہنچا۔ وہ اسی طرح پریشان حال رہے اور ابرکرم کا منھ تکتے رہے۔

آخر کار بزرگوں نے اجتماع کیا اور یہ طے کیا کہ انھیں عبدالمطلب کی خدمت میں چلیں جن کے پاس اہل مکہ گئے تھے۔ یہی وہ شخص ہیں جن کی دعا رد نہیں ہوتی اور یہی وہ انسان ہے جو زمین و آسمان[2] دونوں پر تسلط رکھتا ہے۔

یہ طے کرنے کے بعد قافلہ مکہ آیا۔ جناب عبدالمطلب کے پاس حاضر ہوئے آپ نے خوش آمدید کہا۔ نمائندہ نے اپنا بیان شروع کردیا کہ حالات میں تاخیر کی گنجائش نہیں ہے اور زمانہ بڑی شدت و سوزش کے ساتھ گزر رہا ہے۔ ہر لحظہ موت سر پر سوار ہے اور گرمی کی تپش بڑھتی جا رہی ہے۔ نمائندہ نے واضح الفاظ میں یوں درخواست کی کہ: ــــــ

"ہمارے یہاں قحط پڑ گیا ہے ہمیں آپ کی خبر ملی ہے۔ ہم نے آپ کے کلام کی تاثیر سنی ہے۔ آپ ہمارے واسطے بھی سفارش فرمائیں کہ آپ کو حق شفاعت ملا ہے"

---

[1] سیرۃ حلبیہ ج ۱ ص ۱۲۲، سیرۃ النبویہ ج ۱ ص ۹۴، بحار ج ۶ ص ۱۲۷-۱۲۸، شرح النہج ص ۲۵۵

[2] زمین کے تذکرہ سے ایک تو چاہ زمزم کی طرف اشارہ ہے دوسرے اس واقعہ کی طرف اشارہ ہے (تھوڑے اختلاف کے ساتھ) ــــ جب آپ قریش کے فیصلے کے لئے جا رہے تھے اور راستے میں پانی کے نہ ہونے کی وجہ سے آپ اصحاب قریب بہ ہلاکت پہنچ چکے تھے۔ قریش نے بھی پانی دینے سے انکار کردیا اور آپ کے فضل و کرم سے گھوڑے کے سُم سے چشمہ نکل آیا تھا اور سب سیراب ہوگئے تھے۔ اور تاریخ میں ان کا پانی پلانا اور لوگوں کا پانی بند کرنا ثبت ہوگیا تھا۔

اور آپ کی دعا پر بارش ہوتی ہے۔"

جناب عبدالمطلب نے یہ درخواست سنی اور وعدہ فرمالیا۔ دوسرے دن آپ حسبِ وعدہ عرفات میں پہنچے' چاروں طرف لوگوں کا ہجوم تھا اور گود میں یتیم عبداللہ محمد! جلالت کی شعاعیں نمودار عظمت کی کرنیں درخشندہ بچے کو لے کر اپنی کرسی پر بیٹھے دعا کے لئے ہاتھ بلند کردیئے خشوع بھری آواز' ایمان سے لبریز دل اور عقیدہ سے مطمئن نفس مشغولِ مناجات ہوگیا۔ خدایا! اے چمکتی بجلی گرجتی بدلی کے مالک' اے کل کے پروردگار' اے مشکلوں کو آسان کرنے والے! یہ قیس و مضر جو سرفراز تھے' خاک بسر ہوگئے ہیں۔ لاغری سے ان کی کمریں جھک گئی ہیں۔ اب تو یہ جان و مال کی فریاد لے کر آئے ہیں۔ خدایا ابرکرم بھیج کر ان کی زمین کو ہنسا دے اور ان کے نقصان کا مداوا کردے۔

ابھی دعا اسی حد تک پہنچی تھی کہ سیاہ ابر گھرنے لگے۔ بارش کے آثار دعا کی قبولیت کی سند لے کر آئے۔ بادلوں نے دور دراز شہروں کا قصد کیا۔ جناب عبدالمطلب نے قوم سے خطاب کیا۔

"اے قبیلہ قیس و مضر والو! جاؤ تم سیراب ہوگئے۔"[1]

باپ کے یہ فقرات سن کر بیٹے سے ضبط نہ ہوسکا۔ اور جناب ابوطالبؑ کی زبان پر بے ساختہ یہ اشعار جاری ہوگئے:۔ ———

ابونا شفیع الناس حین سقی ربہ
من الغیث رجاس العشیر بکور

ونحن سنین لحل قام شفیعنا
بمکة یدعوا المیاہ تغور

فلم تبرح الاقدام حتی رأوابہا
سحابات مزن حصوبہن درور

وقیس اتنا بعد ازم رشدة
وقد عضہا دہر اکب عشور

فمابرحوا حتی سقی اللہ ارضہم
بشیبة فیثا فا النبات تضیر[2]

"ہمارا باپ وہ ہے جس کی وساطت سے موسلا دھار بارش ہوتی ہے ہمارا شفیع وہ ہے

---

[1] سیرۃ حلبیہ ج ۱ ص ۳۳' سیرت نبویہ ج ۱ ص ۱۵

[2] اثبات الوصیۃ ص ۸۷

جس کی دعا اتنی زود اثر ہے کہ جب مکہ میں دعا شروع کردی تو لوگوں کے ہٹنے سے پہلے ہی ابر پانی لے کر آگئے اور طوفانی بارش کا سامان ہوگیا۔ بنی قیس شدائد و مصائب سے عاجز ہو کر ہمارے ہی پاس آئے تھے ہماری ہی دعا سے ان کی زمینوں کو سیراب کیا اور اس میں شادابی پیدا کی تھی۔"

• اسی شان سے جناب عبدالمطلب کی پاکیزہ' روشن اور ضوفشاں زندگی گزر رہی تھی' ہر لمحہ کتب سماویہ کی پیشین گوئیاں سامنے آرہی تھیں لیکن رسالت اس وقت پیشانی کا نور بنی ہوئی تھی۔ ایک وقت وہ آیا جب اس نور پر سرور کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا۔ اب کیا پوچھنا تھا تربیت کا خاص اہتمام شفقت و محبت کے نئے اصول۔

بھلا ایسا بچہ جس کا مدت سے انتظار رہا ہو' جس کی محبت تمام بچوں پر غالب آگئی ہو' اس قابل ہوسکتا ہے کہ کسی وقت بھی اسے فراموش کردیا جائے یا اس سے غفلت برتی جائے! ہرگز نہیں! یہی وجہ تھی کہ (۱۲۰) یا (۸۵) سال کی زندگی کے آخری لمحات تک اس بچے کا خیال ذہن میں رہا۔ موت کی ہتھیلیاں سامنے آگئیں۔ آنکھیں پتھرانے لگیں۔ اولاد و اقارب جمع ہوگئے لیکن اس وقت بھی ایسے شخص کی تلاش تھی جو اس بچے کی حفاظت کرسکے' اسے قریش کے شر سے بچاسکے یہ فکر کوئی معمولی فکر نہ تھی۔ اس کے پس منظر میں دائمی راحت اور ابدی قرار مضمر تھا۔

ایک مرتبہ نظر ابوطالب پر جم گئی۔ اور یہ طے کرلیا کہ یہ بارگراں اسی دوش پر رکھا جاسکے گا۔ اس لئے کہ یہ اس جہاد میں برابر کے شریک رہ چکا ہے۔ فرمانے لگے۔

"اے عبدمناف! تمہیں ایک یتیم و بیکس کے بارے میں وصی کئے جاتا ہوں"[1]

یہ کہہ کر حسبِ ذیل اشعار وردِ زبان کئے: ———

وصیتہ من کنیتہ بطالب
عبد مناف وھو ذو تجارب[2]

---

[1] اعیان الشیعہ ج ۳ ص ۷' ص ۳۹' ص ۱۲۵' عمدۃ المطالب ص ۶۔ مناقب ج ۱ ص ۳۱' بحار ج ۶ ص ۴۷ معجم القبور ج ۱ ص ۱۸۳۔

[2] ——— اعیان الشیعہ ج ۳۹ ص ۱۲۵' اس مقام پر مولف اعیان نے عبارت میں بجائے کنیتہ کے کفلتہ بیان کیا ہے جو کہ معنی کے اعتبار سے غلط ہے اصل وہی ہے جو یہاں نقل کیا گیا ہے واللہ اعلم ———

یابن الحبیب الاکرم الاقارب
یابن الذی قد غاب غیر آئب

"میں نے ابوطالب جیسے تجربہ کار آدمی کو وصی بنایا ہے اس کے بیٹے کا جو مجھے عزیز و محبوب تھا اور اب جس کے واپس آنے کی کوئی امید نہیں ہے"

اس وصیت نے حضرت ابوطالب کے دل میں اس طرح گھر کر لیا کہ بیساختہ بول اُٹھے۔

لا توصنی بلازم و واجب
انی سمعت اعجب العجائب

من کل حبر عالم و کاتب
بان بحمد اللہ قول راهب [51]

آپ مجھے لازم و واجب کام کے لئے نصیحت نہ کریں۔ میں نے تو بڑے بڑے علماء سے عجیب عجیب خبریں سنی ہیں۔ خدا کا شکر ہے کہ اس قول کی صحت ظاہر ہوگئی۔

اس کے بعد جناب عبد المطلبؑ نے پھر ابوطالبؑ سے خطاب کیا:۔

"دیکھو! اس کی حفاظت کرنا' اس نے نہ باپ کا لطف دیکھا ہے نہ ماں کی ممتا۔ یہ تمہارے جگر کے مانند ہے۔ میں نے اپنی تمام اولاد میں تمہارا انتخاب کیا ہے اس لئے کہ تم اس کے باپ کے حقیقی بھائی ہو[52]۔ یاد رکھو اگر ممکن ہو تو اس کا اتباع کرنا۔ زبان و ہاتھ اور مال سے اس کی نصرت کرنا۔ یہ عنقریب سردار بنے گا اسے وہ کچھ ملے گا۔ جو ہمارے آباو اجداد میں کسی کو نہیں ملا تھا[53]۔ اچھا تمہیں یہ سب قبول ہے؟"

ابوطالب نے عرض کی ـــ کیوں نہیں' سب قبول ہے اور خدا اس کا شاہد ہے"

عہد تمام ہوگیا۔ ذمہ داری ختم ہوگئی ـ دل مطمئن ہوگیا اور ضمیر بالیدہ ہوگیا۔ فرمانے لگے ـــ ہاں! اب موت آسان ہوگئی ہے" پھر محبت سے اپنے بچے کو گلے سے لگا لیا' بوسے دیئے۔ ایک باپ کی سی شفقت و محبت کا اظہار کیا فرمانے لگے۔ میری اولاد میں تجھ سے زیادہ باوقار' پاکیزہ اور باوجاہت کوئی نہیں ہے۔ [55]

---

[51] مناقب ج ۱ ص ۲۱ ' عباس ص ۱۹ ' اعیان الشیعہ ج ۳۹ ص ۱۲۸
[52] المجالس السنیہ ۴ ص ۲۰ ' بحار ج ۶ ص ۱۳
[53] ، ، ، ایضاً ، ،
[54] بحار ج ۶ ص ۱۶ ' اثبات الوصیۃ ص ۱۰ ' الحجۃ ص ۶ (اختلاف عبارات کے ساتھ)

شخصیت

ایسے بلند پایہ' رفیع الشان' جلیل القدر خاندان اور ایسے شفیق ماں باپ کے تعلیمات و ارشادات کے زیرِ سایہ جناب ابوطالبؑ نے زندگی کے لمحات گزارے ہیں۔ جس کا ماضی خود ہی دل میں مستقبل کی راہیں بناتا ہے۔ اور جس کی عظمت خود ہی صراط مستقیم کی دعوت دیتی ہے۔

اگر انسان کی شخصیت اور اس کی عظمت میں وراثت کو بھی دخل ہے۔ جیسا کہ علماء نفس نے بیان کیا ہے تو ابوطالبؑ نے اس وراثت سے ایک لامتناہی فائدہ حاصل کیا ہے۔ اور یہی وہ دلیل ہے جس سے کوئی واقف نفسیات انسان انکار نہیں کر سکتا۔

درحقیقت ابوطالبؑ اپنے خاندان کی وہ نورانی' بارونق و عظمت اور باہیبت و جلالت تصویر ہیں۔ جس میں عبد المطلب سے لے کر موت اعلیٰ تک کے کمالات نمایاں طور پر نظر آتے ہیں۔

اب اگر ابوطالبؑ انسانیت کی تصویر کامل اور بشریت کا مثالی نمونہ نظر آئیں تو تعجب نہیں' اس لئے کہ قدرت نے انھیں اپنے نبیؐ کی کفالت کے لئے منتخب کیا ہے۔

اب اگر ابوطالب اس قدر بلند پایہ اور جلیل القدر ہوں تو محل استعجاب نہیں ہے کہ انھیں کی نگرانی میں رسول اکرمؐ نے جوانی کے وہ لمحات گزارے ہیں جو انسانی زندگی کا سخت ترین دور شمار ہوتے ہیں۔ اور جس میں احساس' تاثر اور فعالیت کے جذبات پورے شباب پہ ہوتے ہیں۔

گویا ابوطالبؑ کی ذات عظمت و حفاظت دونوں جلالتوں کا مرکز بنی ہوئی تھی۔ عظمت نے رسول اکرمؐ کا کفیل بنایا اور حفاظت نے ناصر رسولؐ' مومن کامل قرار دیا۔ اب ابوطالبؑ کی ذات شیخ بطحا بھی ہے اور بیضۃ البلد بھی۔

کتنا حسین امتزاج تھا اس عظمت و حفاظت کا کہ اگر کوئی تاریخِ حیات میں دونوں کے درمیان حدِ فاصل قرار دینا چاہے تو ایک دشوار طلب اقدام کیا جائے گا۔ اور جب حضرت ابوطالب کو قدرت نے اس اہم کام کے لئے منتخب کیا ہے تو ان کی ذات کا اتنا باعظمت ہونا بھی ایک حتمی حیثیت رکھتا تھا۔

بھلا کیا تعجب ہو سکتا ہے اس بات میں کہ ابوطالبؑ زندگی بھر اپنے باپ کے لئے شریکِ سقایت بھی رہے اور شریکِ حفاظت بھی [1]۔ باپ کے بعد زعیمِ اوّل اور محافظ وحید دونوں درجوں پر فائز ہو جائیں۔ اور کفالت کی وہ ذمہ داریاں سنبھال لیں جن میں ان کا کوئی شریک نہ ہو سکے۔

ایسا باعظمت ماضی اور اتنا پُر بہار اور روشن حال جس شخصیت کی تشکیل کرے گا اس کا خیر اتنا عام، اس کے ثمرات اتنے عموی اور اس کی خوشبو اتنی ہی دور رس ہو گی جس سے دوست اور دشمن دونوں ہی استفادہ کر سکیں گے جس طرح ضیائے آفتاب کے لئے پہاڑوں کی چوٹیاں اور گھاٹیاں دونوں برابر ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ زکام زدہ ناک خوشبو کا احساس نہیں کرتی اور آشوب زدہ آنکھ چمکتی ہوئی شعاعوں کو نہیں دیکھ سکتی۔

حضرت ابوطالبؑ کی شخصیت میں عظمت و حفاظت کا یہ امتزاج ایک ایسی شئے ہے جس کی نظیر تاریخ میں نہیں مل سکتی۔ ظاہر ہے کہ عظمت و زعامت کا شرف تھوڑے مال سے حاصل نہیں ہوتا اس کے لئے ایک عظیم ثروت کی ضرورت ہوتی ہے۔ جو شخصیت کی بنیادیں مضبوط کرے تاکہ عظمت کی تمنا دل ہی دل میں گھٹ کر نہ رہ جائے۔

لیکن کیا کہنا ابوطالبؑ کا! یہ وہ زعیمِ اوّل اور رئیسِ اکبر ہے جس نے پورے عالم پر زعامت کا شرف حاصل کیا ہے لیکن نہ زر و جواہر کی تھیلیاں رکھیں [2] نہ رسم و زر کے معبود!

یہ اور بات ہے کہ معادن و جواہر، سیم و زر سے خالی انسان خصائص نفسانیہ اور کمالاتِ روحانیہ کی وہ دولت اپنے پہلو میں چھپائے ہوئے تھا جس میں اس کا شریک کوئی نہ تھا۔ اور جو اس کی عظمتِ شخصیت کو حتمی بنا رہی تھی اور یہی وہ عظمت ہے جو قابلِ اعتراض نہیں ہوتی اور یہی وہ منصب ہے جو ہر شخص کو نہیں مل سکتا۔

---

[1] السیرۃ الحلبیہ ج ۱ ص ۱۲۷

[2] شرح النہج ج (۱) ص ۹ ج (۲) ص ۲۶۱، السیرۃ النبویہ ج (۱) ص ۹۱، رسائل جاحظ ص ۱۰۹، معجم القبور ص ۱۸۹، اعیان الشیعہ ج ۳۹ ص ۱۲۴، الامام علی منزلۃ العدالۃ ج (۱) ص ۵۵

ابوطالبؑ نے وراثت میں اپنے باپ کی تمام خصوصیات و کمالات لے لئے۔ گھر میں کچھ نہیں لیکن جود وسخا کا یہ عالم کہ ابرِ بہار بھی شرمندہ ہو جائے۔ سخاوت و عطا کا وہ منظر جسے دیکھ کر بادل کو پسینہ آجائے ظاہر ہے کہ اس سخاوت کا لازمی نتیجہ زیر بار ہونا تھا۔ چنانچہ حضرت ابوطالبؑ نے اسے بھی برداشت کر لیا۔ لیکن یہ برداشت نہ کر سکے کہ خاندانی روایات اور پدری خصوصیات کو خیرباد کہہ دیں۔

باپ کے انتقال کے بعد حاجیوں کی سقایت کا انتظام سنبھالا۔ طریقہ یہ تھا کہ چاہِ زمزم میں خرما وکشمش ڈال دیا جاتا تھا تاکہ اس کا پانی شیریں ہو جائے اور صحرا کی تپش سے جلتے ہوئے چہرے کسی حد تک شاداب ہو سکیں۔

ایک ایسا وقت بھی آگیا جب حضرت ابوطالبؑ مفلس ہو گئے، لیکن باپ کی سیرت مجبور کر رہی تھی کہ اپنی خاندانی روایات پر عمل کیا جائے۔ چنانچہ کمرِ ہمت باندھ کر اپنے بھائی عباس کے پاس پہونچے اور دس ہزار درہم ایک سال کے لئے بطور قرض طلب کئے تاکہ دُور دراز سے آنے والے حاجی تلخ پانی نہ پئیں۔

سال گزر گیا اور ابوطالب قرض ادا کرنے کے قابل نہ ہو سکے۔ افلاس کا یہ عالم تھا کہ اب اس سال کی مزید فکر پیدا ہو گئی۔ چنانچہ دوبارہ عباس سے چودہ ہزار درہم کا مطالبہ کیا۔ اس وعدہ پر کہ آئندہ سال تک سب ادا کر دیں گے۔ عباس نے اس مرتبہ یہ شرط کر لی کہ اگر آئندہ سال تک قرض ادا نہ ہوا تو سقایت کو ان کے حوالے کر دینا پڑے گا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ [1]

ظاہر ہے کہ سقایت کے ہاتھ سے نکل جانے کا کوئی اثر حضرت ابوطالبؑ کی شخصیت پر نہ ہوگا کہ وہ نیرّ کا منبع اور آسمان و زمین کے اتصالات کا مرکز ہیں ان کے خصوصیات و کمالات اتنے ہیں کہ ان کا بیان کرنا اس مقام پر ممکن نہیں ہے۔

انھیں خصوصیات میں سے ایک بات یہ تھی کہ آپ کی ہیبت اور آپ کا وقار اتنا زیادہ تھا کہ آپ کے زیرِ سایہ رہنے والے ہر بلا سے محفوظ رہتے تھے۔ نہ زمانہ کی آندھیاں انھیں خوفزدہ کر سکتی تھیں اور نہ دنیا کے شدائد انھیں نرم بنا سکتے تھے۔

انھیں صفات میں سے ایسے علامات بھی تھے جو ہر انسان کو اس بات پر مجبور کرتے تھے کہ وہ بلاشک و شبہ اس بات پر ایمان لے آئے کہ آپ ملّتِ ابراہیمؑ کے پابند [2] اور توحید پرست ہیں۔ جاہلیت

---

[1] شرح النہج ج ۳ ص ۱۲۱، السیرۃ الحلبیہ ج ۱ ص ۱۷۱، السیرۃ النبویہ ج ۱ ص ۱۱۰، کامل ج ۲ ص ۱۲، مجالس ج ۱ ص ۳۷

[2] شرح النہج ج ۱ ص ۳۷

کی خباثتیں، اس کی گندگیاں اور اس کے شر و فتن آپ کو اپنے رنگ میں رنگ نہیں سکے۔ زمانہ کے کفر آمیز حالات آپ کو ایک آن کے لئے بھی اپنے مسلک سے نہیں ہٹا سکے۔

وہ ماحول جس میں آپ کی تربیت ہوئی ہے جس میں آپ نے شعوری زندگی کے دن گزارے ہیں جو ہر انسان کی زندگی پر اثر انداز ہوتا ہے، جو ہر بنی نوع کی فطری اور فکری راہیں معین کرتا ہے وہ بھی آپ کو متاثر نہ کر سکا صرف اس لئے کہ آپ ایک باہوش، ذہین، دُور رس، نکتہ سنج اور سلیم الفکر انسان تھے۔ آپ کو وراثت میں بشری کمالات اور انسانی نفسیات عطا ہوئے تھے۔

یہی وہ چیزیں تھیں جنھوں نے آپ کو ماحول سے متاثر نہ ہونے دیا۔ معیار سے گرنے نہ دیا بلکہ آپ میں ایک ایسی قوت پیدا کر دی جس سے خود ماحول کو بدل دیں۔ انسانیت کو علم و عقل سے آشنا کر دیں۔ کیوں نہ ہوتا اب تو کوئی رسول بھی موجود نہ تھا۔ اور اتمام حجت کے لئے ایک مصلح و مرشد کی بھی ضرورت تھی[1]

حضرت عبد المطلبؑ کے بعد ابو طالبؑ کا وجود ایک تاریخی ضرورت تھا۔ اور آپ کی یہ پاکیزہ سیرت ایک مقدمہ تھی اس رسالت کے لئے جس کے انوار پھیلنے والے اور جس کی کرنیں پھوٹنے والی تھیں۔ قدرت نے نہ چاہا کہ وہ نورِ کامل یکبارگی سامنے آجائے اور دنیا کی نظریں خیرہ ہو جائیں اس لئے ہر اول دستہ کے طور پر ایسے افراد کو بھیجا جو اپنے کمالات اور اپنی سیرت سے بشریت کو اس نور کامل سے اکتسابِ فیض کے قابل بنا دیں۔

حقیقتاً" ایک ایسے چراغ کی ضرورت تھی جس کی ایک شعاع اکمل کا پیش خیمہ" ایک ایسے منارے کی حاجت تھی جس سے روشنی حاصل کی جا سکے یعنی اتمام حجت کے لئے ایک ایسے ہی انسان کی ضرورت تھی۔ جو ابو طالبؑ تھے! کھلی ہوئی بات ہے کہ جس انسان کو رسول اکرمؐ کی بشارت اور ان کے وجود کا مقدمہ بنایا جائے گا اسے عام کمالات و خصوصیات میں فرد اکمل ہونا چاہیئے تاکہ اس کے ذریعہ بشریت آنے والے کمالات کا اندازہ کر سکے اور تحملِ انوار کی عادی بن جائے۔

یہی وجہ ہے کہ آپ خیر کا سرچشمہ، حوادث و آفات میں جائے پناہ، مصیبت زدوں کا ملجا و ماویٰ، نادار کے لئے ابرِ کرم، حیات کے لئے شادابی، بارش کے لئے ذریعہ توسل، صلہ رحم کے پابند، مشکلات کے معالج، نیک سیرت، رحم دل، بے منت کے محسن، بے طلب کے سخی، ارادہ کے قوی، فصاحت و بلاغت، منطق و گفتار کے مالک، دل کے مضبوط، قلب کے مطمئن، چہرہ کے حسین و جمیل، ہیبت کے حامل، تعظیم و احترام کے قابل تھے[2]

---

[1] العباس ص ۱۹-۱۹، بحار ج ۱۔ ص ۳۰۲-۳۰۳، (۷۷۵)، اکمال صدوق ص ۱۰۳، معجم القبور ج (۱) ص ۱۹۰-۲۰۰، الغدیر (علامہ طبرسی نے آپ کے حجت ہونے پر اجماع شیعہ نقل کیا ہے)

[2] اثبات الوصیۃ ص ۸۸، ''آپ کے یہ اوصاف تاریخ میں بکثرت پائے جاتے ہیں۔

تشریعِ احکام میں آپ کی معرفت کامل اور آپ کا علم بڑا عمیق تھا۔ یہی وجہ ہے کہ آپ نے شراب خوری اور دیگر مہلکات[1] کو اپنے اوپر حرام کر لیا۔ جاہلیت کی کثافتوں، کفر و شرک اور جہالت کے مخالف تھے، کمالات نفسیہ میں ایک رفیع الشان منزل، بلند پایہ افق، طویل و عریض دنیا پاک و پاکیزہ وادی کے مالک تھے۔

عمرو بن علقمہ کے قتل کے موقع پر اس قسامہ کی بنیاد آپ ہی نے ڈالی تھی جو بعد میں سُنّتِ نبوی میں داخل ہو گیا[2]

حضرت ابو طالبؑ کی زندگی کی ایک کرامت جسے آپ کے معاصرین نے محسوس کیا ہے یہ تھی کہ جب ہوازن و بنی کنانہ کے درمیان حرب فجار میں آپ شریک ہو جاتے تھے تو ہوازن جیت جاتے تھے ورنہ ان کا ستارہ گردش میں رہتا تھا۔

چنانچہ ایک مرتبہ سب نے مل کر درخواست کی کہ آپ ہمیشہ ہمارے ساتھ رہا کریں اور آپ کی درخواست منظور بھی فرمالی[3]

کیوں نہ ہوتا؟ آسمانی برکات کا سرچشمہ، زمین کا ملجا و ماویٰ، نسل خلیلؑ کا بقیہ، خاندانِ ذبیحؑ کے وارث آپ ہی تھے، دعا کر دیتے تو آسمان برس پڑتا۔ طلب کرتے تو زمین سبزہ اگل دیتی، اشارہ کر دیتے تو بارش بے تحاشا گر پڑتی!

ابن عساکر نے جلہمہ بن عرفطہ کی زبانی نقل کیا ہے[4] کہ میں مکہ میں آیا تو کیا دیکھا کہ لوگ قحط کی شدت سے سخت پریشان ہیں کوئی کہتا ہے کہ لات و عزیٰ سے مدد مانگو کوئی کہتا ہے کہ منات کی خدمت میں عرض کرو، ایک مرتبہ ایک بزرگ باوقار جن کے چہرہ سے فکر و تردد کے علامات نمایاں تھے، اٹھے اور کہنے لگے۔ یہ کیا بے جا خیالات ہیں؟ کدھر بھٹک رہے ہو؟ ابھی تو وارثِ خلیل و ذبیح باقی ہے لوگوں کے لئے یہ وراثت کوئی نئی بات نہ تھی۔ اور انھیں اس کا مکمل علم تھا اس لئے کہنے لگے کہ کیا آپ کی مراد ابو طالبؑ ہیں۔ انھوں نے کہا ہاں! سب اُٹھے، میں بھی اٹھ کر ساتھ چلا۔ دروازہ پر پہنچے، زنجیرِ در کھٹکھٹائی، ایک باوقار بزرگ چادر اوڑھے باہر آئے۔ لوگوں نے عرض کی

---

[1] السیرۃ النبویہ ج ۱ ص ۹۱، الحلبیہ ج ۱ ص ۱۳۴، ابو طالب ص ۲۳، ہاشم و امیہ ص ۱۵۶، معجم القبور ج ۱ ص ۱۹۹

[2] شرح النہج ج ۳ ص ۳۱۲، صحیح بخاری ج ۵، ص ۱۹۶، قسامہ کا مطلب یہ ہے کہ مقتول کے وارث حاکم کے پاس جمع ہوں اور کسی آدمی کو قاتل معین کریں اس کے علامات بیان کریں اور اس کے بعد پچاس قسمیں کھائیں، مزید تفصیل کتب فقہیہ میں۔

[3] شرح النہج ج ۲ ص ۹۳، السیرۃ النبویہ ج ۱، ص ۹۵، الحلبیہ ج (۱) ص ۱۵۲

[4] النبویہ ج (۱) ص ۸، الحلبیہ ج (۱) ص ۱۳۵،

ائے ابوطالب! وادیوں میں قحط ہے خشک سالی کا دور دورہ ہے ذرا چلئے اور بارش کا انتظام کردو۔

آپ نکلے، ایک بچے کو ساتھ لئے ہوئے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا آفتاب ابھی بدلیوں سے نکلا ہے اس کے ساتھ کچھ اور بچے بھی تھے۔ خانہ کعبہ کے قریب پہنچے بچے کی پشت کو دیوار کعبہ سے ملایا۔ اس نے آسمان کی طرف اشارہ کیا۔ اشارہ پانا تھا کہ ابر گھرنے لگے پانی برسنے لگا۔ وادیاں چھلکنے لگیں۔ سبزہ عام ہوگیا شادابی پھیل گئی[1]

(یہ واقعہ ہم نے سیرت حلبیہ و نبویہ سے بلا کسی حاشیے کے نقل کردیا ہے ان دونوں حضرات کا خیال ہے کہ جناب ابوطالب کا ایک قصیدہ جس میں بارش کا ذکر ہے اسی واقعہ کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ (و ابیض یستسقی الغمام بوجھہ)۔

یہی وہ صفات و کمالات اور آثار و خصوصیات تھے جن کی بناء پر حضرت ابوطالبؑ کو یہ مرتبہ حاصل تھا کہ ہر دل میں ان کی محبت تھی، ہر قلب میں ان کی عظمت تھی اور ہر نظر میں ایسی ریاست جس میں اس وقت تک شرکت کی کوئی گنجائش نہ تھی جب تک آپ کے قدم اس زمین پر رہے اور آپ کے دل کی دھڑکن باقی رہی۔

آپ بھی جناب عبدالمطلب کی طرح مسند پر بیٹھتے تھے اور جب رسول اکرم آکر بیٹھ جاتے تو فرماتے تھے

"یہ میرا بھتیجا ایک بڑے شرف کا احساس لے کر آتا ہے"[2]

---

[1] الغدیر ج ۷ ص۳۴۶، شرح قسطلانی ج ۲ ص۲۲۷، المواہب اللدنیہ ج ۱ ص۴۸، خصائص کبریٰ ج ۱ ص۱۲۴/۸۶، الطالب ص۱۳، الحجۃ ص۹۱، بحار ج ۶ ص۳۸۹، ابوطالب ص۴۵، صوت العدالۃ ص۳۲، ج ۱ ص۵۵

[2] النبویہ ج ۱ ص۸۰، الحلبیہ ج ۱ ص۱۳۸، بحار ج ۶ ص۱۲۹، اعیان الشیعہ ج ۲ ص۱۱

دَلائِل

"حضرت ابوطالبؑ کے اشعار اس بات کی واضح دلیل ہیں کہ آپ کو رسول اکرمؐ کی رسالت کا علم بحیرا کی پیشین گوئی اور اپنے ذاتی مشاہدات کی بناء پر بعثت سے پہلے ہی ہوچکا تھا"

علامہ عبدالواحد السفاقسی

(السیرۃ النبویہ ج ۱ ص۹۹)

دلائل

"میرے پدر بزرگوار تمام کتابوں کی تلاوت کیا کرتے تھے۔ انھوں نے فرمایا ہے کہ میری نسل میں ایک نبی مزور ہوگا۔ کاش میں اس وقت تک زندہ رہتا تو اس پر ایمان لے آتا۔ غیراب میری اولاد میں جو بھی رہ جائے اس کا فرض یہی ہے" ؎۱

——— ابوطالب

ایسا راسخ العقیدہ اور کامل الایمان جس کا قول یہ ہو کیا وہ بھی اپنے ایمان کے لئے کسی دلیل و برہان کا محتاج ہے ——— ؟

اس کے ایمان پر تو اتنے دلائل ہیں جو حد احصاء سے باہر اور شمار و اعداد سے مافوق ہیں۔ ان میں سے ہر دلیل رافع شک اور ہر برہان مثبتِ مطلب ہے۔

حضرت ابوطالبؑ کے ایمان کی ہر دلیل انسان کو دعوتِ ایمان و عقیدہ اور پیغام ثبات و استقلال دے رہی ہے آپ کو بخوبی علم تھا کہ آپ کا بھتیجا وہی رسول منتظر ہے جس کا ذکر بابا نے کتب سماویہ میں پڑھا تھا اور جس کی بشارت تمام رسالتوں نے دی ہے پھر آپ کے سامنے ایسے واضح علامات و کرامات بھی تھے جن کو دیکھ کر ایک دشمن بھی بغیر اعتراف کئے نہیں رہ سکتا۔

آپ نے بہت سے دلائل تو باپ کی زندگی میں ہی دیکھ لئے تھے جن کی طرف حضرت عبدالمطلب اشارہ کیا کرتے تھے اور پھر اب دلیلوں کی کیا کمی تھی جب کہ نبی کریمؐ آپ ہی کے زیرِ سایہ پروان چڑھ رہے تھے اب تو ہر ابھرتا ہوا سورج اور ہر پھیلتی ہوئی تاریکی شب آپ کے لئے ایک علامتِ نبوت تھی۔

اب آپ اپنے بھتیجے میں ان کمالات و خصوصیات کا مشاہدہ کر رہے تھے جو ایک عام انسان میں نہیں ہو سکتے۔ انسان دنیا میں آتا ہے اور زندگی کے دن گزار کر جاں بحق ہو جاتا ہے اس کا ذکر اس طرح مٹ جاتا ہے

جیسے اس نے کبھی اس زمین پر قدم رکھا ہی نہ ہو یا کبھی اس راہ سے گزرا ہی نہ ہو۔

لیکن یہ فرزند ایسے آثار رکھتا ہے جو انسانی تصویر کی مثالِ اکبر اور انسانی تخلیق کی تصویر اکمل ہے۔ یہ وہ مطابق اصل صورت ہے جس کی بلندی تک طائرِ فکر پرواز نہیں کر سکتا اور جس سے کمالات و فضائل کے چشمے جاری ہوتے ہیں۔ انھیں بے شمار اور لاتعداد براہین میں ایسے واضح دلائل بھی ہیں جنھیں ایک مادی انسان بھی محسوس کر سکتا ہے۔ خواہ اس کی عقل کتنی ہی ناقص اور اس کا ایمان کتنا ہی ضعیف کیوں نہ ہو! چہ جائیکہ ابوطالبؑ جیسا کامل العقل، راجح الایمان، نافذ البصیرۃ اور عمیق الفکر انسان! ہم اس مقام پر صرف چند دلیلوں کو بطور نمونہ پیش کر رہے ہیں تاکہ انھیں سے باقی کا اندازہ بھی کر لیا جائے۔

چشمہ جاری ہونا

رسول اکرمؐ کے قبل بعثت کے کرامات میں ایک یہ کرامت ہے کہ آپ جناب ابوطالب کے ساتھ مقام ذوالمجاز (عرفات سے ایک فرسخ دور زمانۂ جاہلیت کا بازار رہا ہے) میں تھے اتفاقاً جناب ابوطالب کو شدید پیاس محسوس ہوئی۔ پانی مطلق نہ تھا۔ آپ نے اپنے بھتیجے سے پیاس کی شدت کی شکایت کی۔ حضرتؐ نے زمین پر ٹھوکر ماری اور اس سے ایک چشمہ جاری ہو گیا جیسا جناب ابوطالبؑ نے کبھی نہ دیکھا تھا۔ آپ سیراب ہوئے اور اس کے بعد حضورؐ کی دوسری ٹھوکر سے چشمہ بند ہو گیا ؎۱

کاہن کی زبانی

لہب کا ایک شخص کاہن تھا۔ جب وہ مکہ میں آیا تو تمام لوگ اپنے بچوں کو لے کر اس کے پاس گئے تاکہ وہ ان کے مستقبل کی خبریں بتائے۔ انھیں لوگوں میں سے ایک حضرت ابوطالبؑ بھی تھے جو اپنے بھتیجے رسول اکرمؐ کو لے کر گئے تھے۔ جب کاہن کی نظر آپ پر پڑی تو سب کو چھوڑ کر آپ ہی کی طرف دیکھنے لگا اور بولا اس بچے کو سامنے لاؤ۔

جناب ابوطالب نے اس کی نظروں سے تاڑ لیا کہ اس کی نگاہ بڑی دور رس ہے چنانچہ آپ نے نظرِ بد سے بچانے کے لئے حضرتؐ کو چھپا دیا، لیکن کاہن اسی طرح مضطرب رہا ایک مرتبہ چیخ اٹھا، ارے اس بچے کو لاؤ۔ خدا کی قسم مستقبل میں یہ بڑا باعظمت و باحیثیت ہوگا۔

ظاہر ہے کہ یہ عظمت و حیثیت کے الفاظ جناب ابوطالب کے لئے نئے نہ تھے۔ آپ کو ابتدا ہی سے معلوم تھا کہ اس بچے کی ایک حیثیت ہوگی اور یہ بھی معلوم تھا کہ اس حیثیت کا کیا مطلب ہے۔

؎۱ النبویہ جلد ۱ ص ۸۹، الحلبیہ جلد ۱ ص ۱۳۹، تذکرۃ الخواص ص ۹، العباس ص ۲۰، بحار جلد ۶ ص ۱۲۹

تو بڑا بابرکت ہے : جناب عبدالمطلب کی وفات ہوئی اور حضرت ابوطالبؑ نے رسولِ اکرمؐ کی کفالت شروع کی تو برابر اس کرامت کا مشاہدہ کر رہے تھے کہ جب بھی آنحضرتؐ دسترخوان پر بیٹھ جاتے تھے تو کھانا کافی ہو جاتا تھا جسے حضرت ابوطالبؑ اپنے بچوں میں تقسیم کر دیا کرتے تھے۔

آپ کا دستور تھا کہ کھانے کے وقت اس وقت تک بچوں کو روکے رکھتے تھے جب تک آنحضرتؐ آنہ جائیں، جب کوئی بچہ دودھ پینا چاہتا تھا تو پہلے پیالہ حضرتؐ کے سامنے پیش کیا جاتا تھا اور جب آپؐ اس میں سے تھوڑا پی لیتے تھے تو باقی بچوں کو دے دیا جاتا تھا اور حضرت ابوطالبؑ فرماتے تھے بیٹا! تو بڑا بابرکت ہے۔[1]

سفرِ شام : رسولِ اکرمؐ پر حضرت ابوطالبؑ کی عنایتیں اور شفقتیں اس حد تک بڑھ گئی تھیں کہ اب دونوں روحیں ایک نظر آنے لگی تھیں۔ ایسے موقع پر یہ کیونکر ممکن تھا کہ ابوطالبؑ ایک دور دراز سفر کا ارادہ کریں اور نبی کریمؐ کا دل بیقرار نہ ہو۔ چنانچہ آپ کے دل میں اس وقت کے تصورات کروٹیں لینے لگے جب یہ حصن حصین اور قلعہ مستحکم سامنے نہ ہوگا، جب تیز و تند ہوائیں چلیں گی اور کوئی محافظ نہ ہوگا، جب دھوپ کی شدت، یتیمی کے احساسات ہوں گے اور کوئی بچانے والا نہ ہوگا۔

آپ دیکھ رہے تھے کہ چچا اپنی سواری کی طرف بڑھ رہے ہیں اور آنکھوں سے بے ساختہ آنسو جاری ہوئے جا رہے تھے۔ شفیق بزرگ نے یتیم کے احساس پر ڈھلکے ہوئے آنسوؤں کو دیکھا اور دل تڑپ گیا۔ کان میں بھتیجے کی آواز آئی۔

"چچا! اب تو ماں باپ بھی نہیں ہیں یہ آپ کس پر چھوڑے جا رہے ہیں؟" تڑپ کر بولے —

"خدا کی قسم اسے ساتھ لے جاؤں گا اب نہ یہ مجھ سے جدا ہوگا اور نہ میں اس سے!"

یہ کہہ کر بھتیجے کو اپنی سواری پر بٹھایا، قافلہ صحرا میں خطوط معین کرتا ہوا چلا۔ ہواؤں نے خبر سفر چار طرف

---

[1] السیرۃ النبویۃ ج ۱ ص۱۴۰، الحلبیہ جلد ۱، ص۱۳۴۰۳۶، بحوار ص۱۲۹-۱۲۲، فاطمہ بنت محمد از ہر ابوالمعرفت ص۱۸، محمد النبی العربی ص۴۲، الجواہر ص۴۲، علی ہامش السیرۃ جلد ۱ ص۱۹۱ جلد ۲ ص۱۵۱۔ جناب ابوطالب نے حضرتؐ کے اس معجزہ کو مکرر مشاہدہ کیا ہے چنانچہ آپ اس وقت بھی موجود تھے جب دعوت ذوالعشیرہ میں آنحضرتؐ نے ایک ران گوسفند اور ایک کاسہ شیر سے تقریباً ۴۰ آدمیوں کو سیر کر دیا تھا (ظاہر ہے کہ یہ واقعہ اپنی شہرت کے لحاظ سے کسی حوالہ کا محتاج نہیں ہے اس کا ہر مورخ اور ہر تاریخ شاہد ہے) —

پھیلائی۔ یہاں تک کہ مقامِ بصریٰ تک پہونچے۔ حضرت ابوطالبؑ نے چاہا کہ کچھ دیر آرام کر لیں۔ اتفاقاً اسی مقام پر ایک دیر تھا۔ اس میں بحیرا نامی ایک راہب رہا کرتا تھا۔ جو علومِ مسیحیت کا مرکز و مصدر تھا۔ آج اس راہب نے قافلے کے نئے انداز دیکھے۔ ہمیشہ قافلے گزر جاتے تھے۔ اور یہ توجہ بھی نہ کرتا تھا لیکن آج دیر سے گردن نکال کر قافلے کا جائزہ لیا۔

کیا دیکھتا ہے کہ اس قافلہ میں ایک انسان ایسا بھی ہے جس کے سر پہ ابر سایہ فگن ہے جس درخت کے نیچے بیٹھ جاتا ہے وہ درخت اپنے پتوں کو جوڑ کر سایہ کر لیتا ہے۔ ایک نیا انداز اور عجیب طور ہے وہ حیرت کے عالم میں گم ہو گیا۔ ایک مرتبہ یاد آیا کہ کتاب مقدس کے کلمات میں ان علامات کا ذکر موجود ہے یہ سوچتے ہی دیر سے نکلا، کھانا تیار کرنے کا حکم دیا اور قافلہ کے قریب پہنچ گیا۔

"اے گروہِ قریش! میں نے تمہارے لئے کھانا تیار کرایا ہے۔ چاہتا ہوں کہ تم سب چھوٹے بڑے غلام و آزاد آ کر اسے تناول کرو۔"

ایک شخص حیرت زدہ ہو کر بولا۔ "اے بحیرا! خدا کی قسم آج عجیب بات دیکھ رہا ہوں، کل تک تو ایسا نہ تھا۔ یہ آج کا اہتمام کیسا ہے؟"

بحیرا نے اس کا شافی جواب دیا تو سب نے دعوت قبول کر لی۔ سب جمع ہو گئے صرف رسولِ اکرمؐ رہ گئے جن کو سامان کی حفاظت کے خیال سے درخت کے نیچے چھوڑ دیا گیا تھا۔

بحیرا نے قافلہ کے افراد پر ایک نگاہ ڈالی، یہ دیکھا کہ یہ مجمع میری پیاس کو نہیں بجھا سکتا۔ اس جماعت سے میری سیری نہیں ہو سکتی۔ یہ دیکھتے ہی توم پکار اٹھی، بحیرا! اب کوئی باقی نہیں ہے صرف ایک کم سن بچہ ہے جسے سامان کی حفاظت پر چھوڑ دیا گیا ہے۔" راہب نے اسے بھی طلب کر لیا۔ بچہ قریب آ گیا۔ راہب نے گہری نظر سے اس کے چہرے کے خطوط کا مطالعہ شروع کر دیا۔ اور کتابِ مقدس کے علامات کا جائزہ لینے لگا۔

کھانے سے فراغت کے بعد لوگ چلے۔ بحیرا نے بچے سے کچھ سوالات کا ارادہ کیا اور حضرت ابوطالبؑ سے کہنے لگا۔

"تمہارا اس بچے سے کیا رشتہ ہے؟"

فرمایا۔ "یہ میرا بیٹا ہے"

---

[1] سیرت نبویہ جلد ۱ ص۹۰ سیرۃ الحلبیہ جلد ۱ ص۱۲۰ (قدرے اضافہ کے ساتھ)

کہا۔ "ہرگز نہیں! اس کے باپ کو زندہ نہ ہونا چاہیئے۔"

فرمایا۔ "ہاں بھتیجا ہے۔"

کہا۔ "پھر باپ کہاں ہے۔؟"

فرمایا۔ "اسی وقت انتقال ہوگیا تھا جب یہ بطن مادر میں تھا۔"

بولا۔ "سچ ہے۔ اِسے فوراً واپس لے جاؤ اور یہودیوں کے شر سے بچاؤ۔ خدا کی قسم اگر وہ اِسے پہچان لیں گے تو اذیت دیں گے۔ یہ بچہّ ایک عظیم انسان بننے والا ہے۔" [1]

رسول اکرمؐ مکہّ پلٹ آئے۔ اب وہ پہلی سی زندگی نہیں ہے۔ نیا عالم ہے، جدید دنیا ہے۔ جو نظروں میں گھوم رہی ہے۔ اور حضرت ابوطالبؑ کا یہ عالم ہے کہ قدم قدم پر حفاظت کے انتظامات کر رہے ہیں۔ ہر آن اس خبیث فرقۂ یہود سے خطرہ محسوس کر رہے ہیں جو اس شادابی کا شدید دشمن ہے اور اس غنچہ کو کھلنے سے پہلے ہی پژمردگی سے ہمکنار کر دینا چاہتا ہے۔

ظاہر ہے کہ یہ تمام خیالات شیخ بطحا کے ذہن سے کسی طرح بھی نہ نکل سکتے تھے لیکن اس کے باوجود آپ نے چاہا کہ اپنے ان تصورات کو زمانے کی پیشانی پر کندہ کر دیا جائے ــــ تاکہ آنے والی نسلیں بھی پڑھ لیں اور یہ سوچتے ہی اشعار پڑھنا شروع کر دیئے [2]

ان ابن اٰمنة النبی محمداً ــــ عندی یفوق منازل الاولاد

لما تعلق بالزمام رحمتہٗ ــــ والعیس قد قلصن بالازواد

فارفضّ من عینیّ دمعٌ زارف ــــ مثل الجمان مفرق الافراد

راعیت فیه قرابةً موصولةً ــــ وحفظت فیه وصیة الاجداد

وامرته بالسیر بین عمومةٍ ــــ بیض الوجوه مصالت انجاد

ساروا لابعد طیة معلومةٍ ــــ فلقد تباعد طیة المرتاد

---

[1] السیرۃ الہشامیہ ص۱۹۱-۱۹۲ ۔ التنویر ص۹۰-۹۲، الحلبیہ ج (۱) ص۱۳۹-۱۴۲، طبری ۲ ص۲۲-۲۴، کامل ج ۲ ص۲۳-۲۴، قصص العرب ج ص۹۹-۱۰۰ بحار ج ۶ ص۵۹-۶۱-۶۲-۱۲۹-۱۳۰، ابوطالب ص۳۱، علی ہامش السیرۃ ج ۲ ص۲۷-۳۰ (اس مقام پر روایات میں اچھا خاصا اختلاف ہے۔ بحار میں یہ واقعہ چند مختلف طریقوں سے نقل ہوا ہے۔ لیکن بہرحال اصل قصہ صحیح ہے بزرگوں کا کام تھا نقل کرنا اور ہمارا کام ہے تحقیق و تفتیش) ۔

حتی اذا اما القوم بصری عاینوا ــــ لاقوا علی شرک من المرصاد

حبراً فاخبرهم حدیثاً صادقاً ــــ عنه وردّ معاشر الحسّاد

قوم یهود قد راوا ما قد رای ــــ ظل الغمام وعن ذی الاکباد

ثاروا لقتل محمد فنهاهم ــــ عنه وجاهد احسن التجهاد

فثنی زبیراً من بحیرا فانثنی ــــ فی القوم بعد تجاول وبعاد

ونهی دریسا فانتهی عن قوله

حبرٌ یوافق امره برشاد [1]

"آمنہ کا لال محمدؐ نبی میرے نزدیک اولاد سے زیادہ عزیز اور بہتر ہے۔ جب اس نے زمام تھام لی تو باوجود تمام اہتمام کے میرے دل میں رحم پیدا ہوگیا۔

آنکھوں سے آنسو اس طرح جاری ہوگئے جیسے موتی گرتے ہیں۔

میں نے اس کے بارے میں قرابت کا بھی خیال کیا اور اجداد کی وصیت کا بھی ــ

اُسے ایسے قافلے کے ساتھ لے چلا جس میں سب سُرخرو اور فریاد رس بہادر تھے

جن کا قصد طولانی تھا ـ اور صاحبانِ عزم کا یہی حال ہوتا ہے

یہاں تک کہ جب مقام بصریٰ میں پہنچے تو ایک عالم سے ملاقات کی۔

جس نے سچی خبر سنائی اور حاسدین کی روک تھام کی۔

وہ قوم یہود جن کے جگر ابر کا سایہ کرنا دیکھ کر غصہ سے آگ بگولہ بن گئے تھے۔

انھوں نے محمدؐ کے قتل کا ارادہ کر لیا تھا۔ لیکن اس راہب نے ان کو روک دیا اور یہ بڑا جہاد تھا۔

زبیر و دریس دونوں کو اس بحیرا نے پلٹا دیا۔

جس کا امر مطابق رشد و عمل ہوتا ہے ـ

اس کے بعد یہ اشعار زبان پر جاری ہوئے ــــــــــــ

الم ترنی من بعد هم هممته ــــ لفرقة حر الوالدین کرام

---

[1] الغدیر ج ۷ ص۳۴۴، الحجۃ ص۷۶، اعیان الشیعہ ج ۳۹ ص۱۲۷-۱۲۸، معجم القبور ج ۱ ص۱۸۵ تھوڑے تھوڑے سے اختلاف کے ساتھ۔

باحمد لما ان شددت مطیتی — برحلی وقد ودعتهٔ لسلام

بکی حزناً والعیس قد فصلت بنا — واخذت بالکفین فضل زمام

ذکرت اباه ثم د قرقت عبرة

تجود من العینین ذات سجام

"کیا تم نے نہیں دیکھا کہ میں نے ایک آزاد منش محترم انسان یعنی محمدؐ کے بارے میں یہ طے کر لیا تھا کہ اسے چھوڑ جاؤں بلکہ اسے وداع بھی کر دیا تھا لیکن جب اس نے گریہ شروع کر دیا اور راستہ روک لیا تو میں نے بھی اس کے باپ کو یاد کر کے رونا شروع کر دیا۔"

اس کے بعد دیر کے راہب کے واقعے کو نظم فرماتے ہیں۔ اور اس قضیے کو بھی نقل کرتے ہیں جب راہب نے یہودیوں کے علماء کو رد کر دیا تھا۔

فجاؤا وقد هموا بقتل محمدٍ[1] — فردهم عنه بحسن خصام

بتاویله التوراة حتی تفرقوا — وقال له رستم اشد مرام

ابتغون قتلاً للنبی محمد — خصصتم علی شؤم بطول اثام

وان الذی نختاره منه مانع — سیکفیه منکم کید کل طغام

فذالك من اعلامه وبیانه

ولیس نهار واضح کظلام

"یہ یہودی قتل محمدؐ کا ارادہ کر کے آئے تھے لیکن بحیرہ نے بڑے انداز سے رد کر دیا انھیں توریت کی تاویل بتائی یہاں تک کہ انھیں یقین ہو گیا اور کہا کہ تمہارا ارادہ بہت برا تھا کیا تم محمدؐ کو قتل کر کے ہمیشہ کے لئے منحوس بننا چاہتے ہو اس کے پاس ایک ایسا مانع موجود ہے جو اسے تمہارے مکر سے بچا لے گا یہی اس کے علامات و نشانات ہیں اور ظاہر ہے کہ واضح و روشن دن کبھی رات کے مثل نہیں ہوتا ہے۔

اس سے زیادہ اس واقعے میں تفصیلات کی ضرورت نہیں ہے۔

سچ بتایئے کیا ان تمام مناظر و مظاہر کرامات و علامات کے بعد بھی یہ شک ہو سکتا ہے

---

[1] الغدیر ج ۷ ص ۳۴۵، الحجۃ ص ۷۷، اعیان الشیعہ ج ۳۹ ص ۱۲۸، معجم القبور ج ۱ ص ۱۸۵ (قدرے اختلاف کے ساتھ)

کہ جناب ابوطالبؑ ان امور کی طرف متوجہ نہ رہے ہوں گے؟ اور انھوں نے ان علامتوں کو عمیق نظروں سے نہ دیکھا ہو گا۔ جب کہ ان میں سے ہر علامت ایک انوکھی صورت رکھتی تھی اور ہر کرامت پورے معاشرے سے ممتاز و جداگانہ حیثیت کی مالک تھی!

کیا یہ بات قابلِ التفات نہ تھی کہ کاہنِ مکہ کے سامنے سے تمام بچے گزر گئے اور اس نے دو دو لفظوں میں ٹال دیا۔ لیکن رسولِ عربیؐ کو اہتمام و اصرار کے ساتھ واپس بلایا اور جب اس کی آواز صدا بصحرا ہونے لگی تو اسی آواز کے ساتھ ایک جملہ کا اور اضافہ کر دیا تاکہ آنے والا مستقبل اس کی شرح کرے اور تاریخ اسے اپنے دامن میں نمایاں جگہ دے۔ وہ کون سا جملہ تھا — "خدا کی قسم اس کی ایک عظمت و حیثیت ہو گی"۔

کیا یہ بات جاذبِ نظر نہ تھی کہ وہ بحیرا جس نے کسی قافلہ کی طرف نظر اٹھا کر نہ دیکھا ہو وہ اتنے اہتمام سے پورے قافلے کی دعوت کرے اور پھر ایسی گفتگو کرے جو نبوت پر برہانِ قاطع اور رسالت پر دلیل واضح ہو۔

یہ محمدؐ کو اپنا بیٹا کہیں اور وہ نہایت ہی باوقار اور متین لہجہ میں جواب دے کہ تم باپ نہیں ہو سکتے، اس کے باپ کو زندہ نہ ہونا چاہیئے۔ پھر یہودیوں کے خطرہ کا اظہار ان لفظوں میں کرے کہ اس بچے کی آئندہ ایک خاص حیثیت ہو گی۔

حقیقت یہ ہے کہ یہی وہ دلائل و براہین ہیں جن میں نہ شک کی گنجائش ہے اور نہ شبہ کا گزر۔

ان تمام باتوں کے ساتھ وہ کلمات بھی قابلِ غور ہیں جو اپنے پدر بزرگوار سے سنا کرتے تھے جن میں اس بچے کی برکت کا مسلسل اعلان تھا۔ جس برکت کا یہ عالم تھا کہ جس ظرف پر ہاتھ لگا دے اس سے ایک جماعت سیر ہو جائے جس زمین پر ٹھوکر مار دے ایک صاف و شفاف چشمہ ابل پڑے، جس طرف چل پڑے ابر مشایعت کے ساتھ چلے، جس جگہ بیٹھ جائے درخت کے پتے چتر شاہی کا کام کریں!

اگر یہ برکت نہیں ہے تو پھر برکت کیا چیز ہے؟

اس کے علاوہ اس بچے میں کچھ نفسانی صفات و کمالات بھی ہیں، کلام میں صداقت، افعال میں رفعت، اخلاق میں بلندی، آثار میں جمال و جلال، گفتگو میں حلاوت، زبان میں فصاحت جیسے اوصاف و خصائل مجمع لگائے ہوئے ہیں اور وہ بھی اس بچے میں جو ابھی عمر کی دوسری دہائی کی منزلوں سے گزر رہا ہے جب کہ ان اوصاف کا اجتماع پورے شہر بلکہ پورے عالم عربیت کے کسی ایک فرد میں نظر نہیں آتا تھا

یہ بچہ رہتا تو تھا اسی پست ماحول اور انحطاط پذیر معاشرہ میں لیکن نہ ان کے عادات سے متاثر تھا اور نہ ان کی خصلتوں میں حصہ لیتا تھا۔

پھر یہ کمالات و خصائص وہ تھے جن کا مشاہدہ صرف حضرت ابوطالبؑ سے مخصوص نہ تھا بلکہ انھیں پورا مکّہ دیکھ رہا تھا۔ اسی لئے سب صادق و امین کہتے تھے، حکم بناکر فیصلے کرتے تھے۔ باتوں پر اعتماد کرتے تھے اور اوامر و احکام کی اطاعت کرتے تھے۔

••

تزویج

ابوطالب جیسے قلیل المال اور کثیر العیال شخص پر ایک وقت ایسا بھی آگیا جب اس بات پر مجبور ہو گئے کہ اپنے بھتیجے کو کسی عمل پر معین کریں تاکہ وہ اس سے کچھ کسب کر سکے اور ضروریات زندگی پوری کئے جا سکیں۔ پھر آپ کے ذہن میں یہ بھی تھا کہ ایسے روشن مستقبل والے انسان کو دوسرے پر بار بار معاشرہ سے پوشیدہ نہیں رہنا چاہیئے۔

چنانچہ آپ نے دیکھا کہ سب سے بہتر کاروبار تجارت ہے اس لئے کہ یہ بچہ اپنے صفات و کمالات کی وجہ سے اس درجہ پر فائز ہے کہ اگر یہ تجارت کرنے لگا تو سارا مکّہ اسی کو اپنا عامل بنانے کی فکر کرے گا۔ اور اس طرح آمدنی میں اضافہ ہو جائے گا۔

اِدھر یہ گفتگو ہوئی اور اُدھر حضرت خدیجہ کو یہ خبر لگ گئی۔ عرصے سے دل میں تمنا تھی کہ ایسے ہی صادق و امین کو عامل بنایا جائے۔ آج یہ مُراد برآئی اور فوراً آدمی بھیج دیا۔ معاملہ طے ہو گیا۔ حضرتؐ گئے اور کامیاب پلٹے۔ خدیجہ کے دل میں گھر بن گیا۔ اور انھیں یہ فکر لاحق ہو گئی کہ اس جوان کو اپنی زندگی بھر کا شریکِ کار بنالیا جائے۔ عالم عربیت میں حسن و جمال، اخلاق و آداب، صداقت و امانت اور بلند کرداری میں اس جیسا کوئی نہیں ہے۔

حضرت خدیجہ نے جس وقت سے اپنے غلام میسرہ سے وہ حالات سُنے جو راہِ شام میں پیش آئے تھے اسی وقت سے انھوں نے اپنے دل میں یہ ٹھان لی تھی کہ اس کے علاوہ کسی اور کو شریکِ زندگی نہ بنائیں گی۔

لیکن اس کی کیا صورت ہو؟ یہ مقصد کس طرح حاصل ہو؟ رسوم و رواج چار طرف سدِّ راہ ہیں

مقصد برآری کی کوئی سبیل نظر نہیں آرہی ہے۔ تقاضا یہ ہے کہ پیغام مرد کی طرف سے آئے، عورت کو ہاتھ نہیں بڑھانا چاہیئے۔ لیکن کیا حضرت خدیجہ بھی اس رواج کے سامنے سر خم کردیں اور اپنی امیدوں اور آرزوؤں کو برباد ہونے دیں یا ایک انقلابی قدم اٹھالیں کہ کہیں ایسا نہ ہو کر محمدؐ کسی دوسرے کی قسمت میں پڑ جائیں اور ساری زندگی کی تمنائیں پامال ہو کر رہ جائیں۔

کافی غور و خوض کے بعد آپ نے یہ حل نکالا کہ خود ہی پیغام بھی دیں اور رسم و رواج کی مخالفت بھی نہ ہونے پائے چنانچہ آپ نے نفیسہ بنتِ مُنیہ کو چپکے سے بھیج دیا کہ وہ حضرت سے اس موضوع پر گفتگو کریں اور ان کے سامنے خدیجہ کا خیال ظاہر کریں، شاید کوئی امید افزا اور تشفی بخش جواب مِل سکے۔

ابھی نفیسہ اور آنحضرتؐ کی گفتگو تمام نہ ہوئی تھی کہ نفیسہ نے حضرت خدیجہ کو خوش خبری سنائی کہ آپ کا پیغام کامیاب ہو گیا۔ ادھر حضرتؐ چچا کے پاس پہونچے اور انھیں یہ مبارک خبر سنائی۔

محفلِ عقد منعقد ہوئی۔ امام قریش، سردارِ عرب حضرت ابوطالبؑ نے خطبہ پڑھنا شروع کیا۔

الحمد لله الذی جعلنا من ذریة ابراهیم و زرع اسمٰعیل وضئضئ معد وعنصر مضر و جعلنا حضنة بیته وسوائس حرمه وجعل لنا بیتاً محجوباً وحرماً آمنا وجعلنا حکام الناس ثم ان ابن اخی هذا محمد بن عبد الله لا یوزن برجل الارجح به شرفاً ونبلاً وفضلاً وعقلاً فان کان فی المال قل فان المال ظل زائل وامر حائل وعاریة مترجعة ومحمد قد عرفتم قرابته وقد خطب خدیجة بنت خویلد و بذل بها ما آجله کذا وهو والله بعد هذا له نبأ عظیم وخطر جلیل جسیم۔ [1]

"شکر ہے اس معبود کا جس نے ہمیں ابراہیمؑ کی ذریت، اسمٰعیلؑ کی نسل، معد کا معدن مضر کا جوہر، کعبہ کا نگراں اور حرم کا محافظ بنایا ہے، حرم و کعبہ کو ہمارے حوالے کر کے

---

[1] السیرۃ النبویہ ج ۱ ص ۱۶۱، الحلبیہ ج ۱ ص ۱۶۵، فاطمہ بنت محمدؐ ص ۲۲، شرح النہج ج ۶ ص ۳۱۲، ابوطالب ص الحجۃ ص ۳۶، البحار ج ۶ ص ۱۳۵، تذکرۃ الخواص ص ۳۱۲، الغدیر ج ۷ ص ۲۷۲، اعجاز القرآن باقلانی ص ۲۳۲، اعیان الشیعہ ج ۴۱ ص ۱۳۷، کامل ج ۳ ص ۱۱۷۴ وغیرہ۔

ہمیں تمام لوگوں کا حاکم بنا دیا ہے یاد رکھو کہ یہ میرا بھتیجا محمدؐ شرافت و نجابت، فضل و عقل کے اعتبار سے تمام دنیا سے بہتر ہے۔ یہ اگرچہ مالی اعتبار سے کمزور ہے لیکن مال کیا چیز ہے ایک ڈھلتا ہوا سایہ، ایک پلٹا کھائی ہوئی شے، ایک واپس ہو جانے والی عاریت۔ تم لوگ محمدؐ کی قرابت سے واقف ہو، اب انھوں نے خدیجہ بنت خویلد کو پیغام دے دیا ہے اور مہر مقرر کیا ہے یاد رکھو ان سب باتوں کے علاوہ محمدؐ بڑا جلیل القدر اور عظیم المرتبت انسان ہے"

اس خطبہ میں دو باتیں نمایاں طور پر نظر آرہی ہیں۔

پہلے تو اس خطبہ کا آغاز ہی اس خدا کی حمد سے کیا گیا ہے جس نے انھیں ابراہیمؑ کی نسل اور اسمٰعیلؑ کی ذریت میں سے قرار دیا ہے کہ نہ بت پرستی قریب آنے پائی نہ جاہلیت کو راستہ ملا، سارا خاندان، پورا سلسلہ ابتداء میں نورِ اول سے متصل اور آخر میں بقائے دوام سے ہمکنار، ابتداء و انتہا دونوں شریعت ہی شریعت اور اسلام ہی اسلام!

یہی وہ صفت تھی جس نے اس حرم کا نگراں بنا دیا جس کو خلیل خدا نے تعمیر کیا تھا اور جس نے سارے عالم کی حکومت دے دی۔

لیکن یہ تمام باتیں حضرت ابوطالبؑ کی نظر میں صرف ایک مقدمہ کی حیثیت رکھتی تھیں۔ آپ نے فوراً بھتیجے کی معنویت پر روشنی ڈالنا شروع کر دی، یہ میزان معنویت میں سب سے گراں پلہ اور مستقبل میں سب سے زیادہ عظیم الشان اور جلیل القدر ہے۔

یہ شان، یہ قدر کیا ہے؟ یہی نا کہ یہ جوان رسالت کا بار اٹھائے گا، ہدایت بشر کا بوجھ سنبھالے گا نبوت کے صفحات پر سنہری اور روپہلی تحریریں ثبت کرے گا۔ گویا کہ حضرت ابوطالبؑ اس مستقبل کو دیکھ رہے تھے جس پر کسی کی بھی نظر نہیں تھی اور اس طرح پورے معاشرے کو اس عظمت کا عادی بنانا چاہتے تھے جو عنقریب پورے جاہ و جلال کے ساتھ ظاہر ہوگی ایسا نہ ہو کہ یہ لوگ غفلت میں رہ جائیں اور نورِ جلالت ان کی نگاہوں کو خیرہ کر دے!

▲▲

صبحِ پیغام

وہ یتیم جو کل تک رئیسِ قوم ابوطالبؑ کی پناہ میں پرورش پا رہا تھا جس کے لئے ابوطالبؑ نے اپنی نیند حرام کر دی تھی آج اِس کے ہاتھ مضبوط ہو چکے ہیں اس کی کلائیوں میں طاقت آچکی ہے وہ ایک گھر کا مالک اور چند بچوں کا باپ بن چکا ہے اب عیال و اطفال زندگی کے اسباب چاہتے ہیں۔ حالات فکر و ذکر کے تقاضے کر رہے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ ان بچوں کے پاس قلتِ مال کے باوجود خیر و برکت اطمینان و سکون کی بے پناہ دولت موجود ہے۔

لیکن اس گھرباری کے بعد کیا ابوطالبؑ کے فرائض ختم ہو گئے؟ کیا اس وصیت کی میعاد تمام ہو گئی جس پر ابتداء سے اب تک عمل ہو رہا تھا؟ کیا اب وہ وقت آگیا ہے کہ ابوطالب اپنے بچوں کی بھی فکر کر سکیں؟ وہ بچے جو آج تک یتیم عبداللہ کی خاطر سختیوں میں زندگی گزار رہے تھے؟ ظاہر ہے کہ اس کا جواب نفی میں ہوگا یہ اور بات ہے کہ اگر یتیم عبداللہ کے علاوہ کوئی اور بچہ ہوتا تو فرائض کب کے ختم ہو چکے ہوتے لیکن یہ بچہ تو وہ ہے جسے تاریخ کا رُخ بدلنا ہے جسے کائنات کی تاریکیوں میں علم و عرفان کی شمعیں روشن کرنا ہیں۔ اِس کے فرائض اِسی جگہ پر ختم نہیں ہوتے کہ یہ چند کھلی ہوئی کلیوں کا باپ کہا جانے لگا۔

بلکہ اس سلسلے میں ذمہ داریوں کا آغاز ہی درحقیقت آج ہو رہا ہے جب کہ اس کی عمرِ عزیز کے چالیس سال گزر چکے ہیں۔ یہی وہ دن ہے جس کا انتظار حضرت عبدالمطلب کو تھا۔ یہی وہ مطلع انوار ہے جس پر ایمان لانے کی تڑپ آنجناب کے دِل میں تھی اور یہی وہ جوان ہے جس کے بارے میں زندگی کے آخری لمحات تک وصیتیں ہو رہی تھیں ——— "اب جو زندہ رہے اس پر ایمان لائے، اس کا تحفظ کرے۔ اور اسکی عظمتوں سے اِستفادہ کرے"۔

ابوطالبؑ اس صبحِ منیر اور روزِ روشن کا بڑی بے تابی سے انتظار کر رہے تھے۔ ہر آن یہ خطرہ لگا ہوا تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ بساطِ حیات لپیٹ دی جائے اور وہ صبحِ پیغام نمودار نہ ہو۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ باپ کی طرح اجل آجائے اور وہ ایمان و تحفظ کی شرافت و عظمت حاصل نہ ہو سکے۔

خدا کا شکر ہے کہ اِس دن کا ہنس مکھ چہرہ ظاہر ہو گیا۔ ابوطالبؑ کے چہرہ پر تبسم کی لہریں دوڑ رہی ہیں۔ باچھیں کھلی جا رہی ہیں۔ مسّرت و فرحت کے آثار نمایاں ہو رہے ہیں۔ نگاہوں کے سامنے وہ مبارک دن ہے جس کا آج تک انتظار تھا۔

بھتیجا اپنے چچا عباس کے پاس یہ کہنے جا رہا ہے کہ اللہ نے مجھے اپنے امر کے ظاہر کرنے کا حکم دے دیا ہے لہٰذا آپ میری مدد کریں۔ میرا ہاتھ بٹائیں اور میرے باز و مضبوط کریں اور عباس اپنی مجبوریوں کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں:-

"بیٹا اپنے چچا ابوطالب کے پاس جاؤ وہ سب سے بزرگ ہیں وہ اگر مدد نہ بھی کر سکیں گے تو تمہارا ساتھ ہرگز نہ چھوڑیں گے۔"

بھتیجا چچا کی مایوس کن تقریر سن کر حضرت ابوطالبؑ کے پاس آیا، ان کی زبان سے بے ساختہ یہ جملے نکل پڑے:

"ارے! اس وقت تمہارے آنے کا کیا سبب ہے؟ کیا کوئی خاص خبر؟"

یہ کہہ کر ابوطالبؑ کی نظریں محمدؐ کے چہرے پر جم جاتی ہیں گویا اس خوردبین سے مستقبل کا اندازہ لگانا چاہتے ہیں۔ اور اس آئینہ میں انسانیت کی مکمل تصویر کا مشاہدہ کرنا چاہتے ہیں۔

اس کے بعد وہ گفتگو کرتے ہیں جس سے محمدؐ کے دِل میں طاقت و سکون اور ہاتھوں میں قوت و استحکام کا احساس بڑھ جاتا ہے وہ سمجھ لیتے ہیں کہ اس حصن حصین، قلعۂ محکم کے ہوتے ہوئے کوئی بھی میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔

فرماتے ہیں: ———

بھتیجے! جاؤ اعلان کرو، تمہاری منزل بلند، تمہاری جماعت محکم اور تمہارا نسب بہت ارفع و اعلیٰ ہے۔ خدا کی قسم! اگر کسی کی زبان سے ایک نا منزا کلمہ بھی نکلا تو پھر تلواریں نکل پڑیں گی۔ خدا کی قسم عرب تمہارا اِسی طرح اتباع کریں گے۔ جس طرح جانور اپنے پرورش کرنے والے کا اتباع کرتے ہیں۔ میرے باپ نے ساری کتابیں پڑھی ہیں

انھوں نے فرمایا ہے کہ میرے صلب سے ایک نبی ہوگا کاش میں اس وقت تک باقی رہتا تو اس کے ہاتھ پر ایمان لے آتا خیر اب میری اولاد میں جو بھی رہ جائے اس کا فریضہ ہے کہ اس پر ایمان لے آئے"۔ [1]

ابوطالبؑ نے چاہا کہ پہلے محمدؐ کی شرافت وسیادت کا تذکرہ کریں اور ان کا دل بڑھائیں تاکہ وہ اپنے اقدام میں کوئی کمی محسوس نہ کریں۔ پھر اس مستقبل کا تذکرہ کریں جس میں سارے عالم عرب کی گردنیں جھک جائیں گی اور یہ جوان (محمدؐ) رئیسِ مطلق ہوگا۔

ایک مرتبہ ذہن میں جناب عبداللہ کا خیال آگیا کہ انھوں نے بھی مجھے اور میرے باپ کو وصیت کی تھی اور اب جب کہ وہ دن آگیا ہے اور وہ نبی مبعوث ہو رہا ہے تو میرا فریضہ ہے کہ ایمان بھی لاؤں اور نصرت بھی کروں' تاکہ بابا کی رُوحِ پاک خوش ہو اور ان کی آنکھوں میں خنکی پہونچے۔

ابوطالبؑ کی یہ گفتگو درحقیقت ان کے ایمان کی واضح دلیل ہے کہ اگر دُنیا ان تمام کرامات وعلامات پر اعتماد نہ بھی کرے تو یہ آج کی گفتگو خود ایک مستقل بُرہان ہے۔ اس استحکامِ عقیدہ' رسوخِ ایمان اور اطمینانِ قلب پر جن کے مجموعہ کا نام ابوطالبؑ ہے۔

اگر عقیدہ کا یہ اتحاد و اتفاق نہ ہوتا تو حضرت ابوطالبؑ سب سے پہلے مخالفت کرتے' انقلاب کرتے' اس لئے کہ یہ سب تو ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ محمدؐ ان کی آغوش کا پروردہ بچہ اور اس کا پیغام دُنیا سے نرالا پیغام! ابھی تو کوئی قبول کرنے پر آمادہ بھی نہیں ہے ابھی تو نہ اس کی جڑیں قائم ہوئی ہیں اور نہ منکشف ہوا ہے کتنا آسان مرحلہ ہے کہ اسے روزِ اوّل ہی کچل دیا جائے' یا کم از کم بھتیجے کو اِسی حال پر چھوڑ دیا جائے۔ نہ اس سے نصرت کا وعدہ کیا جائے اور نہ اس کا دل بڑھایا جائے۔

لیکن تاریخ اِس کے بالکل برعکس ہے۔ ابوطالب ایمان کی طرف اس طرح لپکتے ہیں جیسے مدّت سے ہر ہر لمحہ اس کا انتظار کر رہے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ حادثہ کوئی عجیب حادثہ یا یہ واقعہ کوئی نیا واقعہ نہیں ہے۔

---

[1] الغدیر ج ۷، ص ۳۴۹' غایۃ السؤل ابراہیم دیثوری' طرائف ابن طاؤس ص ۸۔ شیخ ص ۲۲ العباس ص ۱۸' ص ۲۳

یہی وجہ تھی کہ ابھی عباس کی گفتگو ختم نہ ہونے پائی تھی کہ ایک مرتبہ بھتیجے کو قیام کا حکم دے دیا۔ ظاہر ہے کہ اگر عقیدہ میں رسوخ اور ایمان میں پختگی نہ ہوتی تو گفتگو کا یہ انداز نہ ہوتا۔ ایک ضعیف انداز ہوتا اور ایک نحیف آواز۔ لیکن اِسے کیا کیا جائے کہ ایمان کے جذبات اور اطمینانِ قلب کے محرکات نے اس صریحی اعلان پر مجبور کر دیا۔ انھوں نے دیکھا کہ بھتیجے کا بار بہت ذوقی ہے لیکن مجھے کمک' دفاع اور نصرت سے باز نہ رہنا چاہیئے۔ یہی تو وہ ہے جس کا ذکر بابا نے کتب سماویہ میں دیکھا تھا اور اسی کے تذکرہ سے تو آسمانی صحیفے بھرے پڑے ہیں۔ ▲▲

دعوتِ ذوالعشیرہ

اس کے بعد ایک دن وہ بھی آگیا جو ہیبت وجلالت کے اعتبار سے روزِ اول سے کچھ کم نہ تھا یہ کون سا دن تھا۔؟

یہ وہ دن تھا جب آیت انذار نازل ہوئی اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مومن اول علیؑ کو حکم دیا کہ روٴسائے قریش کو طلب کریں۔

ان کی دعوت پر سب آئے، پیغام سنایا گیا اور سب سن کر چل دیے۔

دوسرے دن پھر بلائے گئے، پیغام سنایا گیا، اپنی ذمہ داریوں کا اظہار کیا گیا۔ لیکن پھر بھی کچھ نہیں بن سکا۔ آخرِ کار ابوطالبؑ کھڑے ہو گئے۔ فرمانے لگے تمہاری مدد کرنا۔ تمہاری نصیحت کو قبول کرنا۔ تمہاری باتوں کی تصدیق کرنا بہت اچھی چیز ہے۔ اگرچہ یہ سب ہی خاندان کے ہیں۔ لیکن میں سب سے پہلے دعوت کو قبول کرتا ہوں اب تم اپنا کام شروع کرو۔ خدا کی قسم! میں تمہیں بچاؤں گا، تمہاری حفاظت کروں گا۔ بس میرا دل یہ نہیں چاہتا کہ عبدالمطلب کے دین کو ترک کر دوں [1]

یہ سننا تھا کہ ابولہب کھڑا ہو گیا کہنے لگا، خدا کی قسم! یہ ایک عار و ننگ ہے۔ اسکو اسی وقت روک دو۔

حضرت ابوطالبؑ نے فرمایا: "خدا کی قسم! میں تا حیات اسکو بچاتا رہوں گا۔" [2]

---

[1] کامل ابن اثیر ج ۲ ص ۴۱

[2] کامل ابن اثیر ج ۲ ص ۴۱، السیرۃ الحلبیہ ج ۱ ص ۳۲۱

یہ کہہ کر بھتیجے سے خطاب کیا۔ میرے سردار اُٹھیے جو چاہتے ہیں کہیے۔ اپنا پیغام پہنچائیے۔ آپ صادق بھی ہیں اور صدیق بھی ہیں [1]

کیا کہنا اس ایمانی ہیبت کا جس نے چالیس افراد سے زیادہ کے مجمع میں ایک ابوطالب کو تصدیق و ترغیب پر آمادہ کیا۔ جب کہ دوسرے لوگوں کا یہ عالم تھا کہ انھیں جاہلیت کے پردوں سے نورِ ایمان نظر ہی نہ آتا تھا۔

اب تو حضرت ابوطالبؑ نصرت بھی کریں گے۔ نصیحت بھی قبول کریں گے۔ اور باتوں کی تصدیق و تائید بھی کریں گے۔ ایمانِ کامل اطاعتِ صادقہ اور جانی بوجھی عقیدت اس کے علاوہ اور کیا ہو سکتی ہے؟ سب سے پہلے دعوت قبول کرنا، بھتیجے کو پیغامبری کا حکم دینا، زندگی بھر امداد و حفاظت کا وعدہ کرنا، ایمان کے علاوہ اور کیا شئے ہے؟

خدا کی قسم۔ ابوطالبؑ پر ایمان و عقیدہ کی اس منزل پر نہ ہوتے تو ان کو گفتگو کا انداز کچھ اور ہوتا، ان کا موقف کسی اور طرز کا ہوتا۔ آخر ابولہب کا موقف ہمارے سامنے ہے۔ اس کی ترشِ کلامی بھی ہم نے دیکھی ہے اس کی وہ گفتگو بھی ہمارے پیشِ نظر ہے جس کی بناء پر حضرت ابوطالبؑ کو یہ کہنا پڑا تھا "چپ رہ اے کانے! تجھ سے کیا تعلق ہے۔" [2]

آپ بتائیں کہ کیا ابوطالبؑ اور ابولہب دونوں ہی چچا نہ تھے؟ پھر دونوں کے موقف میں اتنا شدید اختلاف کیوں ہے؟ ایک طرف سے قربانی، تشجیع، کمک ہے۔ اور دوسری طرف سے معارضہ، مقابلہ اور تصادم، بدزبانی اور مسخرہ پن!

جب جناب ابوطالبؑ نے ایمان و اخلاص کا اعلان کر دیا تو دیکھا کہ کچھ تیز و تند اور حسد آمیز نگاہیں بھی اُٹھ رہی ہیں۔ چنانچہ آپ نے فوراً طے کر لیا کہ اپنے موقف کو مخفی کر لیا جائے۔ یہ طریقِ کار دعوتِ رسولؐ اور نصرتِ کامل کے لئے کچھ زیادہ مفید ثابت ہو گا۔

یہ سوچتے ہی آپ نے فرمایا "بس میرا دل عبدالمطلب کے دین کو چھوڑنے پر راضی

---

[1] شیخ الابطح ص ۲۰، الغدیر ج ۷ ص ۳۵۵

[2] بحار ج ۶ ص ۲۵۰۔ الغدیر ج ۷ ص ۳۵۵، شیخ الابطح ص ۳۲۲

نہیں ہوتا۔"

آخر یہ عبدالمطلبؑ کا دین کیا تھا؟ کیا یہ دین ملتِ حنیفہ، دینِ ابراہیمؑ اور دعوتِ خلیل کا تسلسل نہ تھا؟ کیا یہ دین ادیانِ سماویہ کا تتمہ و تکملہ نہ تھا۔؟

یقیناً تھا لیکن ابوطالبؑ نے اسی پردہ میں اپنے موقف کو پوشیدہ کر دیا اور وہ بے بصیرت جاہل مطلق عرب سمجھ نہ سکے۔

یہی وجہ تھی کہ جب ابولہب نے اس خاموشی سے فائدہ اٹھانا چاہا تو فوراً بگڑ کر کھڑے ہو گئے اور فرمایا: "میرے سردار بھتیجے" کیا یہ سرداری کا اعتراف ایمان کی دلیل نہیں ہے۔؟

ذرا غور تو کیجئے، سردار کا لفظ کون استعمال کر رہا ہے۔ اور کس کے لئے؟ ابوطالب جیسا عظیم انسان! جس نے پالا ہے، کفالت کی ہے۔ بزرگ ہیں۔ کبیر السن ہیں۔ یہ لفظ تو خود محمدؐ کو استعمال کرنا چاہیئے تھا۔ (اگر نبوت کا امتیاز نہ تھا)

لیکن رسالت کا حق ان تمام حقوق پر غالب آگیا۔ اب محمدؐ وہ سراج منیر ہے۔ جس سے انسانیت بھولی ہوئی راہوں کو دریافت کرے گی۔ اب اس کی منزل نسب، قرابت، تربیت، کفالت، سن و سال سب سے مافوق ہو گئی ہے [1]۔

ابوطالبؑ کے پیش نظر یہ تمام باتیں اسی وقت تھیں جب آپ "سردار" کہہ رہے تھے۔ آپ دیکھ رہے تھے کہ جب یہ بچہ رسول ہے تو میرا واجب الاطاعت سردار اور قابلِ اتباع رئیس ہے اس لئے بڑی آزادی سے کہہ دیا کہ آپ جو چاہیں کہیں، اپنے پیغام کو پہنچائیں۔ آپ صادق بھی ہیں اور صدیق بھی۔

ظاہر ہے کہ جو ایسا صادق القول ہو کہ اگر پہاڑ سے لشکر کے نکلنے کی خبر دے تو کسی میں شک و انکار کی تاب نہ ہو۔ اس کے پیغام میں شبہ کی گنجائش ہی کیا ہے؟

ابوطالبؑ نے دیکھا کہ چند آنکھوں سے شرارتیں جھلک رہی ہیں۔ کچھ لب حرکت میں آ رہے ہیں اور آپ کے کان تک ایک تمسخر آمیز جملہ پہونچ ہی گیا۔

"لو! انھوں نے تو تم پر تمہارے بیٹے کی اطاعت بھی واجب کر دی" [2]

آپ نے یہ سن کر نہایت ہی اطمینان کے ساتھ کہہ دیا: "وہ جو کچھ کرے گا خیر ہی کرے گا"

حضرت علیؑ نے حضرت ابوطالبؑ کی زبان سے یہ کلمہ پہلے پہل نہیں سنا تھا۔ بلکہ اس محبت بھرے اور جذبات آمیز جملے کو اس سے پہلے بھی اس وقت سن چکے تھے جب ابتدائے رسالت میں

انھوں نے چپکے سے رسول اکرمؐ کی اقتدار میں نماز شروع کی تھی اور اپنے باپ کے ایک سوال کے جواب میں انھوں نے کہا تھا: "بابا جان! میں خدا و رسولؐ پر ایمان لا چکا ہوں۔ رسول اکرمؐ کے احکام کی تصدیق کر چکا ہوں اور ان کے پیچھے نماز بھی پڑھ چکا ہوں۔"

اس پر حضرت ابوطالبؑ نے فرمایا تھا۔ "اسی طریقے پر باقی رہو کہ یہ تمہیں خیر ہی کی دعوت دیں گے۔" [3]

درحقیقت یہ کلمہ بڑے گہرے اطمینان و ایمان کی غمازی کر رہا ہے۔ رسولؐ صرف خیر ہی کی دعوت دیں گے۔ یعنی ہر عاقل کا فریضہ ہے کہ ان کا اتباع کرے اور ان کے خیر و برکات سے مستفیض ہو۔

دراصل یہ کلمہ بھی انھیں بے شمار دلائل میں سے ایک دلیل ہے۔ ورنہ اگر حضرت ابوطالبؑ صاحبِ ایمان نہ ہوتے تو انھیں کیا ضرورت تھی کہ نبی کے نظام کی تائید و ترویج کریں اور پھر اپنے فرزند کو بھی حکم دیں کہ وہ اسی قانون و نظام کو اختیار کرے۔

اگر وہ اس درجۂ کمالِ ایمان پر فائز نہ ہوتے تو اپنے فرزند کو اس پیغام کے قبول کرنے سے منع کرتے اور اسے اس وسیع راہ پر لے جاتے جو ایک کافر کی نظر میں سیدھی راہ ہوتی ہے۔ ان کی نظر میں محمدؐ کی دعوت میں خیر کے علاوہ کوئی اور احتمال ہوتا تو ان کا موقف آج کے

---

[1] ہمارے یہاں سن و سال کا کوئی معیار نہیں ہے ہم قلب و زبان کی آزمائش کرتے ہیں جن کو معیار کمال وہی قرار دیتا ہے جو دیگر کمالات سے عاری ہوتا ہے۔ سن اسی وقت قابلِ احترام ہوتا ہے جب اس کے ساتھ دیگر کمالات و فضائل کا بھی امتزاج ہو۔ (جواری)

[2] کامل ج ۲ ص ۲۲، طبری ج ۲ ص ۶۳، غایۃ المرام ص ۸، ۱۵۳، ۱۶۹، ۱۸۸، ۳۲۰، ۳۲۲، ۶۱۳۔ الغدیر ج ۲ ص ۲۷۵-۲۸۳، ج ۳ ص ۲۰۹، اعیان الشیعہ ج ۲ ص ۹۵-۱۰۲ ج ۲۹ ص ۱۲۹ رسائل جاحظ ص ۷۶

[3] طبری ج ص ۵۸، اصابہ ج ۴ ص ۲۱۶، السیرۃ الہشامیہ ج ۱ ص ۲۶۴، النبویہ ج ۱ ص ۱۶۷، الحلبیہ ج ۱ ص ۳۰۱، شرح النہج ج ۳ ص ۳۰۵، ینابیع المودۃ ج ۲ ص ۲۸، الریاض النضرۃ ج ۲ ص ۱۵۹، غایۃ المرام ص ۵۰، ابوطالب العباس ص ۲۲، الغدیر ج ۷ ص ۳۰۶، عیون الاثر ج ۱ ص ۹۴، اسنی المطالب ص ۱۰، رسائل جاحظ ص ۵۱، صوت العدالۃ ص ۳۵۔

طرزِ عمل سے بالکل مختلف ہوتا۔ وہ اپنے فرزند کو منع کرتے اور انہیں اس غلط راستے کو اختیار نہ کرنے دیتے

حضرت ابوطالبؑ کی تاریخ میں فقط یہی ایک سطر روشن نہیں ہے بلکہ آپ کی پوری تاریخ ایسے ہی روشن اور نورانی حروف سے لکھی گئی ہے۔

جناب امیر علیہ السّلام فرماتے ہیں کہ میرے والد ماجد نے مجھ سے فرمایا "اپنے بھائیؑ کے طریقے کو اختیار کرو۔ وہ ہر قریب و بعید سختی سے بچائے گا۔ پھر اعلان کیا۔

"ان الوثیقة فی لزوم محمد فاشدد بصحبته علیّ یدیک" [۱]

"اے علی! محمدؐ کی متابعت میں اطمینان و سکون ہے لہٰذا انھیں کے ساتھ رہا کرو۔"

گویا کہ آپ کی نظر میں دینِ رسولؐ کا اتباع کرنا دنیا و آخرت کی سلامتی کا ضامن ہے — اور درحقیقت روزِ جزا پر ایمان کا بھی جوہر ہے کہ انسان کی نظر میں ایک ایسا دن بھی ہو جب ہر شخص کو اس کے عمل کا بدلہ دیا جائے گا۔ اور ہر ایک کا حساب صاف کیا جائے گا۔

ایک مرتبہ آپ کی نظر میں رسول اکرمؐ کی اقتدا پر پڑ گئی۔ دیکھا کہ داہنی طرف علیؑ ہیں اور بائیں طرف خالی۔ فوراً جعفرؑ کو آواز دی ۔ "بیٹا جاؤ اور بائیں طرف کھڑے ہو جاؤ"۔ [۲]

یہ کہہ کر کچھ اشعار پڑھنا شروع کیے جن میں اپنے دونوں فرزندوں کی واقعی مدح اور ان کے لئے ایک دستورِ حیات بیان کیا ہے:

ان علیًا وجعفراً ثقتی عند مُلم الزمان والنوب لاتخذلا

وانصرا ابن عمکما اخی لامی من بینھم وابی واللہ لا اخذل

النبی ولایخذلہ من بنی ذو حسب۔ [۳]

---

[۱] شرح النہج ج ۳ ص ۳۱۴ ایمان الشیعہ ج ۳۹ ص ۱۲۴ ہاشم و اُمیۃ ص ۱۶۳

[۲] النبویہ ج ۱ ص ۱۷۱، الحلبیہ ج ۱ ص ۲۸۶، اصابہ ج ۴ ص ۱۱۶ شرح النہج ج ۳ ص ۲۷۲ الغدیر ج ۷ ص ۲۵۷
اسد الغابہ ج ۱ ص ۲۸۷ وغیرہ

[۳] شرح النہج ج ۳ ص ۳۱۴ ۳۱۴، الحجۃ ص ۶۵، دیوان ابوطالبؑ، شیخ الابطح ص ۳۸، ایمان ابی طالب ص ۱۹
ایمان الشیعہ ج ۲ ص ۲۰۰، ج ۳۹ ص ۱۲۲، معجم القبور ج ۱ ص ۱۹۲-۲۰۱، الغدیر ج ۷ ص ۳۵۶
رسائل جاحظ ص ۲۹

"علیؑ و جعفرؑ مصائب زمانہ اور شدائد روزگار میں میرے معتمد علیہ ہیں۔ میرے بیٹو! اپنے بھائی کی کمک کرو، یہ میرے حقیقی بھائی کا فرزند اور اس کی یادگار ہے۔ خدا کی قسم! نہ میں اسے چھوڑ سکتا ہوں اور نہ میری اولاد میں سے کوئی شریف اس کا ساتھ چھوڑے گا۔"

ایک وقت وہ آتا ہے جب اپنے بھائی حضرت حمزہ کو آواز دیتے ہیں بھیا دینِ خدا کا اظہار کرو اور اس سلسلے میں مصائب برداشت کرو۔ صاحبِ شریعت کی حفاظت میں عزمِ محکم اور ارادۂ مستحکم سے کام لو۔ اس کے بعد حسبِ ذیل اشعار کے ذریعے اس تحریک کو آگے بڑھاتے ہیں۔

فصبراً ابا یعلی علی دین احمد ۔۔۔ وکن مظہر اللدین وفقت صابراً

وحط من اتی بالحق من عند ربہ ۔۔۔ بصدق وعزم لاتکن حمز کافرا

فقد سرنی اذ قلت انک مومن ۔۔۔ فکن لرسول اللہ فی اللہ ناصرا

ونادقریشًا بالذی قد اتیتہ

جھارا وقل ماکان احمد ساحراً

"حمزہ دینِ احمدؐ کا اعلان کرو اور صبر کرو، اللہ تمہیں صبر کی توفیق دے۔ صاحبِ شریعتِ حقہ کی صدقِ دل سے حفاظت کرو اور کافر نہ بنو۔ مجھے بڑا اچھا معلوم ہوا کہ تم نے ایمان قبول کر لیا۔ اچھا فی سبیل اللہ اب رسولؐ کی نصرت بھی کرو۔ قریش میں اپنے ایمان کا اعلان کر کے کہہ دو کہ محمدؐ ساحر اور جادوگر نہیں ہے"

درحقیقت ابوطالبؑ اسلامی تحریک کا وہ قائد ہے جو ہر آن موقع کی تلاش میں رہتا ہے۔ اِدھر موقع ملا اور اُدھر مافی الضمیر کا اعلان شروع کر دیا۔

اس داعی اوّل کو یہی بھلا معلوم ہوتا ہے کہ حمزہ اپنے کو مومن کہیں اور پھر رسولؐ کی نصرت بھی کر دیں۔ وہ نصرت جس میں قربتِ الٰہی کا قصد ہو۔ نہ خون کا خیال ہو نہ قرابت کا اس لئے کہ دین ہر شئے پر مقدم اور عقیدہ ہر چیز سے فائق ہے۔

---

[۱] شرح النہج ص ۳۱۵، الحجۃ ص ۷۱، مناقب ص ۳۶، بحار ج ۹ ص ۳۳، عباس ص ۱۲، ایمان ابی طالب ص ۱۱
ایمان الشیعہ ج ۳۹ ص ۱۲۴، مجمع البیان ج ۴ ص ۲۳۱ (تھوڑے سے اختلاف کے ساتھ)

میں مناسب سمجھتا ہے کہ اس فصل کے خاتمہ میں علامہ برزنجی کا وہ قول بھی پیش کر دوں جو اس مقام سے بڑی حد تک مناسبت رکھتا ہے۔ وہ فرماتے ہیں:۔

"خبر متواترہ سے ثابت ہے کہ ابوطالبؑ رسولِ اکرمؐ کو چاہتے تھے۔ ان کی حفاظت کرتے تھے، تبلیغِ دین میں ان کا ہاتھ بٹاتے تھے۔ خود ان کے قول کی تصدیق کرتے تھے اور اپنے بیٹے علیؑ و جعفرؑ کو ان کے اتباع کا حکم دیا کرتے تھے"

ان احادیث سے یہ صحیح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ ابوطالبؑ کا سینہ نورِ ایمان و عقیدہ سے بالکل منور

۱؎ الغدیر ج۷ ص۳۵۸، اسنی المطالب ص۶ و ص۱۰

Date: February 19, 1997.
Food Restaurant.
Abdul Aziz St.
7535 / 895-3168
Your confirmation by Feb. 12, 1997 to attend
the ceremony will be highly appreciated.
Mirza
894-5013

جہاد

حضرت ابوطالب جیسے محافظ و شفیق کی برکت تھی کہ رسولِ اسلام کی دعوت میں ایک کیف پیدا ہوگیا اور اس کی شعاعیں عالم میں پھیل گئیں اس لئے کہ ابوطالب نے اپنے بھتیجے کی نصرت اور اس کے دین کی حفاظت کا عہد کر لیا ہے۔ ان کا ارادہ ہے کہ اس دین اور مبلغ کی راہ میں ہر قربانی پیش کر دیں، خواہ وہ اپنے نفس کی قربانی ہو یا اپنے پارۂ جگر کی!۔

رسولؐ نے بھی اس نصرت و حفاظت پر اعتماد کر کے انتہائی کیف و نشاط کے ساتھ اپنی تبلیغ شروع کی ہے۔ اب نہ بیان میں جھجک ہے نہ اعلان میں خوف و ہراس۔ اب ان کے پاس ایک ایسی بنیاد ہے جس پر اعتماد کر سکتے ہیں اور ایک ایسا سایہ ہے جس کے دامن میں آرام کر سکتے ہیں۔

یہاں سے حضرت ابوطالبؑ کی تاریخ کے روشن صفحات کا آغاز ہوتا ہے اس تاریخِ حیات کا ہر صفحہ دوسرے صفحہ سے زیادہ نورانی اور اس کی ہر سطر دوسری سطر سے زیادہ نور آگیں ہے۔

اس کے ایک صفحہ پر ایمانِ عمیق کی تصویر ہے تو دوسرے صفحہ پر جہادِ مستقل اور حیاتِ کاملہ کی تمثیل

یہ وہ صفحات ہیں جن پر حمایت، قربانی، دفاع اور تبلیغِ حق کی تحریریں ہیں۔

یہ وہ صفحات ہیں جن پر جہادِ صادق اور دفاعِ محکم کے نقوش ہیں اور ظاہر ہے کہ انسانی زندگی بھی بقول شوقیؔ عقیدہ و جہاد کے امتزاج ہی کا نام ہے۔

یہاں تو ایمانِ کامل، عقیدۂ راسخ بھی ہے اور جہادِ مسلسل و دفاعِ متصل بھی۔

زبان کا بیان بھی ہے اور نوکِ سنان بھی۔
چمکتی تلواریں بھی ہیں اور مضبوط بازو بھی۔
تلواروں کو کند کر دینے والے ارادے بھی ہیں اور پتھر کو پاش پاش کر دینے والے عزائم بھی۔

دعوتِ توحید اور تبلیغِ مذہب میں وہ کیف ہے کہ قریش کو یہ خطرہ لاحق ہو گیا ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ تمام انسان وحدہٗ لاشریک کی جسارت کرنے لگیں اور اپنے خود تراشیدہ پتھر دھرے کے دھرے رہ جائیں۔

وہ پتھر جو نہ دیکھتے ہیں نہ سنتے ہیں' نہ ان کا کوئی فائدہ ہے نہ نقصان
بشریت ان کے سامنے دست بستہ کھڑی ہوتی ہے۔ انسانیت ان کی بارگاہ میں اپنی حریتِ فکر اور آزادیٔ ضمیر کھو بیٹھتی ہے۔
عقلیں مغلوب' رسوم و تقلید غالب' احساس مفقود' شعور معدوم' اب انسان گوشت و پوست کا انسان ہے اور عقل و شعور کا جماد۔

تبلیغ میں نشاط آتا گیا۔ مومنین کی تعداد بڑھتی گئی۔ یہاں تک کہ رسولِ اعظمؐ نے اپنا اعلانِ عام کر دیا۔ مصنوعی خداؤں کی حیثیت واضح کر دی۔ حالات پر تنقیدی تبصرہ کر کے لوگوں کو جہالت و ضلالت سے نکل کر صراطِ مستقیم پر گامزن ہونے کا پیغام دے دیا۔
لیکن افسوس کسی اندھے کو کیا خبر کہ نور کیا ہے! چمگادڑ کو کیا معلوم کہ آفتاب کی شعاعوں میں کیا چمک دمک ہوتی ہے!

قریش کو یہ بات کھل گئی کہ محمدؐ ان کے خداؤں پر اتنا کھلا ہوا تبصرہ کریں۔ لیکن ان کے پاس ابوطالبؑ سے زیادہ انصاف پسند کوئی انسان بھی نہیں تھا۔ چنانچہ چند اشرافِ قبیلہ آپ کے پاس یہ شکایت لے کر پہونچے کہ آپ کے بھتیجے نے ہمارے خداؤں کو برا بھلا کہا ہے۔ ہمارے دین کی مذمت کی ہے ہماری عقلوں کو ضعیف اور ہمارے بزرگوں کو گمراہ قرار دیا ہے۔ آپ یا تو انھیں روک دیں یا پھر ہمارے حوالے کر دیں ہم ان سے اپنا حساب خود چکا لیں گے۔ آخر آپ بھی تو ہمارے ہی ہم خیال ہیں۔[۱]

---

[۱] یہاں سے معلوم ہوتا ہے کہ ابوطالبؑ نے تقیہ کیوں کیا تھا! اگر آج ان کا ایمان ظاہر ہو گیا ہوتا تو قریش شکایت لے کر نہ آتے بلکہ جنگ کرنے آتے اور اس طرح تبلیغ اسلام کا وہ انجام ہوتا جو آج تصور سے بھی بالاتر ہے (جوادی)

حضرت ابوطالبؑ نے انھیں سمجھا سمجھا کر واپس کر دیا اور رسولؐ پھر اپنی تبلیغ میں مصروف ہو گئے۔ پھر وہی اعلانِ توحید اور پھر وہی مذمتِ اصنام!
جب قریش نے دیکھا کہ ہماری آواز صدا بصحرا ہو گئی ہے اور ہماری طلب پر کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا تو دوبارہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہنے لگے:

"اے ابوطالبؑ آپ بزرگ باشرف اور مسن آدمی ہیں۔ ہم نے آپ سے کہا کہ اپنے بھتیجے کو روک دیجئے۔ لیکن آپ نے کچھ نہیں کیا۔ ہم اس سب دشنام و تمسخر و استہزاء پر صبر نہیں کر سکتے۔ لہٰذا یا تو آپ انھیں روک دیں یا پھر ہم سے مقابلہ پر آمادہ ہو جائیں۔"

حضرت ابوطالبؑ یہ بات سن کر عجیب کش مکش میں گرفتار ہو گئے۔ نہ ایسی جنگ کا اعلان کر سکتے ہیں جس میں سارے خاندان کو کٹوا دیں اور نہ رسولؐ کا ساتھ ہی چھوڑ سکتے ہیں۔ اس لئے کہ ان سے بھی نصرت کا وعدہ کر چکے ہیں اور اپنے باپ کی وصیت کا خیال بھی دامن گیر ہے۔
آخر کار آپ نے کچھ سوچ کر بھتیجے کو بلایا۔ لوگوں کا پیغام سنایا اور چاہا کہ اس طرح بھتیجے کی صحیح رائے کا اندازہ کر لیں۔

فرمانے لگے "بیٹا! اپنے اور ہمارے اوپر رحم کرو۔ ناممکن چیز کا بار نہ اٹھاؤ"
لیکن آپ نے دیکھا کہ بھتیجے کے چہرے سے سوائے قوتِ عزم' ارادہ اور استقلال کے کسی اور شئے کے آثار نمایاں نہیں ہوتے' زبان پر یہ کلمات ہیں۔

"چچا! اگر یہ لوگ میرے داہنے ہاتھ پر آفتاب اور بائیں ہاتھ پر ماہتاب رکھ دیں تو بھی اس پیغام کو ترک نہیں کروں گا' اب یا میں ہلاک ہو جاؤں گا یا پیغام الٰہی غالب آجائے گا۔"

ابوطالبؑ نے دیکھا کہ بھتیجہ رنجیدہ ہو کر گھر سے جانا چاہتا ہے۔ بعض مورخین کے خیال کی بنا پر صرف اس لئے کہ اس کی نظر میں چچا کی ہمدردیاں ختم ہو گئی ہیں۔ اور اب وہ مدد کرنا نہیں چاہتے۔ چنانچہ آپ کی آنکھوں سے چند قطراتِ اشک بھی گرے۔[۱]
ابوطالبؑ نے جب دیکھا تو خونِ حمیت جوش کھانے لگا۔ عزمِ محکم نے کروٹیں بدلیں اور آپ نے یہ طے کر لیا کہ مجھے اس بچے کی مدد کرنا ہے چاہے سارا قریش بلکہ پورا عالمِ عرب ہی کیوں نہ مخالف ہو جائے

---

[۱] ہم رسولِ اکرمؐ کی طرف سے اس بدظنی کو قبول نہیں کر سکتے۔ ہمارے خیال میں یہ قطراتِ اشک [illegible] منفعل کے تعلق سے [illegible] میں چچا کی [illegible] مشکل ہوتا تھا

جہاد میرا ایک فریضہ ہے۔ مشیتِ الٰہی نے مجھے اپنے پیغام کا محافظ اور اپنے مبلغ کا نگراں و مربی بنایا ہے جو لازم یہ سوچ کر فرمایا کہ بیٹا ادھر آؤ۔ رقت و شفقت کے ڈوبے ہوئے الفاظ نے تفکر و اضطراب کے سلسلے کو توڑا خاموشی کا غلبہ تھا اور فرمانے لگے۔ "بیٹا جو چاہو کہو، خدا کی قسم میں تمہیں ان کے حوالے نہیں کر سکتا۔"[1]

اس کے بعد جوشِ محبت میں یہ اشعار پڑھنا شروع کر دیئے۔

والله لن يصلوا اليك بجمعهم حتىٰ اوسد بالتراب دفينا
فاصدع بامرك ما عليك غضاضة وابشر بذاك وقر منك عيونا
ودعوتني وعلمت انك ناصحي ولقد صدقت وكنت ثم امينا[2]
ولقد علمت بان دين محمد من خير اديان البرية دينا

"خدا کی قسم! جب تک میں زندہ ہوں تمہیں کوئی گزند نہیں پہونچ سکتا۔ تم نہایت ہی اطمینان کے ساتھ اپنے امر کا اعلان و اظہار کرو۔ تمہاری دعوت صادق، تم خود ناصح کامل اور امینِ محمد ہو، میں بخوبی جانتا ہوں کہ محمدؐ کا دین تمام ادیان سے بہتر ہے۔"

ہم ان اشعار کو نظر انداز نہیں کر سکتے۔ ہمیں ان کے مفاہیم میں غور و تامل سے کام لینا ہوگا۔ ان میں ایمان ابوطالب کے وہ دلائل و براہین پوشیدہ ہیں جن میں کسی طرح کے شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے۔

حضرت ابوطالبؑ جب کفارِ قریش کا پیغام پہنچا کر رسول اکرمؐ کو اطمینان دلا چکے، روشن ضمیر، مدبر، عقل اور شفیق دل کے ڈھالے ہوئے اشعار سنا چکے تو آپ نے چاہا کہ اپنی واقعی حیثیت کا اظہار بھی کر دیں اور اپنے اس عہد کی بھی تجدید کر دیں جس پر روزِ اول سے عمل کر رہے ہیں۔ آپ کے اشعار اسی حقیقت کا اظہار کر رہے تھے کہ پہلے اپنے جاہ و جلال کا اظہار کرتے ہیں کہ جب تک میرے دم میں دم ہے اور روئے زمین پر زندہ ہوں کسی کی مجال نہیں کہ آنکھ اٹھا کر دیکھ سکے۔ اس کے بعد رسولِ اکرمؐ کو اعلان توحید کا حکم دیتے

---

[1] طبری ج ۲ ص ۶۲-۶۷، النبویہ ج ۱ ص ۹۶، الحلبیہ ج ۱ ص ۳۲۲، ہشامیہ ج ۱ ص ۲۸۳، ص ۲۸۵، شرح نہج البلاغہ ج ۲ ص ۳۰۵-۳۰۶، ابوطالب ص ۵۷-۶۱، ہاشم وامیہ ص ۱۶۶، اعیان الشیعہ ۳۵ ص ۱۲۵، الغدیر ج ۷ ص ۳۶۳

[2] شرح النہج ج ۳ ص ۳۰۶، النبویہ ج ۱ ص ۸۵، ص ۱۹۵، ثمرات الاوراق ج ۲ ص ۷، العباس ص ۲۲-۲۳، ہاشم وامیہ ص ۱۶۷، الکشاف ج ۱ ص ۴۴۸، ج ۲ ص ۱۰، تذکرۃ الخواص ص ۹، معجم القبور ص ۱۸۶، مناقب ص ۳۴، دیوان ابوطالب ص ۷، اعیان الشیعہ ج ۳۹ ص ۱۲۸، الحلبیہ ج ۱ ص ۳۲۲، اصابہ ج ۴ ص ۱۱۲، البحر ص ۶۳، شیخ الابطح ص ۲۷، الغدیر ج ۷ ص ۳۳۴ (تھوڑے تھوڑے اختلاف کے ساتھ)

ہوئے یہ ظاہر کرتے ہیں کہ تمہیں کوئی تردد نہیں ہونا چاہیئے۔ ابھی تو ابوطالب جیسا معین و مددگار موجود ہے آخر کے اشعار میں اپنے ایمان و عقیدہ کی بات بھی واضح کر دی:

"میرا ایمان۔ معرفت، تحلیل، تحقیق اور تجزیہ کا ایمان ہے۔ یہ تقلید اور رسوم و عادات کا ایمان نہیں ہے۔"

پھر آخری شعر میں تو یہاں تک بتا دیا کہ میری بصیرت تمام ادیانِ عالم کا جائزہ لے رہی ہے اور میں دیکھ رہا ہوں کہ عالم کے ان بے شمار ادیان میں محمدؐ کا دین سب سے بہتر ہے۔

بظاہر آپ کے آخری شعر میں کلمہ مِنْ سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ آپ کی نظر میں محمدؐ کا دین اچھے دینوں میں سے ایک ہے لیکن یہ غلط ہے اس لئے کہ اس مقام پر اس کلمہ کا استعمال صرف ضرورتِ شعریہ کی بناء پر ہوا ہے ورنہ آپ کی بصیرت واقعیت و حقیقت کا جائزہ لینے میں معراجِ کمال پر تھی۔

خدا برا کرے اس ضرورت شعریہ کا کہ اس کی وجہ سے کتنے اچھے مطالب برباد اور کتنے برے مفاہیم اچھے بن جاتے ہیں۔

جب خواہش اور نفس پرستی نے دیکھ لیا کہ حضرت ابوطالبؑ کے ان اشعار سے ایمانِ کامل اور عقیدۂ راسخ کا اظہار ہوتا ہے اور ہمارے تمام ہفوات و خرافات پامال ہوتے جا رہے ہیں تو فوراً اس بات پر کمر باندھ لی کہ ان ایمان افروز اور عقیدہ پرور اشعار کو تباہ و برباد کر دیا جائے تاکہ حضرت ابوطالبؑ کا ایمان محکم اور عقیدۂ مستحکم کسی نہ کسی طرح مشکوک بن جائے۔

چنانچہ ایمان کی نورانیت، عقیدہ و اقرار کی عظمت کو بے رونق بنانے کے لئے ایک پانچویں شعر کا بھی اضافہ کر دیا گیا۔

لولا الملامة او حذاري سبة لوجدتني سمحاً بذاك مبينا

(اگر مجھے مذمت و ملامت کا ڈر نہ ہوتا تو میں اس پیغام کو کھل کر قبول کرتا ———)

آپ غور کریں گے تو آپ کو گزشتہ اشعار اور اس ایک شعر کے درمیان طرز ادا، اسلوب فکر کے اعتبار سے ایک عظیم فرق نظر آئے گا۔ السید احمد زینی دحلان نے بھی اس کا اعتراف کیا ہے، کہا ہے کہ:

"بعض حضرات کا خیال ہے کہ اس شعر کو ابوطالب کے کلام میں داخل کر دیا گیا ہے اور یہ

اُن کا نہیں ہے "۔[1]

لیکن اس کے باوجود اگر ہم ان غرض مند، خواہش پرست لغزلو کا ساتھ بھی دینا چاہیں تو ہمیں یہی نظر آئے گا کہ تیر نشانہ سے خطا کر گیا ہے اور مقصد حاصل نہیں ہو سکا ہے، اس لئے کہ اس شعر میں ایمان کے کھلم کھلا اعلان کی نفی کی گئی ہے اور ظاہر ہے کہ ایمان کا قبول نہ کرنا اور ہے اور اس کا علی الاعلان اظہار نہ کرنا اور۔

جب قریش نے رسول اکرمؐ اور رسالت عظمیٰ کے بارے میں حضرت ابوطالبؑ کے موقف کو دیکھ لیا اور یہ سمجھ لیا کہ ان کے ہوتے ہوئے کوئی اسکیم کامیاب نہیں ہو سکتی۔

اِن سے کہا گیا کہ بھتیجے کو روک دیں نہیں لڑکا۔

پھر کہا گیا کہ ہمارے حوالے کر دیں لیکن بجائے سپردگی کے اس کی ہمت بڑھانے لگے، اس کا دل بڑھانے لگے اور اس کی طرف سے جہاد و دفاع پر آمادہ ہو گئے

تو اب یہ طے پایا کہ عمارہ بن ولید جیسے حسین و جمیل جوانِ رعنا کو فدیہ قرار دے کر اپنا مقصد حاصل کریں۔ چنانچہ اسے لے کر حضرت ابوطالبؑ کے پاس آئے اور کہنے لگے۔

اے ابوطالب! یہ عمارہ عرب کا خوبصورت الشکیل اور شاعر جوان ہے، اسے لے کر اپنا بیٹا بنا لو اور محمدؐ کو ہمارے حوالے کر دو۔ ہم انھیں ختم کر دیں۔ اس لئے کہ انھوں نے تمہارے دین کی مخالفت کی ہے تمہارے باپ دادا کی دین کی مذمت کی ہے اور تمہاری جماعت میں تفرقہ ڈالا ہے۔

حضرت ابوطالبؑ اگر موقع شناس اور موقف کی نزاکت سے واقف نہ ہوتے تو اس بات پر ایسا قہقہہ لگاتے کہ ساری فضا گونج جاتی۔ لیکن کیا کہنا اس نباضِ فطرتِ انسان کا کہ اس نے نہایت ہی متانت سے جواب دیا:—

"خدا کی قسم بڑا خراب معاملہ ہے۔ میں تمہارے بچے کی پرورش کروں اور تم میرے بچےؐ کو قتل کر دو۔ خدا کی قسم یہ تو کبھی نہیں ہو سکتا۔"

---

[1] الغدیر ج ۷، ص۳۳۲ میں یہ جملہ اسنی المطالب سے نقل کیا گیا ہے لیکن افسوس کہ انھیں زینی صاحب نے سیرت نبویہ میں اس شعر کو بھی نقل کر دیا ہے اور وہاں کوئی تردید مذکور نہیں ہے ——— خدا جانے ان تناقضات کا منشا کیا ہے اسنی المطالب کے بیانات و مطالب کچھ اور ہیں اور سیرت کا انداز کچھ اور ہے۔

انحطاطِ فکر، ضعفِ کلام اور ظلم و حیفا کی یہ بے نظیر مثال ہے جس سے واضح ہے کہ پستی فکر کی کمزوری، موازین کی خرابی اور اقدار کی تباہی کا صحیح اندازہ ہوتا ہے۔

جب مطعم بن عدی بن نوفل بن عبد مناف کو یہ خبر ملی تو کہنے لگا: "اے ابوطالب! قوم نے تمہیں محمدؐ سے بچانے کی بہترین راہ بتائی ہے میرا خیال ہے اسے قبول کر لینا چاہیئے۔"

آپ نے جواب دیا۔ "خدا کی قسم یہ قوم ناانصاف ہے اور تم نے تو اور بھی غضب کر دیا اچھا اب جو چاہو کر لو"۔[1]

اِس مقام پر حضرت ابوطالبؑ نے ایک قصیدہ کہا ہے جس میں مطعم کے اس انحراف کا ذکر کیا ہے اس کے بعد عبد مناف کی تمام اولاد پر تعریض فرمائی ہے اور آخر میں سارے قریش کا تذکرہ کر دیا ہے فرماتے ہیں۔

الاقل لعمرو والولید ومطعم ... الالیت حظی من حیاطتکم بکر
من الخور حبحاب کثیر رغاؤہ ... یرش علی الساقین من بولہ قطر
تخلف خلف الورد لیس بلاحق ... اذا ما علا الفیفاء قیل لہ وبر
اری اخوینا من ابینا وامنا ... اذا سئلا قالا الی غیرنا الامر
بلی! لھما امر ولکن تجرجما ... کما جرجمت من راس ذی علق صخر
اخص خصوصا عبد شمس ونوفلا ... ھما نبذانا مثل ما ینبذ الجمر
ھما اغمزا للقوم فی اخویھما ... فقد اصبحا منھم اکفھم صفر
ھما اشرکا فی المجد من لا ابا لہ ... من الناس الا ان یرس لہ ذکر
وتیم ومخزوم وزھرۃ منھم ... وکانوا لنا مولا اذا بغی النصر
فواللہ لا تنفک منا عداوۃ ... ولا منھم ما کان من نسلنا شفر
فقد سفھت احلامھم وعقولھم ... وکانوا کجفر بئس ما صنعت جفر

---

[1] طبری ج ۲ ص۶۷، السیرۃ الحلبیہ ج ۱ ص۳۲۳، النبویہ ج ۱ ص۱۹۷، الشامیہ ج ۱ ص۲۸۶، الحدیدی ج ۲ ص۳۰۶، ابوطالب ص۶۱-۶۳، بحار ج ۶ ص۲۲۶، تذکرہ الخواص ص۱۹، الغدیر ج ۷ ص۳۶۰، اعیان الشیعہ ج ۳۹ ص۱۴۹

وماذالك الأسود نخضابه — اله العباد واصطفانا له الفخر

رجال تمالوا حاسدين وبغضه — لاهل العلى فيـنهم ابدا وتر

"وليد" ابوه كان عبدالجدنا — الى عجلة زرقاء جال بها السحر[1]

"کوئی عمرو ولید و مطعم سے کہہ دے کہ کاش میرے ساتھ تمہاری ہمدردیاں اسی مقدار میں ہوتیں جس طرح وہ اونٹ کا بچہ ہوتا ہے جو انتہائی ضعیف، لاغر، پستہ قد اور متواتر پیشاب کرنے والا ہوتا ہے۔ قافلہ کا ساتھ دینے سے عاجز ہو جاتا ہے۔ اور بالکل بلی کے برابر معلوم ہوتا ہے۔ افسوس ہمارے خاندان کے لوگ ہم سے بے تعلق کا اظہار کر رہے ہیں۔ حالانکہ ان کو ہم سے ربط ہے یہ انسانیت کے درجے سے اس طرح گر گئے ہیں جس طرح پہاڑ سے پتھر ہیں بالخصوص عبد شمس اور نوفل کو کہتا ہوں کہ انھوں نے ہمیں چنگاری کی طرح پھینک دیا ہے۔ انھوں نے دوسروں کے لئے ہم سے علٰحدگی اختیار کرلی ہے اور اب ہم سے خالی ہاتھ ہو گئے ہیں۔ انھوں نے بے شرف لوگوں کو ہمارے برابر کر دیا ہے۔ وہ لوگ جو اپنے شرف کا تذکرہ چپکے چپکے کرتے ہیں۔ یہ بنی تیم و مخزوم اور زہرہ کل تک ہمارے متبع اور خدام تھے۔ حقیقتاً یہ ہمارے عزیز بیوقوف ہیں۔ انھوں نے ہم سے واقعہ جعفر کی طرح غداری کی ہے اس لئے کہ اللہ نے ہمیں سرداری دے کر قابل فخر بنا دیا ہے یہ عبدالشمس وغیرہ سب مل کر ہم سے بغض و حسد کرتے ہیں اور اب تو یہ عداوت باقی رہے گی۔ یہ ولید کیا ہے۔ اس کا باپ مغیرہ تو ہمارے جد کا غلام تھا۔"

جب حضرت ابوطالبؑ نے اپنی رائے کا اعلان کر کے قریش کے موقف کا جائزہ لے لیا تو آپ نے مناسب یہ خیال کیا کہ قریش کے ہر مقابلے کے لئے تیاری شروع کر دیں۔ ظاہر ہے کہ اس وقت آپ کے پیش نظر سوائے بنی ہاشم اور بنی عبدالمطلب کے کوئی ایسا نہ تھا جو ان مشکلات کا مقابلہ کر سکے اور ایسے نازک موقع پر رسول اکرمؐ کے تحفظ کا بار اٹھا سکے۔

---

[1] ابن ہشام نے اس قصیدہ کو اپنی سیرت کے ج ۱ صـ۲۸۶ پر نقل کیا ہے لیکن یہ آخری تین شعر ترک کر دیئے ہیں۔ علامہ امینی مدظلہ نے الغدیر ج ۷ صـ۳۶۱ پر یہ اشعار نقل کئے ہیں اور فرمایا ہے کہ ان اشعار کے ترک کر دینے سے ابن ہشام کا مقصد بالکل واضح ہے۔

چنانچہ آپ نے بنی ہاشم کے بہادروں کو اس امر خیر کی شرکت کی دعوت دی اور سب نے قبول کر لیا۔ صرف ایک سر پھرا بھائی الگ رہ گیا۔ یعنی ابولہب۔ ابوطالبؑ جب بنی ہاشم کے جوانوں کی شان دیکھتے تھے تو چہرہ پر تبسم کے آثار نمودار ہو جاتے تھے۔ دل کو اطمینان و سکون ہو جاتا اور قلب کو سکون حاصل ہو جاتا تھا کہ اب میرا رسول تمام اشرار سے محفوظ رہے گا۔ اس کے ساتھ ہی ان بہادروں کے شکریے اور ان کی مدح میں رطب اللسان ہو جاتے تھے۔ ان کی تشجیع و تائید کرتے تھے۔ اور ان کے لئے ایک ایسا سرمایۂ ذکر مہیا کرتے تھے جو آئندہ نسلوں کی زبان پر جاری ہو اور جسے آنے والا زمانہ بھی سن سکے۔

ظاہر ہے کہ ایسے جوانوں کے تذکرے میں اس محمدؐ کا تذکرہ بھی انتہائی ضروری تھا جس پر فدا کاری کے لئے یہ سب آمادہ ہوئے تھے۔ جو اس شرافت کا مخزن اور اس بزرگی کا مرکز تھا جس کے کردار کی نہ اولین میں کوئی نظیر تھی نہ آخرین میں۔ چنانچہ آپ کے بعض اشعار یہ ہیں۔۔

اذا اجتمعت يوماً قريش لمفخر — فعبد مناف سرها وصميمها

فان حصلت اشراف عبد منافها — ففى هاشم اشرافها وقديمها

وان فخرت يوماً فان محمداً — هو المصطفىٰ من سرها وكريمها

اعدت قريش غثها وسمينها — علينا فلم تظفر وطاشت حلومها

وكنا قديماً لا نقر ظلامة — اذا ما ثنوا صعر الخدود نقيمها

ونحمى حماها كل يوم كريهة — ونضرب عن احجارها من يرومها

بنا انتعش العود الذواء وانما

باكنافنا تندى وتنمى اورومها

"اگر قریش میں کوئی بات قابل فخر ہے تو وہ عبد مناف ہیں۔
اور اگر عبد مناف میں کوئی بات ہے تو وہ بنی ہاشم میں ہے۔
اور اگر بنی ہاشم میں کوئی شے ہے تو وہ محمد مصطفےٰؐ میں ہے۔
قریش نے ہم پر ہر قسم کے حملے کئے لیکن کامیاب نہ ہو سکے۔ ان کی فکریں خطا کر گئیں۔
ہم نے کبھی ظلم برداشت نہیں کیا جب بھی کسی نے تکبّر سے کام لیا ہم نے اسے فوراً سیدھا کر دیا۔
ہم فضیلتوں کا تحفظ کرتے ہیں اور ان کی طرف سے دفاع کرتے ہیں۔
خزاں دیدہ شاخوں میں ہرا پن ہم سے آتی ہے جڑوں کی نشو و نما ہمارے کرم سے ہوتی ہے۔"

رسول اکرمؐ کی شوکت بڑھتی گئی اور اسی کے ساتھ ساتھ بنی ہاشم اور قریش کا اختلاف وسیع تر ہوتا گیا۔ اب ابوطالبؑ کو ہر آن کفارِ قریش سے ایک نئے خطرہ کا اندیشہ تھا۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ محمدؐ ایک آن کے لئے بھی ان کی نظروں سے اوجھل ہوں۔ اس لئے کہ یہ غیبت ان کے قلب نازنین میں ایک قلق و اضطراب اور ان کے خیالات میں ایک طوفان برپا کر دیتی تھی۔

اتفاقاً ایک دن محمدؐ ابوطالبؑ کی نظروں سے اوجھل ہو گئے، تلاش کیا نہ ملے۔ ابوطالبؑ کے دل میں اضطراب و تشویش کے ساتھ ہی انتقام و مقابلے کے جذبات کروٹیں لینے لگے۔ اس لئے کہ انھوں نے یہ بھی سن پایا تھا کہ قریش محمدؐ کو دھوکے سے قتل کرنے کی فکر میں لگے ہوئے ہیں۔

چنانچہ آپ نے جوانانِ بنی ہاشم کو بلایا اور سب کو حکم دیا کہ کپڑوں کے اندر اسلحہ چھپا کر ایک ایک سردارِ قریش کے پاس کھڑے ہو جائیں۔ پھر اِن کے لئے ایک اشارہ بھی معین کر دیا کہ اگر محمدؐ نہ مل سکے تو ان کا خون رائیگاں نہ جانے پائے گا۔ بلکہ اِن سب سے ان کا انتقام لیا جائے گا۔ اس لئے کہ یہ ایک خون تمام قریش کے خون پر بھاری ہے!

جوانانِ بنی ہاشم تلواریں سونت کر آمادہ ہو گئے۔ ہر ایک اپنی ڈیوٹی پر پہونچ گئے۔ اور حضرت ابوطالبؑ نے تلاش شروع کر دی۔ کیا دیکھا کہ ایک مقام پر محمدؐ صحیح و سالم موجود ہیں۔ آپ نے انھیں ساتھ لیا اور قریش سے خطاب کر کے فرمایا "تمہیں خبر ہے کہ اس وقت ہمارا ارادہ کیا تھا؟" یہ کہہ کر اپنے جوانوں کو حکم دیا کہ چمکتی تلواریں سامنے ظاہر کر دیں۔ تاکہ قریش کو بھی اِس اہتمام و انصرام کا اندازہ ہو جائے اور انھیں معلوم ہو جائے کہ محمدؐ کی حفاظت پر کتنی تلواریں اور کس قدر اسلحے ہیں۔ تلواروں کا چمکنا تھا کہ چہرے اتر گئے، ہوائیاں اڑنے لگیں اور ابوجہل ہکا بکا رہ گیا۔

پھر آپ نے اعلان کیا کہ "اگر آج تم نے محمدؐ کو قتل کر دیا ہوتا تو تم میں سے کوئی ایک

ؔ السیرۃ الشامیہ ج ا ص ۲۸۸، النبویہ ج ا ص ۲۰، الحلبیہ ج ا ص ۳۳۳، الحجۃ ص ۷۹–۸۰، اعیان الشیعہ ج ۳۹ ص ۱۴۹ (قدرے اختلاف کے ساتھ) الغدیر ج ۷ ص ۳۶۲–۳۶۳ پر صاحب اسنی المطالب کا یہ قول بھی مذکور ہے کہ یہ اشعار حضرت ابوطالب کا وہ شاہکار ہیں، جن سے ان کے ایمان و تصدیق پر روشنی پڑتی ہے۔ صاحب شیخ الابطح نے بھی ص ۳۷ پر ان اشعار کا ذکر کرنے کے بعد اس قول کو درج کیا ہے۔

بھی باقی نہ رہتا"۔ ؔ

اس کے بعد آپ نے وہ اشعار پڑھے جن میں محمدؐ کی عظمت کے ساتھ اپنی وفاداری اور نصرت کا بھی اعلان تھا۔

الا ابلغ قریشاً حیث حلت   وکل سرائر منها غرور
فانی والصوابح عادیات   وماتتلوا السفافرة الشهور
لآل محمد راع حفيظ   وبرد الصدر منی والضمير
فلست بقاطع رحمی وولدی   ولو جرت مظالمها الجرور
أيأمن جمعهم ابناء فهر   بقتل محمد؟ والعرز زور
فلا وابيك لا ظفرت قريش   ولا امت رشادا اذ تشير
بنی اخی ونوط القلب منی   وابيض ماؤه غدق كثير
ويشرب بعده الولدان ريا   واحمد قد تضمنه القبور
ايا ابن الانف انف بنی قصی
كان جبينك القمر المنير ؔ

"قریش جہاں بھی ہوں انھیں معلوم ہونا چاہئے کہ ان کے سب اسرار محض فریب اور دھوکا ہیں۔
دوڑتے ہوئے گھوڑے اور علما کے صحیفے گواہ ہیں۔
کہ میں دل و جان سے آلِ محمدؐ کا نگراں اور محافظ ہوں۔
کتنے ہی مظالم کیوں نہ پیش آئیں میں ان سے قطع تعلق نہیں کر سکتا۔
یہ فہر کی اولاد محمدؐ کے قتل کا ارادہ کر کے بہت بڑا کر رہی ہے۔
تمہاری جان کی قسم! قریش کامیاب نہ ہوں گے نہ ان کا ارادہ کوئی عقل مندی ہے
میرا بھتیجا، میرا رشتۂ حیات اور میرا فیاض و کریم بیٹا وہ ہے
جس کے مرنے کے بعد بھی آئندہ نسلیں اس سے سیراب ہوتی رہیں گی۔

ؔ الحجۃ ص ۹۱، الغدیر ج ۷ ص ۳۴۹، ص ۳۵۲، شیخ الابطح ص ۲۶، ۲۷، اثبات الوصیۃ ص ۹۶، ابوطالب ص ۶۱–۶۲
ؔ الغدیر ج ۷ ص ۳۵۰، اعیان الشیعہ ج ۳ ص ۱۴۹

اے قصیٔ کے خاندان کی آبرو، اے محمدؐ تیری پیشانی تو چمکتے چاند کی مانند ہے"

اسی قسم کا ایک واقعہ اور بھی ہے جب حضرت ابوطالبؑ نے اپنے غیظ و غضب کا اظہار کرتے ہوئے تمام قریش کو چیلنج کر دیا تھا کہ اور یہ وقت وہ تھا جب رسول اکرمؐ نماز میں مشغول تھے۔ عبد و معبود میں راز و نیاز ہو رہا تھا عالمِ بالا کی سیر تھی اور قریش نے یہ طے کیا تھا کہ ان کی نماز میں دخل دیا جائے۔ ان کی عبادت کا مذاق اڑایا جا سکے۔ ابن زبعری کو اِس کام کے لئے منتخب کیا گیا تھا۔ اِس نے بخوشی اِس خدمت کو قبول کر لیا تھا۔ اور جب رسولِ اکرمؐ سجدے میں تھے تو اس ملعون نے کافی غلاظت جمع کر کے سر پہ ڈال دی تھی۔ ظاہر ہے کہ آپؐ کے قلب پر اس اذیت کا اثر تمام تکالیف سے زیادہ تھا۔ اس لئے کہ اس میں ایک استہزاء و تمسخر کا پہلو بھی تھا۔ لیکن آپ کے پاس سوائے حضرت ابوطالبؑ کے کون تھا۔؟

آئے چچا کے پاس دلِ مضطرب، آنکھوں میں آنسو، چچا نے جیسے ہی یہ منظر دیکھا رگِ محبت پھڑکی، تلوار کاندھے پر رکھی اور غصّے کے عالم میں گھر سے نکلے قوم نے جیسے ہی یہ منظر دیکھا ایک مرتبہ فرار کا ارادہ کیا۔ آپ نے دور ہی سے آواز دی۔

" اگر قدم آگے بڑھے تو سر نہیں ہے" اکھڑے ہوئے قدم جم گئے، بھاگنے والے بدحواس ہو کر ٹھہر گئے۔ آپ رسولؐ اکرم کو ساتھ لئے ہوئے قریب پہونچے۔

" بیٹا! یہ کس نے کیا ہے؟

حضرتؐ نے ابن زبعری کی طرف اشارہ کیا۔ آپ نے پہلے تو اس کی ناک کو زخمی کیا اور پھر غلاظت منگا کر تمام قوم کے چہروں پر مل دی اور نہایت آرام کے ساتھ رسولؐ سے خطاب کیا۔

" کیوں بیٹے! خوش ہو گئے؟ ارے تم عبداللہ کے لال، شریف النسب اور عظیم المرتبت ہو۔ اچھا اے قریش والو! اب اگر کچھ کرنا چاہتے ہو تو اٹھو، میں بھی موجود ہوں اور تم تو مجھے پہچانتے ہی ہو۔[1]

یہ کہہ کر اشعار شروع کر دیئے۔

انت النبی محمّد — قوم اغرّ مسوّد
لمسودین اکارم — طابوا وطاب المولد

---

[1] الغدیر ج ۷ ص۳۵۹ شیخ الابطح ص۲۸، الحجۃ ص۱۰۱-۱۰۸، ثمرات الاوراق ج ۲ ص۴۳، ابوطالب ص۱۰۳، مناقب ص۲۵

نعم الارومة اصلها — عمرو الخطيم الارصد
هشم الربيكة في الجفان — وعيش مكة انكد
فجرت بذالك سنّة — فيها الخبيزة تثرد
ولنا السقاية للحجيج — بها يماث الانجد
والمازمان وماحوت — عرفاتها والمسجد
انى تضام ولم اَمت — وانا الشجاع العربد
وبطاح مكة لايرئ — فيها نجيع اسود
وبنوابيك كانهم — اسد العرين توقدد
ولقد عهدتك صادقا — في القول لا تتزيد
مازلت تنطق بالصواب
وانت طفل امرد[1]

" تم نبی محمدؐ ہو، تم بزرگ روشن پیشانی اور سردار ہو۔
تمہارے بزرگ بھی طیب و طاہر اور باعظمت تھے۔
اس خاندان کی اصل "حضرت عمرو" یگانہ روزگار تھے۔
انھوں نے مکّہ کی زبوں حالی میں لوگوں کو روٹیاں توڑ توڑ کر کھلائی تھیں۔
ان کے بعد سے یہ طریقہ سنّتِ مستمرہ بن گیا تھا۔
اسی خاندان میں حاجیوں کی وہ سقایت ہے جس میں زمزم کی کشمکش ڈالی جاتی ہے
عرفات، مشعر اور منیٰ کے درمیان کی بستیاں اِس وقت تک مطمئن ہیں
جب تک مجھ جیسا بہادر و زور آور زندہ ہے۔
اب مکّہ کی وادیوں میں سیاہ گھاس نظر نہیں آئے گی۔
اور تمہارے خاندان والے تو شیر بیشۂ شجاعت ہیں۔
میں نے تم کو بہت زیادہ صادق القول پایا ہے۔

---

[1] شرح النہج ج ۳ ص۳۱۵، الحجۃ ص۷۲، شیخ الابطح ص۲۸، ہاشم وامیہ ص۱۴۳، دیوانِ ابوطالبؑ ص۱۲، اعیان الشیعہ ج ۳ ص۱۴۳، الغدیر ج ۷ ص۳۳۶

آج ہی نہیں بلکہ بچپنے سے تمہیں سچا ہی پایا ہے۔"

حضرت ابوطالبؑ نے اس قصیدہ کے شروع میں نبوّت کا وہ کھلا ہوا اعلان کیا ہے جس میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں ہے۔ بھلا کیا فرق ہے "اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَسُوْلُ اللّٰه" میں اور "اَنتَ النَّبِیُّ مُحَمَّدٌ" میں !؟

حقیقت یہ ہے کہ دونوں نبوّت کے اعترافات ہیں اور دونوں میں سرِمو فرق نہیں ہے۔ لیکن کیا کیا جائے پست اغراض، سیاہ دل اور مُردہ ضمیر کا کہ، اس کی منطق، عقل وواقعیت کی منطق سے بالکل الگ ہے۔

آپ نے پہلے حضرت ہاشم کے اس جود وکرم کا تذکرہ میں جس سے مکہ کا قحط برطرف ہوا حاجی سیراب ہوئے۔ زندگی خوش حال ہوئی۔ دل مطمئن ہوئے۔ پیٹ کو سکون ملا اور سینوں کی آگ بجھی اس کے بعد بھتیجے کو اطمینان دلاتے ہوئے اعلان کیا کہ میری زندگی میں کسی اذیت و آزار کا تصور نہیں ہو سکتا۔ میں کوئی بزدل نہیں ہوں۔ میرے اطراف میں شیران بیشۂ شجاعت موجود ہیں۔

مقطع کلام میں پھر ایمان واعتراف کا اعلان کر دیا۔ تاکہ ابتدا و انتہا کی یکسانیت محفوظ رہے مقطع میں نبی کریمؐ کی اس صداقت کا اعلان بھی ہے جس کا تجربہ حضرت ابوطالبؑ نے ابتدائے عمر سے آج تک کیا ہے۔ اور جس پر انھیں مکمل اعتماد ہے۔

ظاہر ہے جو معمولی معمولی باتوں میں صداقت سے کام لے گا وہ حق کے خلاف نہیں کہہ سکتا۔ یا یوں کہا جائے کہ جو دنیا کی مخلوق پر افترا نہیں کرے گا وہ خالق عالم پر بہتان نہیں رکھ سکتا۔

یہی وہ بات ہے جس کو خلاصۂ ایمان کہا جاتا ہے۔ یعنی محمدؐ وہ امانت دار انسان ہے جس نے الٰہی پیغام میں نہ کوئی خیانت کی ہے اور نہ غلط بیانی۔ یہی اصلِ ایمان اور جوہرِ عقیدہ ہے۔

اس قصیدہ کے آخری اشعار میں نبوّت کی تصدیق کے ساتھ رسول اکرمؐ کی تائید و تشجیع کا عنوان بھی نمایاں طور پر نظر آرہا ہے۔ اس لئے ان پر پھر ایک نظر ڈالنے کی ضرورت ہے۔

علامہ ابن ابی الحدید ان اشعار سے پہلے دو شعر اور نقل کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ان اشعار کو حضرت ابوطالبؑ نے رسول اسلامؐ کا دل بڑھانے اور انھیں قوت پہنچانے کے لئے پڑھا تھا۔

لا یمنعنك من حق تقوم به
اید تصول ولا سلق با صوات

فان کفك کفی ان ملیت بهم
ودون نفسك نفسی فی الملمات[۱]

"آپ اپنی تبلیغ میں نہ کسی بات کا خیال کریں اور نہ کسی کے ہاتھ کا۔ میں آپ کے ساتھ ہوں، اگر فائدہ ہے تو آپ کا اور اگر قربانی کی ضرورت ہے تو میری جان کے لئے۔"

اس عظیم فداکاری اور اس انتہائی جود وکرم کا کیا کہنا کہ انسان مصیبت کے اوقات میں جان تک دینے پر آمادہ ہو جائے۔

یاد رہے کہ حضرت ابوطالبؑ کی نصرت کا تعلق محمدؐ کی ذات سے نہیں تھا۔ آپ ابتدائے امر سے رسالت کی امداد و حمایت کر رہے تھے۔ اس لئے آپ ہر اس شخص کی امداد کریں گے جو اس رسالت کا اعتراف کرے اور اسے اپنے دل میں جگہ دے

چنانچہ آپ کی زندگی کے اوراق پر ایسے عنوان بھی نمایاں ہیں۔ جہاں آپ نے مسلمانوں کی امداد کی ہے۔ اور چاہنے والوں کی جان بچائی ہے۔ جب کفار قریش نے دیکھا کہ عثمان بن مظعون جمحی نے تاریکیٔ کفر کو ترک کر کے فوراً ایمان کو اختیار کر لیا ہے اور پیغمبر اکرمؐ کی دعوت پر لبیک کہہ کر اسلام کے حلقہ بگوش ہو گئے ہیں تو انھیں گمراہ کرنے کے لئے طرح طرح کی اذیتیں دینا شروع کر دیں۔

حضرت ابوطالبؑ کو جب اس کی اطلاع ہوئی تو آپ نے غصے میں یہ اشعار پڑھے:۔

امن تذکر دهر غیر مامون — اصبحت مکتئبا تبکی کمحزون
امن تذکر اقوام ذوی سفه — یغشون بالظلم من یدعوا الی الدین
الا ترون اذل الله جمعکم — انا غضبنا لعثمان بن مظعون
و نمنع الضیم من یبغی مضیمتنا — بکل مطرد فی الکف مسنون
و مرهفات کان الملح خالطها — یشفی بها الداء من هام المجانین
حتی تقر رجال لا حلوم لها — بعد الصعوبة بالاسماح واللین

---

[۱] الحدیدی ج ۳ ص ۲۱۵، الغدیر ج ۷ ص ۳۳۸، الحجۃ ص ۷۴، ابوطالب ص ۳۳، دیوانِ ابوطالبؑ اعیان الشیعہ ج ۳۹ ص ۱۵۰

اوتو منوا بکتبِ منزلٍ عجب
علی نبیٍّ کموسیٰ او کذی النونِ [۱]

"اے عثمان کیا اس ناقابل اعتماد زمانہ کے خیالات سے آپ محزون و رنجیدہ ہو گئے ہیں
کیا آپ کو ان احمقوں کا خیال ہے جو ہر دعوت الی الحق والے انسان پر ظلم کرتے ہیں
اے قریش والو! خدا تمہیں ذلیل کرے، کیا تمہیں اس کی خبر نہیں کہ ہم عثمان کے ساتھ ہیں۔
اور ہم ہر پناہ گزین کی کمک کرتے ہیں۔ کبھی چمکتے ہوئے دھار دار نیزوں سے اور کبھی چمکتی
ہوئی نمک آلود تلواروں سے جو ان حماقتوں کا علاج کر سکیں اور جن سے یہ تشدد پسند
بے عقل لوگ نرمی کی راہ پر آ لگیں۔
یا تم اس کتاب عجیب پر ایمان لے آؤ جو موسیٰ اور ذوالنون جیسے نبی پر نازل ہوئی ہے"

مجھے کوئی بتائے کہ اس آخری شعر میں "کتابِ عجیب" سے مراد کیا ہے جس کا لانے والا موسیٰ و یونس جیسا نبی ہے۔ کیا یہ قرآن کریم کے علاوہ کوئی اور کتاب ہے۔ کیا اسے ایمان بالقرآن کے علاوہ کوئی اور نام دیا جا سکتا ہے۔؟

اس شعر سے تو یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابوطالبؑ سابقہ ادیان پر ایک مبسوط علم رکھتے تھے۔ اور اسی لئے آپ نے اس کتاب کو عجیب اور اس نبوت کو گزشتہ نبوتوں کے تسلسل سے تعبیر کیا ہے۔

اسی پر اکتفا نہیں بلکہ کفارِ قریش کو بھی اسی دعوت کے قبول کرنے پر مجبور کرتے ہیں اور صاف صاف کہہ دیتے ہیں کہ اب دو ہی راستے ہیں یا ایمان یا تلواریں!

قرآن کو عجیب کہنا کوئی نئی بات نہیں ہے۔ اس کی مثال خود قرآن کریم میں مومنین جنات کی زبانی موجود ہے۔

"انا سمعنا قرآناً عجباً یھدی الی الرشد فآمنا بہ"

وہ مومنین جو قریش کے پنجۂ استبداد میں گرفتار تھے اور طرح طرح کی اذیتیں برداشت کر رہے تھے ان میں سے ایک ابوسلمیٰ بن عبد الاسد المخزومی بھی تھے، ان کی نظر میں حضرت

---

[۱] الحدیدی ج ۳ ص ۳۱۳، الحجۃ ص ۵۰، الغدیر ج ۷ ص ۳۳۵، ہاشم و امیہ ص ۱۶۶ شیخ الابطح ص ۳۰ دیوان ابوطالب ص ۹، اعیان الشیعہ ج ۳۹ ص ۲۴۲

ابوطالبؑ کے سوا کوئی ایسا نہ تھا جو انھیں قریش کے شدائد و مصائب سے بچا سکتے، چنانچہ وہ بھی حضرت ابوطالبؑ کی پناہ میں آ گئے۔

جب بنی مخزوم کو معلوم ہوا کہ حضرت ابوطالب نے ایک مخزومی کو پناہ دے دی ہے تو وہ ایک وفد لے کر پہنچے اور کہنے لگے:-

"اے ابوطالب! آپ نے اپنے بھتیجے کو بچا لیا۔ خیر! آپ یہ ہمارے قبیلے والے سے کیا تعلق ہے"۔
آپ نے فرمایا: "یہ میرا بھانجا ہے۔ اس نے پناہ مانگی ہے۔ ظاہر ہے کہ بھانجے اور بھتیجے میں کیا فرق ہے"
یہ سننا تھا کہ ایک شور و غوغا برپا ہو گیا۔ ہنگامہ و طوفان کے آثار نمودار ہو گئے۔ وفد نے انجام کی خرابی پر نظر کی اور فوراً ناکامی کے ساتھ واپس ہو گیا [۱] (ابوسلمیٰ کے بھانجے ہونے کا راز یہ تھا کہ جنابِ ابوطالبؑ کی مادر گرامی مخزومیہ تھیں)۔

جناب ابوطالب نے اس واقعہ میں یہ بھی دیکھا کہ ابولہب نے آپ کی حمایت کی ہے چنانچہ آپ کے دل میں تبلیغی جذبات ابھرنے لگے۔ اور آپ نے چاہا کہ یہ بھی ہمیشہ میری طرح نبوت کی نصرت و امداد کرتا رہے۔ چنانچہ چند شعروں میں اسے بھی دعوتِ توحید دی۔

وان امرأ ابوعتیبہ عمہ — لفی روضۃ ما ان یسام المظالما
اقول لہ واین منہ نصیحتی — اباً معتب اثبت سوادک قائما
اکذبتم و بیت اللہ نبزی محمداً
ولما ترو الیوم الذی الشعب قائما [۲]

"سچ یہ ہے کہ جس کا ابوعتبہ جیسا چچا ہو، اسے تمام مظالم و مصائب سے مطمئن ہونا چاہیئے
مگر افسوس کہ ابولہب میری بات نہیں سنتا، کاش یہ اپنی حیثیت کو قائم رکھتا۔
ہم نے شعب میں محمدؐ کو تنہا نہیں چھوڑا تو اب کیا چھوڑیں گے۔؟"

حضرت ابوطالبؑ کا جہاد فقط رسولؐ اسلام اور بیکس مسلمانوں ہی سے دفاع میں منحصر نہیں تھا بلکہ آپ کے مجاہدات کا ایک پہلو اور بھی ہے اور وہ یہ کہ آپ اسلام کے ایک عظیم مبلغ اور پیغمبری مشن کے

---

[۱] شیخ الابطح ص ۲۹، الحدیدی ج ۳ ص ۲۰۶ السیرۃ الہشامیہ ج ۲ ص ۱۰، النبویہ ج ا ص ۲۵۶ اعیان الشیعہ ج ۳۹ ص ۱۲۰
[۲] الحدیدی ج ۳ ص ۲۰۷، السیرۃ الہشامیہ ج ۲ ص ۱۱، الحجۃ ص ۱۰۵، الغدیر ج ۷ ص ۲۹۲-۲۹۴

ایک بڑے کارکن تھے۔

کبھی آپ رسول اکرمؐ کی شخصیت کو اُجاگر کرتے تھے۔ کبھی اسلام کی عظمت کو ظاہر کرتے تھے۔ اور کبھی کفارِ قریش کو اسلام قبول نہ کرنے کے عواقب ونتائج سے ڈرایا کرتے تھے کہ شاید وہ بھی اِسی طرح اِسلام کے حلقہ بگوش بن جائیں۔

پھر انہی باتوں کو وہ اپنے اشعار میں نظم فرماتے تھے کہ آئندہ نسلیں بھی ان سے آشنا رہیں۔

قریش سے مختلف قسم کی اذیتیں، طرح طرح کی صعوبتیں سہنے کے بعد مسلمانوں نے حبشہ کا رُخ کیا۔ سردار قافلہ حضرت جعفر بن ابی طالبؓ تھے۔ جعفر کی ہجرت کے اسباب وہ نہیں تھے جن کی بناء پر عام طور سے ترکِ وطن کیا جاتا ہے اِن کی عظمت وہیبت کے لئے اتنا کافی ہے کہ وہ ابوطالب کے دلبند اور بنی ہاشم کے لال تھے، کس کی مجال تھی کہ انھیں آنکھ بھر کر دیکھ سکتا۔

حضرت جعفر کی ہجرت کا ایک اہم مقصد تھا۔ آپ سوچ رہے تھے کہیں ایسا نہ ہو کہ مسلمان غیر ملک میں جاکر اپنی ثقافت اور اپنا تمدن بھول جائیں لہٰذا ان کے ساتھ ایک ایسے شخص کو ہونا چاہیئے جو وقتاً فوقتاً انھیں ان کا پیغام یاد دلاتا رہے۔

لیکن خدا بُرا کرے ذِلّتِ نفس اور کورئ دل کا، کہ قریش نے فوراً عمرو بن عاص اور عمارہ بن ولید کو حبشہ کی طرف روانہ کردیا کہ جس غدّاری، عیّاری اور مکاری سے بھی ممکن ہوسکے قریش کے مقصد کو پورا کریں۔

حضرت جعفر کی بصیرت، دور اندیشی اور سلیم الفکری نے اِس سازش کو فوراً تاڑ لیا اور قریش کا تیر اُنھیں کی طرف پلٹا دیا۔

حضرت ابوطالب کو اس سازش کا علم ہوا تو آپ نے فوراً چند اشعار لکھ کر بادشاہ حبشہ نجاشی کے پاس روانہ کردیئے اور ان میں جعفر کی تعظیم وتکریم کی سفارش کرتے ہوئے عمرو بن عاص جیسے بے ایمان، مکار وافترا پرداز لوگوں کی بات نہ سننے کی طرف توجہ دلائی۔ آپ کے اشعار یہ تھے۔

الا لیت شعری کیف فی الناس جعفر
وعمرو واعداء النبی الاقارب

وھل نال احسان النجاشی جعفرا
واصحابه ام عاق عن ذاك شاغب

تعلم ابیت اللعن انك ماجد
کریم فلا یشقی علیك المجانب

تعلم بان الله زادك بسطة
واسباب خیر کلها بك لازب

"خدا جانے جعفر، عمرو اور بد بخت دشمنانِ نبی کس عالم میں ہیں؟
نہیں معلوم جعفر اور ان کے اصحاب کے ساتھ نجاشی نے اچھا سلوک کیا!
فریبی بیچ میں حائل ہوگئے۔
اے نجاشی تو بزرگ اور کریم ہے اب یہ بدمعاش تجھے خراب نہ کردیں۔
تجھے اللہ نے وسعت دی ہے تمام اسبابِ خیر تیرے پاس موجود ہیں۔"

ابوطالبؑ کے یہ اشعار نجاشی تک پہنچے اور وہ فرطِ مسرت سے بدہوش ہوگیا۔ حضرت ابوطالبؑ سے اس قسم کی تعریف کی کوئی توقع نہیں ہوسکتی تھی۔ اس نے طے کیا کہ اس احسان کا بدلہ صرف یہی ہے کہ ان محافظ والوں کے ساتھ اچھا سلوک کیا جائے اور ان کے اعزاز واکرام میں اضافہ کردیا جائے ـــــ حضرت ابوطالبؑ کو نجاشی کے اس ردعمل کی اطلاع بھی نہ ملی تھی کہ فوراً دینِ اسلام کی دعوت نامہ نجاشی کے نام روانہ کردیا۔

اتعلم ملك الحبش ان محمدا — نبی کموسیٰ والمسیح ابن مریم
اتی بالهدیٰ مثل الذی اتیا به — فکل بامر الله یهدی ویعصم
وانکم تتلونه فی کتبکم — بصدق حدیث لا حدیث الترجم
فلا تجعلوا لله ندا واسلموا — فان طریق الحق لیس بمظلم

وانك تاتیك منا عصابة
لقصدك الا ارجعوا بالتکرم[1]

بادشاہ حبشہ کیا تجھے خبر نہیں ہے کہ محمدؐ بھی موسیٰؑ وعیسیٰؑ بن مریم کی طرح نبی ہیں۔؟
یہ بھی اللہ کی طرف سے ہادی ہیں اور یوں بھی سارے انبیاء اسی کی طرف سے ہدایت کرتے ہیں۔
ان کا ذکر تم نے اپنی کتاب میں بھی پڑھا ہے یہ کوئی خیالی بات نہیں ہے
خدا را شرک کو چھوڑ کر مسلمان بنو، اس لئے کہ راہِ حق بالکل واضح ہے۔

---

[1] الحجہ ص۵۶، بحار ج ۶ ص۵۲۱، ایمان ابی طالب ص۱۸، شیخ الابطح ص۸۹، مجمع البیان ج ۷ ص۳۷، العیان ص۲۳، الغدیر ج ۷ ص۳۳۱، اعیان الشیعہ ج ۱۶ ص۱۰ (قدرے اختلاف کے ساتھ)

اور دیکھو جب ہماری کوئی جماعت تمہارے پاس آئے تو اس کا اکرام ضرور کرنا!"

ان اشعار سے صاف طور پر واضح ہوتا ہے کہ حضرت ابوطالبؑ اسلام کے مبلغ اکبر اور داعیِ اعظم تھے، اسی لئے آپ نے دینِ اسلام قبول کرنے اور نبی اکرمؐ کی تصدیق کرنے کے لئے دعوت نامہ بھیج دیا۔ اس کے علاوہ یہ اشعار آپ کے کمالِ علم و اطلاع پر بھی دلالت کرتے ہیں کہ آپ نے نبی اکرمؐ کے تذکرہ کا حوالہ دیا۔ آپؐ کی شریعت کا حضرت عیسیٰؑ و موسیٰؑ کی شریعت سے موازنہ کیا اور تمام انجیلوں کی نکتہ چینیوں کی تصدیق کو پیش بجا دشمنی کو ان کی انجیل کے حوالے سے بتایا کہ حضرت مسیحؑ ایک ایسے نبی کی بشارت دینے آئے تھے جس کا نام احمد ہوگا۔

اب اس کے بعد کتنی سفاہت و حماقت ہے کہ حضرت ابوطالبؑ کو غیر مسلم کہا جائے ــــ!

بھلا وہ انسان جو تمام دنیا کو مسلمان بنائے۔
کفر و جہالت کی تاریکیوں سے نکال کر نورِ اسلام میں لے آئے۔
باطل کے راستے سے ہٹا کر صراطِ مستقیم پر لگائے۔
وہ خود کفر و جہالت کی تاریکیوں میں رہ جائے گا۔؟ (العیاذ باللہ) یہ تو محض جہالت اور خالص گمراہی کی باتیں ہیں۔

حضرت ابوطالبؑ اس ایمانِ محکم اور عقیدۂ راسخہ کے علاوہ معجزات کی تصدیق بھی کیا کرتے تھے معجزہ ایک ایسی دلیل ہے جس پر ضعیف العقل اور سادہ لوح عوام بھی ایمان لاسکتے ہیں چہ جائیکہ ابوطالب جیسا کامل العقل، راجح الفہم، مدبّر و مفکر انسان۔

واقعہ یہ ہوا کہ ایک مرتبہ ابوجہل ایک پتھر لے کر پیغمبر اکرمؐ کے قریب آیا کہ حالتِ سجدہ میں آپ پر پھینک دے۔ لیکن شانِ خدا کہ وہ پتھر اس کے ہاتھ میں چپک گیا اور مٹھی اس طرح بند ہو گئی جس طرح سیکڑوں برس بخیل کی مٹھی! بلکہ اس سے بھی بدتر۔ اب تو دل پریشان ہو گیا۔ ہمت پست ہو گئی، حواس اڑ گئے۔ ارادہ متزلزل ہو گیا۔ آنکھوں کے نیچے اندھیرا آ گیا۔ قدم ڈگمگانے لگے۔ اور دماغ معطل ہو گیا۔

حضرت ابوطالبؑ نے صفحۂ تاریخ پر اس عناد و عداوت کے انجام کا مطالعہ کیا اور یہ طے کر لیا کہ اگر قوم کی یہی حالت رہی تو ایک دن یہ قوم بھی صالحؑ کی قوم کی طرح ہلاک و برباد ہو جائے گی چنانچہ آپ نے قوم کو ان خطرات کی طرف متوجہ کرتے ہوئے فرمایا: ــــ

افیقوا بنی عما و انتھوا   عن الغی فی بعض ذی المنطق[۱]
و الا فانی اذا خائف   بوائق فی دارکم تلتقی
تکون لغابرکم عبرۃ   و رب المغارب و المشرق
کما ذاق من کان قبلکم   ثمود و عاد فمن ذا لقی
غداۃ اتتھم بھا صرصر   وناقۃ ذی العرش اذ تستقی
فحل علیھم بھا سخطۃ"   من اللہ فی ضربۃ الارزق
غداۃ بعض بعرقوبھا   حسام من الھند ذو رونق
واعجب من ذاک فی امرکم   عجائب فی الحجر الملصق
بکف الذی قام فی جنبہ
الی الصابر الصادق المتقی
فاثبتہ اللہ فی کفہ   علی رغم ذا الخائن الاحمق

قوم والو! ہوش میں آؤ۔ اپنی یہ جاہلانہ منطق ترک کردو
ورنہ مجھے تمہارے سروں پر آفتیں منڈلاتی نظر آتی ہیں۔
خدارا گزشتہ واقعات سے عبرت حاصل کرو۔
آخر تم سے پہلے قوم عاد و ثمود پر عذاب نازل ہو چکا تھا۔
جب ان لوگوں نے اس ناقہ کے پیر کاٹ ڈالے تھے۔
اس سے زیادہ تعجب خیز یہ ہے کہ پتھر ہاتھ میں چپک کر رہ گیا۔
اس کے ہاتھ میں جو ایک صابر، صادق، متقی انسان کے پہلو میں اسے مارنے کیلئے کھڑا ہوا تھا۔
اس خائن و احمق کے علی الرغم اللہ نے اسے اسی کے ہاتھ میں چسپاں کر دیا۔

اس قصیدہ میں حق و صداقت کی ترجمانی کے علاوہ ایک شفقت و رحمت کا انداز بھی نظر آتا ہے۔ گویا آپ چاہتے ہیں کہ قوم اپنی گمراہیوں سے نکل آئے اور عذاب میں مبتلا نہ ہو اور یہ وہ انسانی ہمدردی ہے جو ہر ایک کے دل میں نہیں ہوتی۔ آپ اپنے کلام کو دل نشین بنانے کے لئے قوم

۱؎ الحجۃ صـ۶۲، الحدیدی ج ۳ صـ۳۱۴، الغدیر ج ۷ صـ۳۳۶، اعیان الشیعہ ج ۳۹ صـ۱۲۲، دیوان ابوطالب صـ۹ (قدرے اختلاف کے ساتھ)

صالحؑ کی مثال دے کر فرماتے ہیں کہ نبی کی مخالفت کرنے سے سب کے سب تباہ ہو گئے۔ اب اگر یہ بھی ایسا کریں گے تو ان کا بھی یہی انجام ہوگا' اس لئے کہ اللہ نے نبی کا معجزہ ظاہر کر دیا ہے اور احمق کے ہاتھ میں پتھر چمک چکا ہے۔

حضرت ابوطالبؑ کی شانِ تحفظ' دعوتِ اسلام کا انتشار' معاشرہ کے ایک طبقے کا حلقہ بگوش اسلام ہو جانا' مسلمانوں کا جان و مال کی قربانی کے لئے آمادہ ہونا۔ تحفظِ دین کے لئے مختلف اذیتیں طرح طرح کی مشقتیں اور رنگ برنگ کے زحمات قبول کرنے پر تیار ہو جانا۔ یہی وہ باتیں تھیں جنہوں نے مشرکین کی نیند حرام کر دی تھی۔

مسلمانوں کا یہ عالم تھا کہ نعمت پر رنج و الم کو' عزت پر ذلت و خواری کو اور سایہ پر تمازتِ آفتاب کو ترجیح دے رہے تھے۔ کوئی کلمہ زبان پر ایسا نہیں آتا تھا۔ جس سے مشرکین کی ڈھارس ہو۔ وطن ترک ہو رہے تھے۔ مکان چھوڑے جا رہے تھے اور احباب کا فراق گوارا کیا جا رہا تھا۔ صرف اس لئے کہ دین سالم رہ جائے۔

ظاہر ہے کہ ان حالات میں قریش کی کیا کیفیت ہو گی۔ ساری فکریں' تمام تدبیریں اور کل حیلے اسی بات میں صرف ہو رہے تھے کہ اسلام کی بساط لپیٹ دی جائے۔ اس کی آواز دبا دی جائے اور دلوں سے اس کے جذبات نکال دیئے جائیں۔ لیکن یہ سب ہو تو کیسے ہو۔؟ اب تک کی ساری تدبیریں اب تک کے سب حیلے بیکار ہو چکے ہیں۔ اب وہ کون سی صورت ایسی ہو جس سے اپنے دل کی پیاس بجھائی جا سکے۔ مصیبت بالائے مصیبت یہ ہے کہ اسلام کے انتشار کے ساتھ ہی ساتھ اپنی قدیم ریاست و قیادت بھی ہاتھ سے نکلی جا رہی ہے جس قدر اس شعلے کو دبانا چاہتے ہیں' لپیٹ بڑھتی جا رہی ہے جتنا اس کی آواز کو خاموش کرنا چاہتے ہیں گونج میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے جس قدر بھی اس شجرۂ طیبہ کو خزاں رسیدہ بنانا چاہتے ہیں' برگ و بار بڑھتے ہی جا رہے ہیں۔

حالت یہ ہو گئی ہے کہ اگر ایک خون بہہ جائے تو اس کے ہر قطرہ سے ہزار تلواریں پیدا ہو جائیں گی۔ ایک اقدام ہو جائے تو سینکڑوں جذبات برانگیختہ ہو جائیں گے۔

خون ریزی اس لئے مناسب نہیں ہے کہ نبیؐ کے چاہنے والے اس داستان کو اور بھی رنگین بنا دیں گے۔ اسلام کو مظلومی کے نام پر پروان چڑھائیں گے۔ موقف سخت معاملہ نازک اور حالات بہت زیادہ خطرناک ہو چکے ہیں۔ آخر کیا کیا جائے؟

ابھی یہ فکر باقی تھی کہ ایک ابلیس کا مشورہ آ گیا۔ ان مسلمانوں کو اقتصادی مار دی جائے

ان کی زندگی تلخ کر دی جائے۔ ان کا دانہ پانی بند کر دیا جائے یہی وہ سرد جنگ ہو گی جس میں جان و مال کی تباہی نہ ہو گی۔ اور مسلمان مشکلات سے گھبرا کر دینِ اسلام ترک کر دیں گے۔ یا کم از کم محمدؐ کا ساتھ چھوڑ دیں گے۔ اور اس طرح محمدؐ کی جان ایک منہ کا نوالہ بن جائے گی۔

یہ طے ہو گیا۔ عہد نامہ لکھ دیا گیا۔

دفعات یہ ہیں:—

بنی ہاشم اور مطلب کے مقابلہ میں سب متحد رہیں۔

ان سے صلح نہ کریں۔

ان سے شادی بیاہ نہ کریں۔

ان سے خرید و فروخت نہ کریں۔

ان پر کسی قسم کی رحم دلی اور سہولت کا اظہار نہ ہونے دیں۔ یہاں تک کہ محمدؐ ہمارے حوالے کر دیئے جائیں اور ہمارا منصوبہ کامیاب ہو جائے۔

کاغذ مرتب ہو گیا مہر لگا دی گئی اور اس کا ایک نسخہ خانہ کعبہ میں معلق کر دیا گیا۔ (یہ واقعہ بعثت کے سات سال بعد ماہ محرم میں پیش آیا ہے)

ابوطالبؑ کے کان میں یہ بات پہنچی۔ انھیں قریش کی اس پستی' سفالت اور وحشیت و بربریت کا علم ہوا اور زبان پر اشعار جاری ہو گئے۔ آپ نے چاہا کہ قریش کو ان کے اس عمل کا انجام بتا دیں اور انھیں ان آنے والے واقعات سے مطلع کریں جن سے وہ بالکل بے خبر ہیں۔ آپ نے ایک مکمل قصیدہ انشا کیا جس کے بعض اشعار یہ ہیں:—

یرجون منا خطۃ دون نیلہا　　ضراب و طعن بالوشیج المقوم

یرجون ان نسخیٰ بقتل محمدٍ　　ولم تختضب سم العوالی من الدم

کذبتم و بیت اللہ حتیٰ تفلقوا　　جماجم تلقی بالحطیم و زمزم

وتقطع ارحام وتنسیٰ حلیلۃ　　حلیلا ویغشی محرم بعد محرم

علی ما مضیٰ من مقتکم و عقوقکم　　و غشیانکم فی امرکم کل مأثم

لظلم نبیٍّ جاء یدعو الی الھدیٰ　　و امرٍ اتیٰ من عند ذی العرش قیم

فلا تحسبونا مسلمیہ فمثلہ　　اذا کان فی قوم فلیس بمسلم[1]

---

[1] النہج الحدیدی ج ۲ ص ۲۱۲، [2] الحجہ ص ۴۷، [3] الغدیر ج ۷ ص ۳۳۳، [4] ایمان ابی طالب ص ۱۳، [5] ہاشم و امیہ ص ۱۴۰، [6] اعیان الشیعہ ص ۲۹

قریش کا مقصد اس وقت تک حاصل ہو نہیں سکتا جب تک شمشیر و سناں درمیان میں نہ آجائیں
یہ چاہتے ہیں کہ ہم محمدؐ کو ان کے حوالے کر دیں۔ حالانکہ ابھی نیزے خون سے رنگین نہیں ہوئے ہیں
خدا کے گھر کی قسم یہ خیال غلط ہے، جب تک کہ سر شگافتہ نہ ہو جائیں۔
اور قرابت کا خیال ختم نہ ہو جائے اور عورتوں اور شوہروں میں جدائی نہ ہو جائے اُس
وقت تک یہ کچھ نہیں ہوگا۔
یہ سب کیوں ہوگا۔ ان عداوتوں، نافرمانیوں اور مکاریوں کی بناء پر
جن سے صاحبِ ہدایت، رسولِ خدا۔ انسان پر ظلم کیا گیا ہے۔
یاد رکھو ہم محمدؐ کو تمہارے حوالے نہیں کریں گے بھلا کوئی قوم ایسے انسان کو بھی موت کے
منہ میں دے سکتی ہے؟

اس قصیدہ میں حضرت ابوطالبؑ نے جس تحدّی اور چیلنج سے کام لیا ہے وہ کسی طرح محتاجِ بیان نہیں۔

آخری دو شعروں کے پہلے شعر میں ایمان کی روشنی اور عقیدہ کی ضوباری ہے
محمدؐ نبی ہیں۔ ان کی دعوت ہدایت ہے۔ اس کا حکم قیم ہے اور مستحکم۔ ان کا بھیجنے والا
صاحبِ عرش ہے۔

اور دوسرے شعر میں دفاعی قوت کا مظاہرہ، حفاظتی تدابیر کی فراوانی ہے جس قوم میں محمدؐ جیسا انسان موجود ہو۔ وہ کیوں کر اس عزت و شہرت سے دستبردار ہو سکتی ہے؟

مسلمانو! سچ بتاؤ اگر ان عقائد کے بعد بھی ابوطالبؑ کافر ہیں تو اسلام کے معنی کیا ہیں۔؟

کیا تمہارے اسلام میں ان عقائد کے علاوہ کوئی اور شئے بھی داخل ہے؟ کیا اعترافِ رسالت کا اس سے بہتر بھی کوئی عنوان ہو سکتا ہے؟

اِس کے بعد حضرت ابوطالبؑ نے وہ تدبیریں شروع کیں جن سے مسلمانوں کی جان بچائی جا سکے اور کچھ سوچ کر جوانانِ بنی ہاشم و مطلب کو بلایا اور مشورہ دیا کہ سب کے سب شعب ابی طالب میں پناہ لیں[۵۱] اور قریش کے شر سے اپنی حفاظت کریں سب نے بسر و چشم اس مشورہ کو قبول کیا اور شعب کی طرف روانہ ہو گئے: صرف ایک بدبخت بھائی ابولہب رہ گیا جس نے قریش کا ساتھ دینا شروع کر دیا۔

---

۵۱ معجم البلدان ج ۵ ص ۲۷۔ ج ۳ ص ۳۴۷

دن گزرتے رہے۔ اب نہ اُمید کی کوئی کرن نظر آتی ہے۔ اور نہ آسائش کی کوئی شعاع۔ تلخیاں ہیں، شدائد ہیں۔ مصائب ہیں۔ بھوک ہلاک کرنے پر آمادہ ہے۔ فلاکت چہرہ سے جھلک رہی ہے قریش کسی رحم پر آمادہ نہیں ہیں اور نوبت یہاں تک پہونچ چکی ہے کہ درختوں کے پتّوں پر گزارہ ہو رہا ہے[۵۲]

ان تمام شدائد و مصائب کے علاوہ حضرت ابوطالبؑ کی شب بیداری کا عالم یہ ہے کہ تمام رات جاگ کر گزارتے ہیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ بھتیجے کے خلاف کوئی سازش ہو گئی ہو۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ کوئی بدبخت بدطینت انسان اس سراجِ منیر کو خاموش کر دے۔

اِدھر رات ہوئی تاریکی چھائی، سونے کا وقت آیا، اُدھر محافظِ شب بیدار اُٹھا۔ بھتیجے کو ایک بستر پر لٹایا، بیٹے کو دوسرے بستر پر، تھوڑی رات گزری بستر تبدیل کیا۔ اور بیٹے کو بھتیجے کی جگہ لٹا دیا، تاکہ اگر کوئی حملہ ہو جائے، دشمن شب خون مارے تو بیٹا قربان ہو جائے اور صاحبِ رسالت بچ جائے۔

دشمنوں سے حضرت ابوطالبؑ کا یہ جہادِ مسلسل اور دفاعِ پیہم نہ دیکھا گیا تو آخر کار یہ افسانہ تراش لیا کہ یہ تمام قربانیاں قرابت کی بناء پر تھیں۔

میں پوچھتا ہوں کہ کیا ابوطالب کا رشتہ محمدؐ سے علیؑ کی نسبت زیادہ قوی و قریب تھا کہ علیؑ کو محمدؐ کا فدیہ بنا رہے تھے!

کیا دنیائے عقل و ہوش کی نظر میں دین کا رشتہ قرابت سے زیادہ مضبوط اور مستحکم نہیں ہوتا کیا مذہب کی خاطر اعزاء و اقارب کو ترک نہیں کیا جاتا۔ اگر ایسا ہے تو پھر حضرت ابوطالبؑ نے محمدؐ کے رشتے کا خیال و لحاظ کیوں کیا اور انھیں کفّار کے حوالے کیوں نہ کر دیا۔

کیا ہمارے سامنے ابولہب کی مثال نہیں ہے۔ جس نے اپنے عقیدہ کے تحفظ کے سامنے محمدؐ کی قرابت داری کا کوئی پاس و لحاظ نہیں کیا۔

کیا تاریخ میں اُن مسلمانوں کا تذکرہ نہیں ہے۔ جنھوں نے صرف اختلافِ مذہب کی بناء پر اپنے باپ اور بیٹے کو تہ تیغ کرنے کا قصد کر لیا تھا۔

ایک رات کا واقعہ ہے کہ حضرت ابوطالبؑ نے حضرت علیؑ کا ہاتھ پکڑ کر حضرت محمدؐ کے بستر پر لٹانا چاہا تو آپ نے عرض کی بابا اب تو میں قتل ہو جاؤں گا۔ حضرت ابوطالبؑ نے دلاسہ دیا اور کہا

---

۵۲ الطبری ج ۲ ص ۲۲۷، کامل ج ۲ ص ۵۹، السیرۃ الہشامیہ ج ۱ ص ۳۷۵، النبویہ ج ۱ ص ۲۷۳، الحلبیہ ج ۱ ص ۳۳۴، الحدیدی ج ۳ ص ۳۰۷، الغدیر ج ۷ ص ۳۶۳

بیٹا موت تو انسان کی ترقی کا پہلا زینہ ہے میں نے تمہیں محمدؐ کا فدیہ قرار دیا ہے لہٰذا صبر کرو۔

امیرن یابنی إن الصبر احجی — کل حی مصیرہ لشعوب
قد بذلناک والبلاء شدید — لفداء الحبیب وابن الحبیب
لفداء الاغر ذی الحسب الثاقب — والباع والکریم النجیب
ان تصبک المنون فالنبل تبری — فمصیب منھا وغیر مصیب

کل حی وان تملی بعمر
آخذ من مذاقھا بنصیب

بیٹا صبر کرو، صبر زیادہ مناسب ہے اور مرنا تو سب ہی کو ہے۔
میں نے تم کو سختیوں میں اپنے محبوب بھائی کے لال کا فدیہ قرار دیا ہے۔
یہ فرزند روشن پیشانی، صاحبِ حسب اور کریم و نجیب ہے۔
اگر تمہیں موت بھی آجائے تو کیا؟ تیروں کا خاصہ ہی یہ ہے کہ بعض خطا کر جاتے ہیں اور بعض نشانے پر بیٹھ جاتے ہیں۔
انسان کتنی ہی مدت کیوں نہ زندہ رہے آخر موت کا مزا چکھنا ہے۔

— یہ سننا تھا کہ حضرت علیؑ کی رگِ شجاعت پھڑک اٹھی۔ عرض کی باباجان:

أتامرنی بالصبر فی نصر احمد — وواللہ ماقلت الذی قلت جازعا
ولکننی احببت ان تری نصرتی — وتعلم انی لم ازل لک طائعا

ساسعی لوجہ اللہ فی نصر احمد
نبی الھدی المحمود طفلا ویافعاؑ

آپ مجھے محمدؐ کی نصرت میں صبر کا حکم دیتے ہیں۔ میں نے یہ بات خوف سے تھوڑی کہی تھی میں نے تو اپنی نصرت کا اظہار کیا تھا تاکہ آپ مجھے اپنا فرمانبردار خیال کریں۔
میں رسولِ خدا محمد مصطفیٰؐ کی نصرت میں برابر سعی کرتا رہوں گا۔ اس لئے ان کا ماضی حال سب روشن اور پسندیدہ ہے۔

ؑ شرح النہج ج ۳ ص ۳۱۰، مناقب ج ۱ ص ۳۷، الحجۃ ص ۲۰، الغدیر ج ۷ ص ۳۵۸، اعیان الشیعہ ج ۳۹ ص ۱۳۰، السیرۃ النبویہ ج ۱ ص ۲۷۶، الحلبیہ ج ۱ ص ۳۳۸، ابوطالب ص ۲۳، دیوان ابوطالب ص ۹ (قدرے اختلاف کے ساتھ)

شعبِ ابوطالبؑ میں جناب ابوطالبؑ کی زندگی کا ایک مزید مشغلہ یہ بھی تھا کہ جب جذبات برانگیختہ ہوجاتے تھے، غم والم فکری ہیجان پیدا کرتے تھے تو کچھ غم انگیز اور ولولہ خیز قسم کے اشعار نظم کرتے تھے۔

الا ابلغا عنی علی ذات بینھا — لؤیا وخصا من لؤی بنی کعب
الم تعلموا انا وجدنا محمدا — نبیا کموسیٰ خط فی اول الکتب
وان علیہ فی العباد محبۃ — ولاحیف فی من خصہ اللہ بالحب
وان الذی رقشتم فی کتابکم — یکون لکم یوما کراغیۃ السغب
افیقوا افیقوا قبل ان تحفر الزبی — ویصبح من لم یجن ذنبا کذی ذنب
ولا تتبعوا امر الغواۃ وتقطعوا — اواصرنا بعد المودۃ والقرب
وتستجلبوا حربا عوانا وربما — امر علی من ذاقہ حلب الحرب
فلسنا وبیت اللہ نسلم احمدا — لعزاء من عض الزمان ولا کرب
ولما تبن منا ومنکم سوالف — وایدٍ اترت بالمھندۃ الشھب
بمعترک ضنک تری کسر القنا — بہ والضباع العرج تعکف کالشرب
کان مجال الخیل فی حجراتہ — ومعمعۃ الابطال معرکۃ الحرب
الیس ابونا ھاشم شد ازرہ — واوصیٰ بنیہ بالطعان وبالضرب
ولسنا نمل الحرب حتی تملنا — ولا نشتکی مما ینوب من النکب

ولکننا اھل الحفائظ والنھیٰ
اذا طار ارواح الکماۃ من الرعبؑ

(ارے میرا یہ پیغام لوی اور بالخصوص بنی کعب تک پہونچا دو۔
کیا تمہیں نہیں معلوم کہ محمدؐ بھی موسیٰؑ کی طرح نبی ہیں اور ان کا ذکر سابقہ کتب میں موجود ہے
ان کی محبت لوگوں کے دل میں ہے اور یہ اللہ کا عطیہ ہے اس میں کیا جائے دم زدن ہے۔

ؑ النہج الحدیدی ج ۳ ص ۳۱۳، السیرۃ الشامیہ ج ۱ ص ۳۷۹، الحجۃ ص ۳۹، ہاشم وامیہ ص ۱۷۳، ایمان ابوطالب ص ۱۵، مناقب ج ۱ ص ۳۶، شیخ الابطح ص ۳۶، الغدیر ج ۷ ص ۳۳۳، اعیان الشیعہ ج ۳۹ ص ۱۲۱-۱۲۵ (سب قدرے اختلاف کے ساتھ)

یہ جو تم نے معاہدہ لکھا ہے یہ ایک دن سخت مصیبت بن جائے گا
ہوش میں آؤ ہوش میں آؤ' ایسا نہ ہو کہ گنہگاروں کے ساتھ بے گناہ بھی پس جائے۔
ان گمراہوں کے چکر میں نہ آؤ' ۔ اور اپنی محبت اور قرابت داری کو قطع نہ کرو۔
دیکھو مسلسل جنگ کا انتظام نہ کرو اس لئے کہ جنگ کا مزہ بہت تلخ ہوتا ہے۔
خدا کے گھر کی قسم ہم محمدؐ کو زمانہ کے ہاتھوں میں نہیں دیں گے۔
ابھی تو نہ گردنیں کٹی ہیں' نہ چمکتی تلواروں کے اٹھانے والے ہاتھ اٹھے ہیں۔
ابھی نہ گھمسان کی جنگ ہوئی ہے اور نہ بجوؤں نے مقتولین کی لاشوں پر اجتماع کیا ہے
ایسا معرکہ جس میں گھوڑوں کی دوڑ ہو اور پہلوانوں کا شور و غوغا۔
کیا ہمارے بزرگ جناب ہاشم نے اس کی تائید نہیں کی ہے اور کیا انھوں نے اپنی اولاد کو حرب و ضرب کی وصیت نہیں کی ہے ؟
یاد رکھو! ہم نہ تو جنگ کرنے سے خستہ ہوتے ہیں اور نہ زمانے کے مشکلات کی شکایت کرتے ہیں ہماری فکر اس وقت بھی کام کرتی ہے جب پہلوانوں کے ہوش اُڑے ہوئے ہوتے ہیں۔)

ہمارے مدعا کے اثبات کیلئے اس قصیدہ کے ابتدائی اشعار بہت کافی ہیں۔ جن سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت ابوطالبؑ کو شریعتِ محمدیہؐ سے پہلے کی شریعتوں پر بھی مکمل عبور حاصل تھا اور اسی آپ نے رسولِ اکرمؐ کے کتبِ سابقہ میں تذکرہ کا حوالہ دیا ہے۔

اس قصیدہ میں اس قسم کے مختلف نکات پائے جاتے ہیں۔ جن سے آپ کے کامل ایمان اور راسخ عقیدہ پر روشنی پڑتی ہے لیکن ہمارا مقصد ان تمام نکات و جہات کا تذکرہ نہیں ہے۔ ہمارا دل یہ چاہتا ہے کہ اس مقام پر آپ کے ایک دوسرے قصیدہ کا اقتباس پیش کریں جو بظاہر اسی محاصرہ کے دوران لکھا گیا ہے:

الم تعلموا ان القطیعة مأثم   وامر بلاء قاتم غیر حازم[1]
وان سبیل الرشد یعلم فی غد   وان نعیم الدھر لیس بدائم
فلا تسفھن احلامکم فی محمد   و لا تتبعوا امر الغواة الاشائم

[1] الحدیدی ج ۳ ص ۳۱۳' الحجۃ ص ۹۳' شیخ الابطح ص ۳۹ الغدیر ج ۷ ص ۳۳۱' ایمان ابی طالب ص ۱۷
اعیان الشیعہ ج ۳۹ ص ۱۲۱

تمنیتم ان تقتلوہ ؟ وَ اِنما   اَمانیکم ھذی کاحلام قائم
وانکم واللّٰہ ! لا تقتلونہ
ولما تروا قطف اللحی والغلاصم

نوعمتم بأنا مسلمون محمداً   ولما نقاذف دونه ونزاحم
من القول مفضال ابیٌ علی العدی   تمکن فی الفرعین من آل ھاشم
اُمین حبیب فی العباد مسوّم   نجاتم رب قاھر فی الخواتم
یری الناس برھانا علیه وھیبة   وما جاھل فی قومه مثل عالم
بنی اتاہ الوحی من عند ربه
و من قال: لا، یقرع بھا سن نادم

کیا تمہیں خبر نہیں ہے کہ یہ بائیکاٹ غیر عاقلانہ اور ایک اچھی خاصی مصیبت ہے۔
کیا تمہیں نہیں معلوم کہ کل سیدھا راستہ معلوم ہو جائے گا اس لئے کہ دنیا کو بقا نہیں ہے
دیکھو! محمدؐ کے بارے میں بے وقوفی نہ کرو اور ان منحوس گمراہیوں کا ساتھ چھوڑ دو۔
تمہاری یہ تمنا کہ محمدؐ کو قتل کر دیں۔ ایک خوابیدہ انسان کے خواب سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی۔
خدا کی قسم محمدؐ اس وقت تک قتل نہیں ہو سکتے جب تک کہ سر اُڑتے ہوئے نظر نہ آئیں۔

"تمہارا خیال ہے کہ ہم بغیر کسی جنگ و جدال کے محمدؐ کو تمہارے حوالے کر دیں گے یہ غلط ہے۔
محمدؐ حق پرست صادق العقول اور بنی ہاشم کا نجیب الطرفین انسان ہے۔
یہ امین ہے' محبوبِ خلق ہے' اللہ کی طرف سے مہرِ نبوت کا حامل ہے۔
یہ وہ باہیبت انسان ہے جس کی صداقت کا برہان واضح ہے اور ظاہر ہے کہ جاہل و عالم برابر نہیں ہوتے۔
یہ وہی نبی ہے جس کے پاس وحی آتی ہے۔ آج جو اس کا انکار کرے گا اُسے ندامت کا منہ دیکھنا پڑے گا۔"

اس کلام میں پہلے آپ نے اس بائیکاٹ کی انجامی صورتِ حال سے آگاہ کیا ہے اور پھر اس کے بعد

ان تمام نتائج کو واضح کردیا ہے جو اس قطع تعلق پر مترتب ہونے والے تھے۔

"ہدایت کا راستہ واضح ہے، اس کے ثمرات کل روز حساب معلوم ہوں گے۔ دنیا کی نعمتیں فانی ہیں۔ ان کے لئے بقا و دوام نہیں ہے۔ زندگی کا راستہ کتنا ہی طولانی کیوں نہ ہو، آخر کار ایک دن اپنی آخری منزل تک پہونچتا ہے لہٰذا ان لوگوں کو جہالت و ضلالت سے باز آجانا اور ہدایت کے راستے پر گامزن ہوجانا چاہیئے۔"

درمیان کلام میں آپ نے رسول کے بارے میں یہ اعلان کیا کہ وہ اس وقت تک تمہارے سپرد نہیں ہوسکتے جب تک کہ سر نہ اڑ جائیں، خون نہ بہہ جائیں اور ایک قتل گاہ تشکیل نہ پا جائے۔ یہ انسان کریم، نجیب، صادق اور شریف ہے۔

اور آخر میں اپنی ذاتی رائے کا اظہار بھی کردیا کہ یہ اللہ کی طرف سے فرستادہ رسول ہیں۔ اگر کوئی آج ان کی رسالت کا انکار کردے گا تو قیامت کے دن پشیمان ہوگا وہ ایک ایسا دن ہوگا جب ندامت کا کوئی حربہ کارگر نہ ہوگا۔

مسلمانو! کیا یہ اقرار نہیں ہے؟ کیا ایمان و تسلیم و اعتراف کا کوئی اور مفہوم بھی ہے کیا "محمد رسول اللہ" اور "محمد نبی یاتیہ الوحی من عند ربہ" میں کوئی فرق ہے۔ کہ پہلے کلمہ کا قائل مسلمان ہو اور دوسرے کا مشرک؟ خدایا گواہ رہنا کہ یہ صرف جہالت، ضلالت اور نفسانیت ہے۔

شعب ہی کے قصائد میں یہ اشعار بھی ملتے ہیں جن میں آپ نے قریش کو اس بے رخی فرقہ پردازی اور تفرقہ اندازی کے انجام سے آگاہ کیا ہے۔ اور انھیں ان کے پست اغراض اور احمقانہ خواہشات پر تنبیہ کی ہے۔

جزی اللہ عنا عبد شمس و نوفلا — وتیما و مخزوما عقوقا و مأثما

تفریقھم من بعد ود و الفۃ — جماعتنا کیما ینالوا المحارما

کذبتم و بیت اللہ نبزی محمداً — ولا تر و یوما لدی الشعب قائما

"خدا ہماری طرف سے عبد الشمس، نوفل، تیم اور مخزوم کو اس نافرمانی کی سزا دے۔ ان لوگوں نے ہماری اچھی خاصی جماعت کو اپنے مقصد کے لئے متفرق کردیا ہے۔ تمہارا خیال غلط ہے کہ ہم محمدؐ کو تنہا چھوڑ دیں گے۔ ہم نے تو شعب میں انھیں اکیلے نہیں چھوڑا۔"

گردش زمانہ کو تین سال گزر گئے، ہاشمین اذیتوں پر اذیتیں اور تکلیفوں پر تکلیفیں برداشت کر رہے ہیں۔ حضرت ابوطالبؑ کمال حزن و الم کا علاج اپنے دل سوز اشعار سے کر رہے ہیں۔ ایک دن جبرئیل امین رسول اکرمؐ کی خدمت میں آکر یہ خوشخبری سناتے ہیں کہ قریش کے عہد نامہ کو دیمک چاٹ گئی ہے اور اب اس میں صرف اللہ کا نام باقی رہ گیا ہے۔

رسول اکرمؐ یہ خبر مسرت اثر اپنے چچا کو سناتے ہیں۔ حضرت ابوطالبؑ کے چہرے پر سرخی دوڑنے لگتی ہے۔ دل مطمئن ہوجاتا ہے۔ قلق و اضطراب اپنی بساط سمیٹنے لگتا ہے۔ ایک مرتبہ کمال اطمینان کا جذبہ ابھرتا ہے۔ اور پوچھتے ہیں، بیٹا کیا خدائی خبر ہے۔؟ عرض کی جی ہاں۔ فرمایا سچ ہے۔ تو نے آج تک کوئی غلط بات کہی ہی نہیں ہے۔"

یہ کہہ کر حضرت ابوطالب ہاشمین کے ایک جھرمٹ میں شعب سے باہر نکلے۔ مسجد الحرام کے باہر پہونچے۔ قریش نے خیال کیا کہ اب اذیتوں سے عاجز آکر محمدؐ کو حوالے کرنے آئے ہیں۔ سب بڑھے حضرت ابوطالبؑ نے نہایت ہی پرسکون لہجہ میں آواز دی۔

"اے قریش والو! اب تو عہد نامہ سے بھی زیادہ باتیں ہونے لگی ہیں۔
اچھا اب اسے لے آؤ، شاید صلح کی کوئی صورت نکل آئے۔"

کیا کہنا اس حسن تدبیر کا۔ آپ نے سوچا کہ اگر اصل واقعہ کی اطلاع ابھی سے دے دی جائے گی تو کاغذ کو وہیں کھول کر دیکھ لیں گے۔ اور سامنے لانے سے انکار کردیں گے۔ لہٰذا مطلب کو مبہم طریقے سے بیان کیا لوگ خوشی خوشی دستاویز لے آئے۔ انھیں یہ خبر ہی نہیں تھی کہ اپنے دام میں آپ ہی اسیر ہوگئے ہیں۔ اور اپنی ہلاکت خود ہی بلا کر لائے ہیں۔ ابھی تک یہی حسن ظن تھا کہ ابوطالبؑ، محمدؐ کو ہمارے سپرد کردیں گے اور ہم آج تک کا انتقام لیں گے۔

ایک مرتبہ حضرت ابوطالبؑ کی یہ آواز کان میں آئی "اب وہ وقت آگیا ہے کہ تم اپنے اقدامات سے باز آجاؤ۔"

اور یہ اس وقت ہوا جب دستاویز سامنے آگئی۔ اور مہر توڑنے کا انتظام شروع ہوا۔ سکون و اطمینان کا عادی، عقیدہ و ایمان کا مجاہد، مستقبل کا بصیر، نبوت کا معتقد، صداقت کا معترف انسان نہایت ہی پُر وقار انداز میں فرماتا ہے:

"میں تمہارے درمیان انصاف کے لئے آیا ہوں۔ میرے بھتیجے نے خبر دی ہے کہ اللہ نے تمہاری دستاویز پر دیمک کو مسلط کردیا ہے اور اس نے نام خدا کے

سوا وسب صاف کر دیا ہے۔ یہ جھوٹ کا خوگر نہیں ہے۔ لہٰذا اگر اس کا کلام صحیح ہے تو اب ہوش میں آجاؤ جب تک ایک ہاشمی بھی باقی ہے' ہم اسے تمہارے حوالے نہیں کریں گے۔ ہاں اگر یہ غلط کہتا ہے تو یہ تمہارے حوالے ہے' چاہے قتل کر دیا زندہ رکھو!"

معاملہ طے ہو گیا۔ صحیفہ کھولا گیا۔ بُرھان واضح' دلیل روشن اور مطالب صاف ہو چکے تھے۔ لیکن خدا بُرا کرے عناد و عداوت کا' کہنے لگے یہ تمہارے بھتیجے کا جادو ہے۔!

حضرت ابوطالبؑ نے دیکھا کہ موقع غنیمت ہے۔ محمدؐ کی صداقت ظاہر ہو چکی ہے اب بات کہی جا سکتی ہے ایک مرتبہ بگڑ کر بولے۔ آخر ہم کس بات پر محصور ہیں۔ مطلب بالکل صاف ہو چکا ہے اب تم سے قطع تعلق ہونا چاہیے۔ یہ کہہ کر کعبہ کے پردے کو تھاما اور دُعا کے لئے ہاتھ بلند کر دیئے۔

"خدایا! ہمیں غلبہ عنایت کر' ان لوگوں نے ہم سے قطع رحم کیا ہے ہمارے لئے حرام کو حلال کر لیا ہے' اب تو ہماری نصرت فرما"۔

یہ سننا تھا کہ قریش کی ایک جماعت دستاویز کی مخالفت پر آمادہ ہو گئی۔ حصار ٹوٹا' زندگی ملی اور بھوک پیاس کا دور گزر گیا۔ [1]

حقیقت امر یہ ہے کہ اس مقام پر حضرت ابوطالبؑ کے کلام کا ہر فقرہ ایمانِ کامل' عقیدۂ راسخہ اور اطمینانِ مستقل کی دلیل ہے رسولِ اکرمؐ دیمک کے تسلط کی خبر دیتے ہیں۔ اور آپ فوراً سوال کرتے ہیں' کیا وحی نازل ہوئی ہے۔؟

یہ سوال کیوں؟ تاکہ ایمان استدلالی ہو' تقلید پر اس کا دارومدار نہ ہو' یہی وہ ایمان ہے جس کا تذکرہ حضرت ابراہیمؑ کے قصّے میں ملتا ہے: "اولم تومن قال بلیٰ وَ لکن لیطمئن قلبی"۔

یہی وجہ تھی کہ ادھر رسولِ اکرمؐ کا جواب تمام ہوا اور اُدھر حضرت ابوطالبؑ نے اپنی تصدیق اور اپنے ایمان کامل کا اعلان کر دیا۔

یہی ایمان و عقیدہ تھا جس نے قریش سے اتنے سخت مقابلے پر آمادہ کر دیا تھا۔ کہ اب محمدؐ کو سپرد کر دینے پر بھی تیار ہو گئے تھے حالانکہ زندگی بھر اسی مطالبے کی مخالفت کرتے چلے آئے تھے۔ اور یہ

---

[1] السیرۃ النبویہ ص۲۷۶' الحلبیہ ص۳۸۱' الشامیہ ج ۲ ص۱۶۱' کامل ج ۲ ص۱۷' الحجۃ ص۱۱۰' الغدیر ج ۷ ص۳۶۴' بحار ج ۶ ص۴۲۵ ص۵۲۳ علیٰ ہامش السیرۃ ج ۳ ص۹۷' اعیان الشیعہ ج ۳۹ ص۱۳۰-۱۳۲

ساری زحمتیں اسی مخالفت کے نتیجے میں برداشت کرتے رہے تھے۔

ہم یہ تسلیم بھی کر لیں کہ حضرت ابوطالبؑ کو معاذ اللہ رسولِ اکرمؐ کی خبر پر اعتماد نہ تھا تو کیا اس واضح معجزہ کو دیکھنے کے بعد بھی اطمینان پیدا نہ ہوا ہوگا؟ استغفر اللہ!

حقیقت یہ ہے کہ اس واقعہ میں اسلام و ایمان' عقیدہ و اطمینان کے دلائل انتہائی واضح طور پر نظر آ رہے ہیں۔ اور ان تمام دلائل میں اہم نکتہ آپ کا وہ مباہلہ ہے جو ایمان کی آخری منزل پر ہوا کرتا ہے۔ جس کے بعد واضح سی بات ہے کہ اگر یہ سچے ہیں تو نبیؐ کی نصرت ایک اسلامی فریضہ ہے جس سے تا آخرِ حیات اعراض نہیں کیا جا سکتا اور اگر معاذ اللہ غلط گو ہیں۔ تو انھیں قتل ہونا چاہیئے۔ کہ اللہ پر افترا کرنیوالے کی سزا قتل ہے۔

یاد رکھیئے! اگر حضرت ابوطالبؑ کی یہ ساری نصرت و امداد قرابت کی بنا پر ہوتی تو ہرگز ہرگز سپردگی پر آمادگی نہ ہوتے' اس لئے کہ قرابت صدق و کذب کی تابع نہیں ہوتی۔ اس کے اصول' اصولِ شریعت سے الگ ہوتے ہیں۔ وہاں جھوٹ سچ سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ بلکہ مقصد برآری سے کام ہوتا ہے۔

حصارِ شعب ٹوٹا' قافلہ باہر آیا اور حضرت ابوطالبؑ نے موقع سے فائدہ اُٹھانے کی ٹھان لی۔ آپ نے دیکھا کہ ہماری صداقت اور دشمن کا کذب واضح اور آشکار ہو چکا ہے۔ لہٰذا کوئی ایسا انتظام کر دیا جائے جس سے یہ نشانِ فتح ہمیشہ کے لئے تاریخ پر ثبت ہو جائے۔ چنانچہ آپ نے فوراً چند اشعار نظم کئے۔

وَ قد کان فی امر الصحیفة عبرة — متی یخبر غائبُ القوم یعجب
محا اللہ منها کفرهم و عقوقهم — و ما نقموا من ناطق الحق معرب
فاصبح ما قالوا من الامر باطلا — و من یختلق ما لیس بالحق یکذب

"یہ دستاویز کا قصّہ بھی ایک عبرت بن گیا۔ قوم کو خبرِ غیب سے بڑا تعجب ہوا لیکن اللہ نے اس کے کفر' نافرمانی اور مخالفتِ حق کے کلمات کو مٹا کر رکھ دیا۔ ان کی بات باطل ہو کر رہ گئی کیوں نہ ہو؟ جو خلافت حق کہے گا' جھوٹا بنے گا۔"

یہ تینوں اشعار اُس مکمل قصیدہ کا ایک حصّہ ہے جن کے بعض اشعار سابق میں نقل کئے جا چکے ہیں۔

---

[1] کامل ابن اثیر ج ۲ ص۶۴' الحجۃ ص۲۵' بحار ج ۶ ص۵۲۳' اعیان الشیعہ ج ۳۹ ص۱۳۶' ایمانِ ابوطالبؑ ص۱۵' مناقب ج ۱ ص۳۷' الغدیر ج ۷ ص۳۶۷' مجمع البیان ج ۷ ص۳۷۔

حضرت ابوطالبؑ نے اِن اشعار میں دستاویز کی تباہی کو ایک ایسی عبرت قرار دیا ہے جس سے انسان حیرت میں پڑجائے اور اس کے دل میں ظلم و تعدّی کفر و نافرمانی کے جذبات ایمان باللہ سے تبدیل ہوجائیں بلکہ اگر تعصب درمیان میں حائل نہ ہو تو ایمان باللہ لازمی و ضروری حیثیت اختیار کرلے

آپ نے دوسرے شعر میں دیمک کے تسلط اور تحریر کے محو ہوجانے کو ایک خدائی امر قرار دیا ہے جس سے عبرت و حیرت ناگزیر چیزیں ہیں۔ آپ یہ بتانا چاہتے ہیں کہ ان کی مخالفتوں سے حق چھپ نہیں سکتا۔ اس لئے کہ اس کی طبیعت ہی ظہور پذیر ہوتی ہے اور چونکہ ان کی مخالفت حق کے مقابلے میں ہے اس لئے فضیحت و رسوائی بھی لازمی اور ضروری ہے۔

جناب ابوطالبؑ نے اس دستاویز کے بارے میں ایک قصیدہ اور بھی ارشاد فرمایا ہے جس میں اپنے ماضی قدیم اور روشن حال کی عکاسی کی ہے دل چاہتا ہے کہ اس قصیدہ کے بعض اشعار بھی اس مقام پر نقل کردیئے جائیں۔ چنانچہ آپ فرماتے ہیں:۔

الاهل أتى بحر بيناصنع ربنا — على نائهم والله بالناس اُرود

فيخبرهم ان الصحيفة مزقت — وان كل مالم يرضه الله مفسد

تراوحها افك وسحر مجتمع — ولم يلف سحر آخر الدهر يصعد

تداعى لها من ليس فيها بقرقر

قطائرها في رأسها يتردد

"کاش کوئی حبشہ کے دُور افتادگان کو خدائی کرم کی اطلاع کردیتا اور خدا تو بڑا کریم ہے ہی۔ کوئی انھیں بتاتا کہ دستاویز پارہ پارہ ہوگئی ہے۔ اور اللہ کی مرضی کے خلاف کام فاسد ہی ہوتا ہے۔

یہ دستاویز جعل سازی اور جادوگری کا مجموعہ تھی۔ ظاہر ہے کہ جادو ہمیشہ نہیں چلتا۔

اس دستاویز پر اچھے اچھے لوگوں کی نظر ہے۔ بہرحال اب اس کے سر پر طائر نحوست منڈلا رہا ہے"۔

فمن ينش من حضار مكة عزه — فعزتنا في بطن مكة اتلد

نشأنا بها والناس فيها قلائل — فلم تنفك نزداد خيراً نحمد

ونطعم حتى يترك الناس فضلهم — اذا جعلت أيدي المضيفين ترعد

"اگر یہ لوگ مکہ میں تازہ عزیز بنے ہیں تو ہماری عزت بہت قدیم ہے۔

ہم یہیں پیدا ہوئے اور ہمیشہ خیر و خوبی کے ساتھ بڑھتے رہے۔

ہم اس وقت بھی کھلا دیتے ہیں جب اچھے اچھوں کے ہاتھ لرز جاتے ہیں"

الا ان خير الناس نفساً ووالداً — اذا عد سادات البرية احمد

نبي الاله والكريم باصله — واخلاقه وهو الرشيد المؤيد

جرئ على جلى الخطوب كانه — شهاب بكفي قابس يتوقد

من الاكرمين من لوى بن غالب — اذا سيم خسفا وجهه يتربد

طويل النجاد خارج نصف ساقه — على وجهه يسقى الغمام ويسعد

عظيم الرماد سيد ابن سيد — يحض على مقرى الضيوف ويحشد

ويبني اذا ابناء العشيرة صالحاً

اذا نحن طفنا في البلاد ويمهد[1]

"یاد رکھو دنیا میں حسب و نسب کے اعتبار سے سب سے بہتر ذات محمدؐ کی ہے۔

یہ نبیؐ خدا، کریم الاصل، جید الاخلاق، ہوشمند اور موید من عند اللہ ہیں۔

حوادث کو اس طرح واضح کردیتے ہیں جیسے کسی شخص کے ہاتھ میں شعلہ روشنی دے رہا ہو۔

یہ لوی بن غالب کے بزرگ خاندان کے ایک فرد ہیں، ذلت کے تصور سے ان کے چہرے کا رنگ بدل جاتا ہے۔

ایک قد آور آدمی ہیں۔ بادل انھیں کے نام پر پانی برساتے ہیں۔

سخی، سردار ابن سردار ہیں۔ اور مہمان نوازی میں یگانۂ روزگار ہیں۔

جب ہم بچوں کو چھوڑ کر سفر میں چلے جاتے ہیں تو یہ ان کی تربیت کرکے انھیں صالح بناتے ہیں"

ذرا ابوطالبؑ کی زبان سے رسولِ اکرمؐ کی شخصیت کا جائزہ لیجئے دنیا کے سادات اور بزرگوں میں حسب و نسب کے لحاظ سے سب سے بہتر، اللہ کا نبی، کریم الاصل، جید الاخلاق رشید

---

[1] السیرۃ الهشامیه ج۲ ص۱۷-۱۹، استیعاب ج ۲ ص۹۲ الغدیر ج ۷ ص۳۰۵، دیوان ابی طالب ص۶، اعیان الشیعہ ج ۳۹ ص۱۳۴

مویدؑ، جراءت مند، نڈر، سخت گیر، مطئن، شعلہ، جوالہ، نورِ کامل، ہادی برحق وغیرہ۔

ظاہر ہے کہ یہ تعریف ایک چچا اپنے بھتیجے کے لئے نہیں کر سکتا۔ ان تمام تعریفات کا سرچشمہ بھتیجے کی نبوت ہے۔ اور اس پہ چچا کا ایمانِ کامل ہے۔

وقتِ احتضار

وہ شجرۂ مبارک کہ جس کے سایہ میں اسلام اور رسولِ اسلامؐ نے پناہ لی تھی، آج روبہ خزاں ہو رہا ہے شاخیں جھک چکی ہیں۔ سرچشمۂ حیات منقطع ہو چکا ہے۔ پتے زرد ہو رہے ہیں۔ اور موت کی رنگت سارے اجزاء پر چھائی جا رہی ہے۔

وہ انسان جس نے ساری طاقت، پوری قوت اور تمام انسانی کوشش اسلام کی خدمت میں صرف کر دی تھی، اپنے تھکے ہوئے اعصاب، ستم رسیدہ روح اور الم دیدہ نفس کو راحت دینا چاہتا ہے۔

اب وہ وقت آگیا ہے کہ باپ کی وصیت پر عامل، اسلام کا خادم، نبوت کا محافظ، عقیدہ کا مجاہد انسان اپنی نعمتوں کا ثمرہ حاصل کرے اور اپنی کاوشوں کا بدلہ پائے۔

لیکن کیا کہنا حضرت ابوطالبؑ کا کہ ایسے سخت وقت میں بھی اپنے گرد جمع شدہ خاندان والوں پر ایک نظر ڈالتے ہیں۔ اور وہی وصیت دہراتے ہیں۔ جو باپ نے اپنے آخری وقت میں خود انہیں کی تھی۔ چاہتے یہ ہیں کہ جس بار کو تنہا اٹھایا تھا اُسے سارے خاندان والے مِل کر اٹھائیں۔ جس کام کو اکیلے سنبھالا تھا۔ اسے ایک جماعت مل کر پروان چڑھائے۔ اجتماع کی طاقت اور اتحاد کی قوت کچھ اور ہی ہوتی ہے ـــــ اِسی خاندان کے ایک فرد مومنِ اوّل اور ناصرِ وحید حضرت علیؑ ہیں جو باپ کے فریضہ کی تکمیل کریں گے۔ اور رسولؐ کی نصرت میں اپنا سرمایۂ حیات تک لٹا دیں گے۔

یہ ہیں حضرت ابوطالبؑ! حیات کا شعلہ خاموش ہو رہا ہے، زندگی کی شمع بجھ رہی ہے لیکن لیکن ایک ضعیف، نحیف اور پرہیبت آواز میں قریش کے حاضرین کو خطاب کر رہے ہیں۔ تاکہ اسلام کی

نصرت کی وصیت ان سے بھی متعلق کردیں۔ شاید اللہ انھیں کسی طرح ہدایت کردے!

"اے گروہ قریش! تم اللہ کے برگزیدہ بندے ہو، تم عرب کی جان ہو، تم میں قابلِ اطاعت سردار اور معرکہ گیر شجاع موجود ہیں۔ یاد رکھو! تمہارے پاس عرب کی کوئی فضیلت ایسی نہیں ہے جو موجود نہ ہو۔ تم سب سے افضل اور سب تمہارے محتاج ہیں۔ لوگوں نے تم سے متفقہ طور پر جنگ کا ارادہ کرلیا ہے۔ لہٰذا تمہارا فریضہ ہے کہ خانۂ کعبہ کی تعظیم کرو، اسی میں اللہ کی مرضی، معاش کی وسعت اور قدم کا ثبات پوشیدہ ہے۔ صلۂ رحم کرو، قطع تعلق نہ کرو، صلۂ رحم سے عدد میں ترقی اور زندگی میں اضافہ ہوتا ہے۔ ظلم و نافرمانی کو ترک کرو، اس سے قومیں ہلاک ہوچکی ہیں۔ سائل کا سوال رد نہ کرو، طالب کی طلب کو پورا کرو، اسی میں حیات و ممات کا شرف ہے۔ سچ بولو، امانت داری سے کام لو، اس میں خصوصی محبت اور عمومی کرامت ہے۔ دیکھو میں تمہیں محمد کے ساتھ نیکی کی وصیت کرتا ہوں۔ یہ قریش میں امین اور عرب میں صدیق ہیں۔ ان کا ایمان ایسا ہے جسے دل نے قبول کرلیا ہے یہ اور بات ہے کہ خوفِ اختلاف سے زبان پر نہیں لاسکا۔

خدا کی قسم! میں دیکھ رہا ہوں کہ عرب کے فقراء و مساکین و ضعفاء و بیچارگان اس کے دین کو قبول کر کے اس کی عظمت بڑھا رہے ہیں۔ اس کے نتیجہ میں قریش کے رؤساء و زعما پست ہو رہے ہیں، ان کے گھر برباد ہو رہے ہیں۔ ان کے بزرگ محتاج نظر آ رہے ہیں۔ عرب اس محمدؐ کے دوست ہوتے جارہے ہیں۔ اور اسکی قیادت تسلیم کررہے ہیں۔ اے قریش! یہ تمہارے خاندان کا فرد ہے۔ اس کا ساتھ دو، اس کی اطاعت کرو، خدا کی قسم اس کا متبع رشید اور اس کا تابع نیک بخت ہے اگر اب بھی میری حیات میں کچھ اضافہ ہوجاتا تو میں اس کی طرف سے تمام مشکلات و مصائب کا مقابلہ کرتا۔"[1]

کیا کہنا اس عظمتِ ایمان اور جلالتِ عقیدہ کا! خدا کی قسم اگر حضرت ابوطالبؑ کے ایمان کے لئے اس وصیت کے علاوہ کوئی اور دلیل نہ ہوتی تو بھی آپ کے ایمان کا اعتراف لازم و واجب ہوتا۔ اس وصیت کا ہر کلمہ اور ہر فقرہ ایک واضح ایمان اور راسخ عقیدہ کا اعلان کر رہا ہے۔

---

[1] السیرۃ النبویہ ص۸۶، الحلبیہ ج ا ص۳۹۱، ثمرات الاوراق ج ۲ ص۱۲، مشیخ الابطح ص۳۹، اعیان الشیعہ ج ۳۹ ص۱۴۲، الغدیر ج ۷ ص۳۶۶، صوت العدالۃ ج ا ص۹ (اضافہ کے ساتھ)

وصیت کا یہ حصہ ایمان کا ایک ایسا جزو ہے جو اہلِ غرض اور بے ایمان لوگوں کی لرزتی ہوئی زبانوں کو بند کرنے کے لئے پوری حد تک کافی و وافی ہے۔ یہ وہ وصیتیں ہیں جو ایک مومنِ کامل کے علاوہ کسی کی زبان پر آہی نہیں سکتیں۔ مومن بھی ایسا جو شریعت کے ظاہر و باطن سے واقف، احکام کے اسرار پر مطلع اور مستقبل میں آنے والے حالات کی پوری بصیرت رکھتا ہو۔ حال کے کثیف پردوں کو ہٹا کر مستقبل کا روشن چہرہ دیکھ سکتا ہو۔

خانۂ حق کی تعظیم کی وصیت ہو رہی ہے۔ اس لئے کہ تعظیم کعبہ شعور ایمانی اور احساسِ مذہبی کی دلیل ہے۔ یہی رضائے الٰہی کا باعث ہے اور ظاہر ہے کہ جب اللہ راضی ہوگا تو معاشیات کی اصلاح بھی کرے گا۔ قدموں کو ثبات بھی دے گا اور قول میں استقامت بھی عطا کرے گا۔

صلۂ رحم کا حکم ہو رہا ہے کہ یہ درازیٔ عمر کا باعث ہے۔ بساطِ حیات کشادہ ہوجاتی ہے۔ عدد میں اضافہ ہوجاتا ہے۔ اور قطع رحم سے اس کے برعکس اثرات پیدا ہوتے ہیں۔

جب ہم اس کے بعد اسلامی تشریع و احکام کا جائزہ لیتے ہیں۔ تو معلوم ہوتا ہے کہ وہاں بھی یہی حکم موجود ہے اور یہی علت مذکور ہے۔

ظلم و نافرمانی کی ممانعت ہو رہی ہے کہ یہ معاشرت کے لئے ایک ایسا تیشہ ہے، جو انسانیت کے ایوان کو تباہ کردیتا ہے۔ بشریت کے آثار کو محو کردیتا ہے۔

طالب کی طلب پر لبیک اور سائل کے سوال پر عطا کا حکم ہو رہا ہے کہ اس میں دنیا و آخرت کا شرف ہے۔ لبیک کہنے سے نام کی بقا، ذکر کا دوام، مدحت کی پائیداری اور اسوۂ حسنہ کی تکمیل ہوتی ہے۔ مال عطا کرنے سے مکمل بدلہ اور نیک جزا ملتی ہے۔

صداقت و امانت کا حکم دیا جارہا ہے کہ یہ انسانیت کے امتیازی جوہر اور بلندیٔ نفس و پاکیزگیٔ ضمیر کے دلائل و براہین ہیں۔

درحقیقت یہی وہ انسانی قوانین ہیں جن کی ترادیج کے لئے رسول اکرمؐ مبعوث ہوئے تھے گویا کہ حضرت ابوطالبؑ اسلامی احکام کے سرچشمہ سے پورے طور پر مطلع تھے۔ اور یہ فیاضی اسی سرچشمے سے ہو رہی تھی۔

آپ نے آخری وقت میں قریش کے سامنے یہ وصیتیں اور یہ انسانی تعلیمات پیش کر کے انھیں اس بات کی طرف متوجہ کردیا کہ اب اگر محمدؐ انھیں تعلیمات کو بزبانِ وحی پیش کریں تو یہ سمجھ لینا کہ ان کا دین، دینِ الٰہی اور ان کا پیغام، پیغامِ فلاح انسانی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ ان تمام احکام و تعلیمات کا تذکرہ کرنے کے فوراً بعد بیان کا رُخ بدل دیتے ہیں اور رسولِ اکرمؐ کے بارے میں وصیت شروع کر دیتے ہیں۔ اور اس وصیت میں یہ فقرہ خاص طور سے ذکر کرتے ہیں کہ محمدؐ ان تمام تعلیمات کا جامع اور ان تمام احکام کا مرکز و مخزن ہے وہ اس رسالتِ کبریٰ کا حامل ہے جس کا مقصد ہی تکمیل اخلاق اور تہذیبِ انسانیت ہے۔

حضرت ابوطالبؑ کے آخری کلمات میں آپ کے ایمانِ کامل کا ایک بڑا حساس نکتہ پایا جاتا ہے کہ آپ نے رسولِ اکرم کو تمام قریش میں امین کے لقب سے یاد فرمایا ہے۔ مقصد یہ ہے کہ جو شخص امین ہوگا وہ اللہ سے خیانت نہیں کرے گا۔ پھر آپ نے انھیں عرب کا صدیق قرار دیا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ صدیق کسی وقت بھی خداوند عالم کے خلاف جھوٹ نہیں بول سکتا۔

یہی وجہ ہے کہ قریش نے اعلانِ رسالت کے بعد سے رسول اکرمؐ سے اس لقب کو سلب کرلیا اور انھیں ساحر و کذاب کہنے لگے۔ انھیں بخوبی معلوم تھا کہ صداقت و امانت کا اعتراف انکارِ نبوت کے ساتھ جمع نہیں ہوسکتا۔ ظاہر ہے کہ ایسے حالات میں یہ بات بالکل صاف ہوجاتی ہے کہ حضرت ابوطالبؑ کا امانت و صداقت کا اعتراف ہی ان کے ایمان کے اثبات کے لئے کافی ہے' لیکن حضرت ابوطالبؑ نے چاہا کہ بات کو اور بھی واضح کر دیا جائے۔ عقیدہ کو اعلان کی آخری منزل تک پہنچا دیا جائے۔ اس لئے فرمایا کہ محمدؐ کے پیغام کو دل نے قبول کرلیا ہے۔ لیکن زبان سے ظاہر نہیں کرسکتا۔ اس لئے کہ وقت کی مصلحت یہی ہے موقف کی نزاکت' پیغام کی اہمیت' فریضہ کی ادائیگی اور رسالت کی نصرت اسی بات کی مقتضی ہے

اس کے بعد آپ نے ایک دوررس اور پردہ شگاف نظر اٹھائی اور دور تک مستقبل کا جائزہ لیتے چلے گئے۔ کیا دیکھا کہ محمدؐ کی محبت دلوں میں جگہ پا رہی ہے۔ ان کی بارگاہ میں سر جھک رہے ہیں۔ ان کے دوست قوت و عظمت کے منازل پر فائز ہو رہے ہیں۔ اور ان کے دشمنوں کے سر سے تاج اتر کر نعل قدم بن رہے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ چاہا کہ لوگوں کو ان کے اتباع کی دعوت دیں تاکہ یہ ان کی نصرت و حمایت کریں۔ ان کے دین کی رعایت و حفاظت کریں۔ ان کے انوار سے ضیا حاصل کریں۔ ان کے ہدایت سے استفادہ کریں۔ اور اس طرح سعادت کی آخری منزلوں پر فائز ہوجائیں۔

ابھی یہ سوچ ہی رہے تھے کہ ایک مرتبہ نظر اپنے حال کی طرف مڑگئی۔ افسوس میں اب نہ ہونگا ورنہ میں تو پوری پوری مدد کرتا۔ تیز و تند ہواؤں سے بچاتا۔ طوفانوں اور آندھیوں سے محفوظ رکھتا'

سرکشوں کے شر سے محفوظ رکھتا اور اس طرح ہر قسم کی اذیت و تکلیف سے بچاتا رہتا۔

یہ وصیت ایمانِ عمیق اور جذبۂ فداکاری کا ایک اعلیٰ نمونہ ہے۔ ایک ایسے سخت وقت میں جب انسان کے ہوش و حواس بجا نہیں ہوتے آپ کو اگر کوئی فکر ہے تو دین اسلام کی۔ چاہتے ہیں کہ تاریخ اس وصیت کو ثبت کرے تاکہ آنے والے افترا پرداز خود رسوا ہوجائیں۔ اور ان کا منصوبہ کامیاب نہ ہوسکے۔

حضرت ابوطالبؑ نے اس وصیت میں تمام قریش کو اس لئے شامل کرلیا ہے کہ انھیں اس بات کا اندازہ ہوجائے کہ ابوطالبؑ کے بارے میں ہمارا خیال غلط تھا کہ یہ ہمارے دین پر نہیں ہیں۔ یہ محمدؐ کی دعوت قبول کرکے ان کے دین میں داخل ہوچکے ہیں۔

اس کے بعد آپ نے بنی عبدالمطلب اور بنو ہاشم کو بالخصوص خطاب کرکے انھیں رسولِ اکرمؐ کے اتباع کی دعوت دی کہ اسی اتباع میں نجات' خیر' سعادت اور رشد و فلاح ہے[۱]

"اے بنی ہاشم! محمدؐ کی اطاعت اور ان کی تصدیق کرو' اسی میں فلاح بھی ہے اور عقلمندی بھی!"

اس کے بعد بنی ہاشم میں سے چار آدمیوں کو منتخب کیا۔

اوصی بنصر نبی الخیر اربعة ۔۔۔ ابنی علیا وعم الخیر عباسا
وحمزة الاسد المخشی صولته ۔۔۔ وجعفرا ان تذودوا دونه الناسا
کونوا فدا لکم امی وما ولدت ۔۔۔ فی نصر احمد دون الناس اتراسا
بکل ابیض مصقول عوارضه
تخاله فی سواد اللیل مقیاسا[۲]

"میں پیغمبر خیر و برکت کی نصرت کے لئے اپنے بیٹے علی' عباس شیر بیشۂ شجاعت حمزہ اور جعفر کو وصیت کرتا ہوں' ان کا فرض ہے کہ ان کا دفاع کریں۔ میرے شیرو! میں تم پر قربان! تم محمدؐ کے لئے ایک محکم سپر کے مانند بن جاؤ۔ تمہارے ہاتھ میں ایسی چمکدار تلواریں ہوں جو تاریکیٔ شب میں مشعلِ راہ معلوم ہوں"

۱۔ السیرۃ النبویہ ج ۱ ص ۸۶ و ص ۲۸۱' الحلبیہ ج ص ۳۸۹-۳۹۱' ابوطالب ص ۹۱' الغدیر ج ۷ ص ۳۶۹

۲۔ الغدیر ج ۷ ص ۳۴۲-۴۰۱' ایمان ابی طالب ص ۱۷' الحجۃ ص ۹۷-۹۸' مناقب ج ۱ ص ۳۵' اعیان الشیعہ ج ۳ ص ۱۲۰' مجمع البیان ج ۷ ص ۳۷ (قدرے اختلاف کے ساتھ)

کیا یہ بھی عقل میں آنے والی بات ہے کہ محمدؐ کے پیغام کو فلاح، رشد، خیر اور سعادت قرار دے کر دنیا کو اس کے اتباع کی دعوت دینے والا انسان خود ہی اس کا مخالف ہو، خدا کی قسم یہ بات عقل کے خلاف ہے، انسان کسی کی بات کو عقلمندی، فلاح و خیر مانے اور پھر اس کا منکر ہو۔ ہدایت کا اعلان کرے اور پھر گمراہی پر باقی رہے۔ معاذ اللہ۔ استغفر اللہ!

حضرت ابوطالبؑ کے صحیفۂ حیات کی یہی وہ آخری سطریں ہیں جن میں ایمان کی چمک، عقیدہ کی مہک اور جہاد و فداکاری کی تنویریں پائی جاتی ہیں۔

اللہ اکبر! کتنا بڑا مومن ہے یہ انسان۔ کیسا مددگار و محافظ ہے یہ مجاہد امین!

جزوِ دوم
تاریخ کی ذمہ داریاں
بعد موت

بھلا کیونکر ممکن تھا کہ محمد رسولؐ عدالت و انصاف اور وفاداری کیلئے نمونۂ عمل تھا، کسی منعم کے کرم یا کسی محسن کے احسان کو فراموش کر دیتا۔ یہی وجہ تھی کہ ابوطالبؑ کے مرنے کا غم دل کی گہرائیوں سے گزر کر چہرے کے خطوط تک آگیا اور خیال یہ تھا کہ اب مصائب سے سخت مقابلہ ہے اور تبلیغ اسلام میں بہت بڑا خلا پیدا ہو گیا ہے۔

عبید اللہ ابن ابی ارفع کہتے ہیں کہ ادھر علیؑ نے رسول اکرمؐ کو اپنے والد بزرگوار کے انتقال کی خبر دی، ادھر آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب جاری ہو گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد آنسوؤں کو روکا، دل کو سنبھالا اور ایک نحیف و غم انگیز لہجے میں علیؑ سے خطاب کیا۔ "جاؤ باپ کو غسل و کفن دے کر دفن کر دو۔ خدا ان پر رحمت نازل کرے اور بخش دے۔"[1]

ارباب نظر! کیا اسلام ابوطالبؑ پر اس سے بہتر بھی کوئی دلیل ہو سکتی ہے کہ رسولِ اکرمؐ جیسا ذمہ دار انسان علیؑ جیسے مسلمان کو ابوطالب کی تجہیز و تکفین کا حکم دیتا ہے، جبکہ شریعت اسلامیہ میں کافر کی تغسیل و تکفین حرام ہے یہی نہیں بلکہ خود رسولؐ بھی دعائے مغفرت اور سوالِ رحمت سے یاد کرتے ہیں۔ جبکہ وہ مومنین پر رحیم اور کافرین پر شدید ترین غضب ناک ہیں۔

علیؑ گئے، تجہیز و تکفین کے فرائض انجام دیئے۔ اسلام کے نامِ اوّل کا جنازہ مسلمانوں کے کاندھوں پر

---

[1] السیرۃ النبویہ ج ۱ ص ۸۴، الغدیر ج ۳ ص ۹۱ ج ۷، ص ۳۷۳، شیخ الابطح ص ۴۴، الحجۃ ص ۲۶، معجم القبور ج ۱ ص ۲۴۴، تذکرۃ الخواص ص ۱۰، ایمان ابوطالب ص ۱۰، اعیان الشیعہ ج ۳۹ ص ۱۴۱

اٹھا۔ علیؑ نے دوڑ کر رسول اکرمؐ کو خبر پہنچائی اور حضورؐ جنازہ کی مشایعت کو باہر نکل گئے۔ آگے آگے جنازہ اور پیچھے پیچھے اسلام کا پیغامبرؐ ناصرِ اسلام کا قصیدہ پڑھتا ہوا۔

"چچا! آپ نے صلۂ رحم کیا۔ خدا آپ کو جزائے خیر دے۔ آپ نے مجھے پالا۔ میری ذمہ داری لی اور بڑا ہونے کے بعد بھی میری نصرت کی اور میرا ہاتھ بٹایا"۔ [1]

جنازہ آگے بڑھا، قبر کے قریب پہنچا۔ رسول اکرمؐ کی زبان پر کلمات جاری ہوئے،
خدا کی قسم میں استغفار بھی کروں گا اور شفاعت بھی۔ چچا ایسی شفاعت جس سے جن و انس دونوں متحیر رہ جائیں۔ [2]

ابھی رسول اکرمؐ کا یہ مرثیہ ختم نہیں ہوا تھا کہ شور و شین اور آہ و بکا کا سلسلہ شروع ہو گیا:—

وا ابتاہ! وا اباطالباہ واحزناہ علیک یا عماہ

(چچا آخر کس طرح صبر کروں، آپ نے بچپنے سے پالا، بڑا ہونے کے بعد محبت و شفقت سے سلوک کیا۔ میں تو آپ کی آنکھوں کا نور اور آپ کے لئے روحِ رواں تھا۔) [3]

"میں آنکھوں کا نور تھا۔ کیا جس کی آنکھوں کا نور رسول اکرم جیسا ہادی و مرشد ہو وہ بھی تاریکیوں میں رہ سکتا ہے؟"

"میں جن کے لئے روحِ رواں تھا: وہ روح جس پر زندگی کا دار و مدار اور حیات کا انحصار ہوتا ہے وہ روح جس کے بعد جسمِ عنصری بوسیدہ لکڑی کی مانند اور قبر کی تاریکیوں میں پوشیدہ کر دینے کے قابل ہو جاتا ہے

کیا اس درجۂ اتحاد کے بعد بھی انکارِ رسالت کے امکانات پائے جاتے ہیں۔؟
بھلا کائنات میں وہ کون سا جسم ہے جس کی روحِ رواں رسالت ہو؟
عالمین میں وہ کون سا پیکر ہے جس کا شعور رسالت کے ادراک سے فیضیاب ہوا ہو۔؟

لیجئے وہ رسالت کا حصنِ حصین، تبلیغ کا مستحکم قلعہ منہدم ہو گیا۔ بیشۂ ہاشمی کا شیر قبر میں سو گیا۔ زمین ہول اور اس کے ناصرِ حقیقی کے درمیان حائل ہو گئی۔

قریش کے وحوش اُٹھنے لگے کہ، "شیر کی دہاڑ سنائی نہیں دیتی ہے۔ راستہ صاف ہو گیا ہے، زمین

---

[1] الحدیدی ج ۴ ص ۳۱۲، بحار ۵۵ ص ۵۲۴ - ۵۲۹، شیخ الابطح ص ۴۲، الغدیر ج ۷ ص ۳۴۲ - ۳۸۷، الحجۃ ص ۶۷، ابوطالب ص ۸۲، معجم القبور ج ۱ ص ۱۹۱ - ۲۰۴، تذکرۃ الخواص ص ۶، ایمان ابی طالب ص ۲

[2] معجم القبور ج ۱ ص ۲۰۳، ایمان ابوطالب ص ۲ اور پانچ سابق الذکر حوالے۔

[3] شیخ الابطح ص ۴۴، اصابہ ج ۷ ص ۱۱۳

ہموار اور فضا سازگار ہو گئی ہے۔ مختلف قسم کے اذیتوں، طرح طرح کی زحمتوں اور تمسخر و اہانت کی تیاریوں کا وقت آ گیا ہے۔

مجال ہے کہ ایسے وقت میں رسول اکرمؐ کے ذہن سے ابوطالبؑ کا خیال نکل جائے! ہرگز نہیں۔ اب تو ہر مصیبت اپنے ساتھ ابوطالب کی یاد لے کر آتی ہے۔ اور ہر شدت و زحمت کے ساتھ ابوطالب کے تذکرے ہوتے ہیں۔

گھر میں داخل ہوتے ہیں۔ مشرکین نے سارے سر پر خاک ڈال دی ہے۔ بیٹی پریشان و اشکبار ہو کر دوڑ پڑتی ہے: باباجان یہ کیا؟

"بیٹا روؤ نہیں، اللہ تمہارے باپ کی حفاظت کرے گا"

یہ لفظیں کہیں اور خیال ماضی میں کھو گیا۔ اگر آج میرا چچا زندہ ہوتا تو کسی طرح اس ظالم کو سزا دیتا۔ اگر آج میرا مددگار باحیات ہوتا تو کس طرح اس بے شعور کو جرأت ہوتی۔ یہ سوچا اور زبان پر کلمات آ گئے۔

"قریش نے کوئی اذیت اُس وقت تک نہیں پہنچائی جب تک کہ ابوطالبؑ کا انتقال نہیں ہو گیا"۔ [1]

یہی نہیں بلکہ جب بھی کوئی وقت پڑ گیا جب بھی نصرت کی ضرورت ہو گئی۔ تخیل میں فوراً ابوطالبؑ کی تصویر سامنے آ گئی۔ زبان پر ان کی یاد تازہ ہو گئی۔

ہائے چچا، کتنی جلدی آپ سے جدائی ہو گئی

مشیتِ الٰہی کا تقاضہ تھا کہ رسولؐ کا سخت امتحان لیا جائے۔ چنانچہ دونوں کے بعد آپ پر دو ایسی مصیبتیں پڑ گئیں، جن میں سے ہر ایک ساری قوتوں کو زائل کر دینے اور دل کو پاش پاش کر دینے کے لئے کافی تھی۔

ایک طرف حضرت ابوطالبؑ کا فراق، جن کی رعایت و حمایت، حفاظت و شفقت کی بناء پر قریش کو مقابلہ کی تاب نہ تھی اور دوسری طرف خدیجہ کا انتقال، جن کا مال و منال، اخلاص و جذبۂ تبلیغ، مصائب کے علاج، سختیوں

---

[1] السیرۃ النبویہ ج ۱ ص ۲۸۰، الحلبیہ ج ۱ ص ۱۹۱، الہشامیہ ج ۲ ص ۱۸، طبری ج ۲ ص ۸۰، ابن اثیر ج ۲ ص ۶۳، مناقب ج ۱ ص ۳۸، تجارب ج ۶ ص ۳۴۰، شیخ الابطح ص ۱۵، معجم القبور ج ۱ ص ۲۰۲، ابوطالب ص ۹۱، الغدیر ج ۷ ص ۳۷۷، صوت العدالۃ ج ۱ ص ۶۰، اعیان الشیعہ ج ۳۹ ص ۱۲۷ (قدرے اختلاف کے ساتھ)

کا ولولہ' اور زنجبارے دل کے مرہم کے لئے کافی تھا۔

اب وہ دونوں ہی رخصت ہو گئے۔ دنیا تنگ و تاریک اور عالم نظروں میں سیاہ ہے۔ صرف اللہ پر اعتماد اور اسی کا سہارا ہے۔ یہ دونوں کتنی سختیاں جھیل کر دنیا سے گئے ہیں۔ شعب کی زندگی میں کتنے مصائب انھوں نے برداشت کئے ہیں۔ وہ اسی برس سے زیادہ کا ضعیف انسان اور وہ اشغال' جب کارہائے نمایاں ایسے ہوں تو نتائج کو بھی اتنا ہی اہم' تذکرہ کو اتنا ہی دائم اور آثار کو اس طرح باقی رہنا چاہیئے [1]

ایک وقت وہ بھی آیا جب ماضی کے تصور سے دل بھر آیا۔ غم والم کے جذبات اُمڈ آئے اور زبان پر کچھ کلمات جاری ہو گئے۔ کیسے کلمات؟ جن میں خالق پر اعتماد' صاحب قوت سے اُمید' قضائے الٰہی پر صبر' اللہ کی بارگاہ میں شکوہ اور اذیت وایذا سے فریادوں کا ایک طوفان تھا۔

'خدایا! میری قوت کم' میری تدبیریں کمزور اور میں لوگوں کی نظروں میں حقیر ہوا جا رہا ہوں۔

'خدایا! اے ارحم الراحمین' تو ضعیفوں کا پروردگار اور میرا مالک ہے۔ کسی کے حوالے کیا ہے۔! کیا کسی غیر کے حوالے کیا ہے یا دشمن کو مسلط کر دیا ہے تو کچھ پروا بھی نہیں ہے۔ تیری عافیت میرے لئے کافی ہے۔

اے ظلمات کو روشن کرنے والے' اے عالمین کی اصلاح کرنے والے تیری تیرے ہی غضب اور تیری ہی ناخوشی سے' تیری ہی رضامندی کی امید ہے تیرے علاوہ قوت ہی کسی کے پاس ہے' [2]

اس قلعۂ مستحکم کے منہدم ہونے' اس پناہ گاہ کے مٹ جانے اور اس مددگار کے مرجانے کے بعد

---

[1] حضرت ابوطالبؑ کی وفات کے بارے میں چند قسم کے اختلافات ہیں۔ پہلا اختلاف مہینہ کے سلسلے میں ہے۔ بعض کے نزدیک آپ کا انتقال رجب میں ہوا' بعض کے نزدیک رمضان میں بعض شوال لکھتے ہیں اور ذیقعدہ۔ دوسرا اختلاف سنہ کے بارے میں ہے۔ بعض کا خیال ہے۔ کہ آپ کا انتقال بعثت کے بعد ۱۰ھ میں ہوا ہے۔ اور بعض کہتے ہیں کہ ۱۱ھ میں۔ ایک اور اختلاف یہ ہے کہ جناب ابوطالب و حضرت خدیجہ میں پہلے کس کا انتقال ہوا ہے۔ ایک بحث یہ بھی ہے کہ دونوں کے سانحۂ ارتحال کے درمیان فاصلہ کس قدر تھا۔

[2] الطبری ج ۲ ص ۸۱' ابن الاثیر ص ۶۴' الحدیدی ج ۳ ص ۳۲' الحلبیہ ج ۱ ص ۳۵۳' النبویہ ج ۱ ص ۲۸۱ الشامیہ ج ۲ ص ۶۱' مناقب ج ۱ ص ۶۸' بحار ج ۶ ص ۵۲۹' شیخ الابطح ص ۵۲' علی ہامش السیرة ج ۱ ص ۱۴۹' ۱۵۰ محمد النبی العربی ص ۹۵ (قدرے قدرے اختلاف کے ساتھ)

اب مکہ میں وہ ہی کون گیا ہے۔ اب تو شدائد ہی شدائد اور مصائب ہی مصائب ہیں۔

یہی فکر' یہی سوچ اور یہی اضطراب کا عالم تھا کہ ایک مرتبہ ملک حکم ایزدی لے کر پہونچ گیا:

محمدؐ! مکہ سے باہر نکل چلو' اب تمہارا کوئی نہیں رہا ہے۔ [1]

▼ ▼ ▼
▼ ▼
▼

---

[1] شرح النہج ج ۱ ص ۱۰۰' الجنة ۱۷' ۶۴' ۱۰۳' بحار ج ۶ ص ۴۴۳' شیخ الابطح ص ۱۵' المعجم القبور ج ۱ ص ۱۹۷' اعیان الشیعہ ج ۳ ص ۷ قسم اول ج ۲۹ ص ۱۲۷

عِطر بار تذکرے

ظاہر ہے کہ حضرت ابوطالبؑ کے مواقف ایسے نہ تھے جو رسولِ اکرم صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذہن سے محو ہو جاتے یا جس کی تصویر آنحضرتؐ کی آنکھوں میں نہ پھرا کرتی!

یہی وجہ ہے کہ آپ کسی بھی وقت اس یاد سے غافل نہ ہوتے بلکہ ہمیشہ اپنے تذکروں اور اپنی یادوں سے ان مواقف، محاسن اور الطاف وکرم کا شکریہ ادا کیا کرتے تھے۔

بھلا یہ کیونکر ممکن تھا کہ رسولِ اکرمؐ جیسا معلّمِ اخلاق اپنے محسنِ اعظم کو بھلا دے۔ رسولؐ کو ان احساسات کا تذکرہ دو جہتوں سے کرنا چاہئے تھا۔ ایک اپنی ذاتی جہت سے، حضرت ابوطالبؑ کے احسانات کے صلے کے طور پر اور ایک رسالت کی جہت سے، دُنیا کو تعلیم دینے کے لئے اور یہ بتلانے کے لئے کہ ہر شخص کو اپنے محسن کے ساتھ ویسا ہی سلوک کرنا چاہئے جیسا سلوک میں چچا کے ساتھ مرنے کے بعد کر رہا ہوں۔

ایک اعرابی آنحضرتؐ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ چہرے سے غم والم کے آثار نمایاں اور آنکھوں سے امید و آس کی روشنی جھلک رہی تھی۔ عرض کرنے لگا: یارسول اللہ! اب نہ جانور رہ گئے ہیں نہ اطفال، قحط و خشک سالی نے بالکل تباہ و برباد کر دیا ہے یہ کہہ کر کچھ اشعار پڑھے جن میں اپنے حالات کی صحیح عکاسی تھی:

اتیناك والعذراء يدمى لبانها	وقد شغلت ام الصبی والاطفل
والقى بكفيه الصبى استكانة	من الجوع ضعفا ما يبابل
ولا شئ مما ياكل الناس عندنا	سوى الحنظل العماى والارغل
وليس لنا الا اليك فرارنا	واين فرار الناس الا الى الرسل

"یارسول اللہؐ، اُس وقت آیا ہوں جب قحط نے سینے زخمی کر دیئے ہیں۔ اور عورتوں نے بچوں کو چھوڑ دیا ہے۔

اب تو بھوک کے مارے بچے بھی تلخ و غیر شیریں غذا کھانے پر آمادہ ہو گئے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ ہمارے پاس کھانے کے لئے حنظل جیسی چیزوں کے سوا اور کچھ نہیں رہ گیا ہے۔

اب آپ کے پاس آئے ہیں۔ اس لئے کہ رسولوں کے علاوہ اور کوئی جائے پناہ بھی تو نہیں ہے۔"

یہ سننا تھا کہ حضرتؐ اُٹھے۔ چہرہ پر غم کے آثار نمودار، دِل بے چین، عبا دوش پر ڈالی۔ منبر پر تشریف لے گئے۔ حمد و ثنائے الٰہی کے بعد دست دعا ہوئے۔

"خدایا پانی برسا دے تاکہ خشک زراعتیں سرسبز ہو جائیں۔

جانوروں کے تھنوں میں دُودھ پیدا ہو جائے اور زمین پھر سے شاداب ہو جائے"

ابھی دُعا ختم نہ ہوئی تھی کہ آسمان پر بجلیاں دوڑنے لگیں اور زمین پر رحمت کی بارش ہونے لگی۔ ایسی موسلا دھار بارش کہ لوگ فریاد کرنے لگے۔ "یارسول اللہ! اب ڈوبے، اب ڈوبے!"

یہ سننا تھا کہ ہاتھ پھر اُٹھ گئے۔ وہ ہاتھ جن کی دُعا رد نہیں ہوتی۔ لبوں کو پھر جنبش ہو گئی، وہ لب جن کی امید ناامید نہیں ہوتی۔ "اب ہم پر نہیں بلکہ اطراف و جوانب پر"

زبان پر یہ کلمات جاری ہوئے تھے کہ گھرے ہوئے بادل چھٹنے لگے۔ رسول اکرمؐ کے لبوں پر تبسّم کھیلنے لگا اور دفعتہً خیال ماضی میں کھو گیا۔ ابوطالبؑ کی یاد نے تڑپا دیا۔

فرمایا:—

"خدا بھلا کرے ابوطالبؑ کا، اگر آج زندہ ہوتے تو کس قدر خوش ہوتے۔ ارے کوئی مجھے اُن کے شعر سنائے!"

باپ کا جانشین، رسالت کا محافظ اُٹھ کھڑا ہوا۔ "یارسولؐ اللہ! شاید آپ کی مراد یا شعر ہے۔

"وابيض يستسقى الغمام بوجهه
ثمال اليتامى عصمة للارامل"

رسول اکرمؐ نے تائید کی اور علیؑ نے باقی اشعار دُہرانا شروع کر دیئے۔ اب حضرت ہیں کہ مسلسل اپنے چچا کے لئے منبر سے استغفار کرتے چلے جا رہے ہیں، یہاں تک کہ ایک مرتبہ

بنی کنانہ کا ایک شخص کھڑا ہو گیا اور یہ اشعار پڑھنا شروع کر دیئے۔

لک الحمد والحمد ممن شکر   سقینا بوجہ النبی المطر
دعا اللہ خالقہ دعوۃ   الیہ واشخص منہ البصر
فلم یک الا کالقاء الردا   واسرع حتی ولینا الدرر
دفاق العزالی جم البعاق   اغاث بہ اللہ عطبا مضر
فکان کما قالہ عمہ   ابوطالب ابیض ذو غرر
بہ اللہ یسقیہ صوب الغمام   وھذا العیان لذالک الخبر

"خدایا تیرے شکر گزاروں کی طرف سے تیری حمد، تو نے نبی کریمؐ کے واسطے سے ہمیں سیراب کر دیا۔
نبی اکرمؐ نے اپنے خالق سے دعا کی اور اس کے بعد نظریں جھکائیں۔
ابھی کوئی وقفہ نہ گزرا تھا کہ بارش شروع ہو گئی۔
ایسی لگاتار موسلا دھار بارش جس سے قوم مضر کی جان بچ گئی۔
سچ کہا تھا ابوطالبؑ نے یہ رسول بابرکت اور کریم ہے۔
اسی کے وسیلے سے بارش ہوتی ہے۔ بس فرق یہ ہے کہ وہ قول خبر تھا اور آج اس کا مشاہدہ بھی ہو گیا۔"

سوال یہ ہے کہ حضرت ابوطالبؑ کے انتقال کے بعد بھی ہر موقع پر ان کا ذکرِ خیر کیوں ہے؟ کیا یہ ان احسانات کا بدلہ نہیں ہے جو رسولِ اکرمؐ کی یاد سے کسی وقت بھی جُدا نہیں ہو سکتے تھے۔

خدا ابوطالبؑ کا بھلا کرے۔ یہ وہ کلمہ ہے۔ جس میں مدح و ثنا کی خوشبو کے ساتھ اعتراف و اقرار کی طراوت بھی کرے۔ رسول کریمؐ جانتے ہیں کہ اگر آج ابوطالبؑ زندہ ہوتے تو اس واقعہ کو دیکھ کر ضرور خوش ہوتے۔

خدا ابوطالبؑ کا بھلا کرے۔ کس کی طرف سے؟ رسولؐ اسلام کی طرف سے جس کے لئے غیر مستحق کی مدح ناجائز بلکہ خلاف شان ہے۔ یہی نہیں بلکہ اس کے ساتھ استغفار کا ضمیمہ بھی ہے کیسا استغفار؟ وہ استغفار جو رسول اکرمؐ کی زبان پر غیر مومن کے لئے آہی نہیں سکتا۔

حضرت ابوطالبؑ کے احسانات کا ایک بدلہ یہ بھی تھا کہ ان کی اولاد کے ساتھ اچھا

سلوک کیا جائے۔ اس لئے کہ یہ اسلام کا ایک قانون ہے اور رسولؐ سے بہتر اپنے قوانین و احکام پر عمل کرنے والا کون ہے؟

چنانچہ آپؐ نے ایک دن حضرت علیؑ سے خطاب کیا:

"میری جگہ کا تم سے زیادہ حقدار کوئی نہیں ہے۔ تم اسلام میں سابق مجھ سے قریب، فاطمہؑ کے شوہر ہو اور ان سب سے پہلے یہ کہ تمہارے باپ ابوطالبؑ نے روزِ اوّل سے میری امداد کی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ ان کی اولاد میں ان کے حقوق کی رعایت کروں۔" ؎۱

رسولِ اکرمؐ کی نظر میں وقت نزولِ وحی سے لے کر آخری دم تک ابوطالبؑ کی نصرت و یاوری کس قدر قیمت رکھتی ہے کہ آپ اس کو بھی دلیل جانشینی قرار دے رہے ہیں اور اسی کی بنا پر منزل نبوت کی نیابت حوالے کر رہے ہیں۔

اب چونکہ باپ کے حقوق کی رعایت اولاد کے بارے میں ضروری ہے اور علیؑ ہی شرائطِ امامت و خلافت کے جامع ہیں لہٰذا انہیں کو یہ حق دیا جا سکتا ہے۔

ایک مرتبہ عقیل سے خطاب کرتے ہیں:-

"اے ابومسلم! میں تم سے دوہری محبت کرتا ہوں، ایک اپنی قرابت کی بنا پر اور ایک اس لئے کہ چچا تمہیں بہت چاہتے تھے:" ؎۲

اللہ اللہ! رسول کو چچا سے کتنی محبت تھی کہ عقیل سے صرف قرابت کی بنا پر محبت نہیں فرماتے بلکہ اس لئے بھی محبت کرتے ہیں کہ چچا کو ان سے محبت تھی۔ اس کا کھلا ہوا مطلب یہ ہے کہ اپنا محبوب اور چچا کا محبوب بھی محبوب ارباب انصاف! کیا محبت کی اس سے بلند بھی کوئی منزل ہو سکتی ہے!

بدر کا معرکہ ہے۔ حق و باطل، توحید و شرک کی فیصلہ کن جنگ اپنے آخری لفظ پر پہونچ چکی ہے لشکر اسلام کی جانب سے جہاد کرنے کے لئے ابوعبیدہ بن الحرث بن عبدالمطلب میدان میں نکل چکے ہیں

؎۱ ینابیع المودۃ ج ۲ ص ۱۴۰، غایۃ المرام ص ۴۹۷، الغدیر ج ۷ ص ۳۸۷ وغیرہ
؎۲ الاستیعاب ج ۲ ص ۱۵۷، الحدیدی ج ۳ ص ۳۱۲، الحجۃ ص ۱۴۴، الخواص ص ۱۵، معجم القبور ص ۲۰۴ الغدیر ج ۷ ص ۳۸۴ ص ۳۸۸ ۔

عتبہ بن ربیعہ یا شیبہ کے حملہ سے پائے مبارک کٹ چکے ہیں۔ اللہ کی دو تلواریں علیؑ و حمزہؓ میدان میں کھنچی ہوئی ہیں۔ ابو عبیدہ کے پیروں سے خون بہہ رہا ہے۔ لیکن اس کے باوجود ایک مرتبہ آنکھیں کھولتے ہیں اور ضعیف و نحیف آواز سے کہتے ہیں۔

"اے خدا کے رسولؐ! کاش آج ابوطالبؑ زندہ ہوتے تو دیکھتے کہ ان کے کلام کی تصدیق کس طرح ہو رہی ہے۔ بیشک اُنھوں نے سچ کہا تھا کعبہ کی قسم۔ ہم محمدؐ کو اُس وقت تک تمہارے حوالے نہیں کر سکتے جب تک کہ شمشیر زنی اور نیزہ بازی کا ایسا مظاہرہ نہ ہو جائے جس میں ہم سب ہلاک ہو جائیں"

ابو عبیدہ کی آواز کانوں میں آئی اور دل تڑپ گیا۔ چچا کی تصویر آنکھوں میں پھرنے لگی اور زبان پر حضرت ابوطالبؑ اور ابو عبیدہ کے لئے استغفار کے کلمات جاری ہو گئے۔ [۱]

اُسی دن کا یہ واقعہ بھی ہے جب جنگ کا فیصلہ ہو گیا، کفر کا لشکر ہزیمت کھا کر بھاگ گیا تو رسول اکرمؐ نے پڑی ہوئی لاشوں پر ایک نظر دوڑانا شروع کی۔ کیا دیکھتے ہیں کہ ان میں اُن کی لاشیں بھی ہیں جو آپ کے خلاف آتش جنگ بھڑکانے میں پیش پیش تھے۔ یہ منظر دیکھا اور پہلو کی طرف نظر ڈالی۔ ابوبکر پر نظر پڑ گئی۔ فرمانے لگے۔ کاش آج ابوطالبؑ زندہ ہوتے تو دیکھتے کہ ہماری تلواروں نے برابر کے پہلوانوں کو کس طرح ختم کیا ہے۔

اس بیان میں بھی حضرت ابوطالبؑ کے اُس قصیدہ کی طرف اشارہ ہے جس میں آپ نے کفار کو یہی چیلنج دیا تھا اور اسی انداز سے دھمکی دی تھی۔ [۲]

ایک موقع ایسا بھی آیا ہے جب عباس رسول اکرمؐ سے سوال کرتے ہیں:-

"یا رسول اللہ! کیا آپ کو ابوطالبؑ کے بارے میں کوئی امید ہے؟"

آپ نہایت ہی اطمینان و سکون کے ساتھ فرماتے ہیں:-

"میں اپنے پروردگار سے ہر خیر کی امید رکھتا ہوں" [۳]

---

[۱] الحدیدی ج ۳ ص ۳۱۲، ج ۱ ص ۳۰، الحجۃ ص ۲۷، شیخ الابطح ص ۴۸، بحار ج ۶ ص ۵۱۵

[۲] اغانی ج ۱۷ ص ۲۸، الغدیر ج ۱ ص ۳۷، ج ۲ ص ۱، الحدیدی ج ۳ ص ۳۰۹

[۳] الحدیدی ج ۳ ص ۳۱۱، الحجۃ ص ۱۵، تذکرۃ الخواص ص ۱۱، معجم القبور ج ۱ ص ۱۸۹، الغدیر ج ۷ ص ۳۷۳، اعیان الشیعہ ج ۳۹ ص ۱۳۶

رسول اکرمؐ کی زبان سے نکلے ہوئے یہ کلمات بھی سند صحیح کے ساتھ نقل کئے گئے ہیں کہ جب قیامت کا دن ہوگا تو میں اپنے ماں باپ، چچا ابوطالبؑ اور ایک جاہلیت کے بھائی کی شفاعت کروں گا۔ [۱]

اگرچہ اس حدیث کے الفاظ و عبارت مختلف ہیں لیکن سب کا مفاد و مطلب ایک ہی ہے۔

ان تمام احادیث کے بعد ہمارا فرض ہو جاتا ہے کہ ہم اس ناصر رسولؐ کے ایمان کا اعتراف کریں کہ رسولؐ جب ذکر کرتے ہیں تو مدح و ثنا کے ساتھ۔ جب یاد کرتے ہیں تو جزائے خیر کے ساتھ جب دُعا کرتے ہیں تو رحمت و مغفرت کے لئے۔ حالانکہ یہ وہ رسولؐ ہے جو جذبات و خواہشات کا تابع نہیں ہے اس کا معاملہ صرف اعمال پر ہے اگر خیر ہے تو خیر، اگر شر ہے تو شر!

اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ معاذ اللہ حضرت ابوطالبؑ مسلمان نہ تھے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ رسول اکرمؐ نے ان تمام آیات کی مخالفت کی ہے جن میں کافر کے لئے استغفار سے روکا گیا تھا۔ مثلاً:-

الف: لا تجد قوما یومنون باللہ والیوم الاخر یوادون من حاد اللہ ورسولہ ولو کانوا اباءھم او ابناءھم او اخوانھم او عشیرتھم۔ اولئک کتب فی قلوبھم الایمان۔۔۔۔

"اللہ اور قیامت پر ایمان لانے والا انسان دشمن خدا و رسول سے دوستی نہیں رکھ سکتا خواہ ان کے درمیان کیسی ہی قرابت کیوں نہ ہو اور خواہ ان کے تعلقات کتنے ہی استوار کیوں نہ ہوں"۔

قرآن کریم کی نظر میں ایمان اور کافر کی دوستی دو متضاد چیزیں ہیں جن کا اجتماع ایک دل میں محال ہے۔ علامہ زمخشری فرماتے ہیں:-

"قرآن کریم نے ایمان کے ساتھ مشرکین کی دوستی کو محال قرار دیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ کسی مسلمان کو ایسا نہ ہونا چاہیے بلکہ اعداء دین سے سختی کے ساتھ عداوت ہونی چاہیے۔ کسی بھی وقت ان کے ساتھ تعلقات نہ ہونے چاہئیں چاہے وہ باپ اور بھائی ہی کیوں نہ ہوں۔ اس لئے کہ اہل ایمان اللہ کے

---

[۱] الحدیدی ج ۳ ص ۳۱۱، تفسیر علی بن ابراہیم ص ۳۵۵/۴۹۰، الحجۃ ص ۳-۵، الغدیر ج ۷ ص ۳۷۹/۳۸۶

گروہ میں ہیں اور کفار شیطان کے گروہ میں اور درحقیقت اخلاص حقیقی یہی ہے کہ اللہ کے دوستوں سے دوستی ہو اور اللہ کے دشمنوں سے دشمنی ہو۔" [۱]

اس کے بعد علامہ موصوف نے رسول اکرمؐ کی ایک دعا نقل کی ہے :۔

"خدایا! کسی فاسق و فاجر کا احسان میرے سر پر نہ رکھنا کہ میرے پیش نظر یہ آیت ہے : لا تجد قوما الخ" [۲]

مجمع البیان میں نقل کیا گیا ہے کہ کفار کی دوستی ایمان کے ساتھ جمع نہیں ہو سکتی۔

ب : یا ایھا الذین اٰمنوا لا تتخذ وا عدوی وعدوکم اولیاء تلقون الیھم بالمودۃ ط

"اے اہل ایمان! دشمن دین و ایمان کو اپنا دوست نہ بناؤ، نہ ان کی طرف محبت کا ہاتھ بڑھاؤ۔"

ج : یا ایھا الذین اٰمنوا لا تتخذوا اٰباءکم واخوانکم اولیاء ان استحبوا الکفر علی الایمان ومن یتولھم منکم فاولٰئک ھم الظّٰلمون الخ ـــــ (توبہ۔ آیۃ ۲۳)

اس آیۂ مبارکہ میں ماں باپ اور بھائی جیسے رشتہ داروں سے بھی قطع تعلق کا حکم دیا گیا ہے اگر وہ ایمان سے اپنے رشتہ کو قطع کر لیں حالانکہ باپ تربیت کے اعتبار سے خالق مجازی کا درجہ رکھتا ہے اور ظاہر ہے کہ جب ایسے لوگوں کی محبت انسان کو ظالم بنا دیتی ہے تو باقی کا کیا ذکر ہے

اس کے بعد کی آیۃ میں ایک حتمی فیصلہ کیا گیا ہے کہ یا تو ماں باپ کو چھوڑ کر اللہ کی طرف متوجہ ہو یا پھر امر الٰہی کا انتظار کرو۔ اس لئے کہ یہ لوگ فاسق و فاجر ہیں۔ علامہ زمخشری رسول اکرمؐ کا ارشاد نقل کرتے ہیں:۔

"کوئی بھی شخص اس وقت تک ایمان کے لطف سے آشنا نہیں ہو سکتا جب تک

[۱، ۲] کشاف ج ۴ ص ۳۹۶ تفسیر ابن کثیر ج ۴ ص ۳۳۰

اللہ کی خاطر محبت اور اُسی کی خاطر عداوت نہ رکھے۔ اللہ کے لئے دور والوں کو دوست اور اُسی کے لئے قریب والوں سے نفرت نہ کرے۔" [۱]

یہ وہ شدید ترین آیت ہے جس سے سخت قرآن کی آیت نہیں ہے، اس لئے کہ آیت عامۃ الناس کی امور دین میں سہل انگاری اور ان کے ضعیف عقیدہ کی عکاسی کر رہی ہے۔ اب بڑے بڑے مدعیان ایمان و تقویٰ کو بھی چاہئے کہ آیت کے معیار پر اپنے نفوس کو پرکھیں اور دیکھیں کہ ان کے دل میں حب للہ اور بغض اللہ کے جذبات کس حد تک پائے جاتے ہیں۔

مجمع البیان میں ہے کہ :۔

"دین کا معاملہ نسب پر مقدم ہے۔ جب ماں باپ سے قطع تعلق واجب ہے تو باقی لوگ کس شمار میں ہیں؟ حسن کا قول ہے کہ جو شخص مشرک سے دوستی کرے گا۔ وہ خود بھی مشرک ہو جائے گا۔

د : یا ایھا الذین اٰمنوا من یرتد منکم عن دینہ فسوف یاتی اللہ بقوم یحبھم ویحبونہ اذلۃ علی المومنین اعزۃ علی الکٰفرین ط

ہ : ولو کانوا یومنون باللہ والنبی وما انزل علیہ ما اتخذوھم اولیاء ولٰکن کثیراً منھم فاسقون ط

پہلی آیت نے ایمان کے شرائط میں باہمی دوستی، یک جہتی، اور یگانگت کو شمار کیا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ اہل ایمان کو متحد و متفق رہنا چاہیئے تاکہ ان کی مثال ایک ایسی جماعت کی ہو۔ جس کی ہر خشت دوسرے کی محتاج اور مددگار ہے۔

اس کے بعد پوری قوت و طاقت اور صلاحیت کا مصرف کفار و مشرکین کے مقابلے میں ہونا چاہئے تاکہ وہ اسلامی وحدت کو تباہ و برباد اور مسلمانوں کے شیرازہ کو منتشر نہ کر سکیں۔

مجمع البیان میں ہے کہ :۔

---

[۱] کشاف ج ۲ ص ۲۰۱

"آیتِ مبارکہ میں اذلہ سے مراد ذلیل ہونا نہیں ہے بلکہ آپس میں نرمی سے سلوک کرنا ہے۔ چنانچہ ابنِ عباس کہتے ہیں کہ اہلِ ایمان کا باہمی سلوک اُسی طرح ہوتا ہے کہ جس طرح بیٹے کا سلوک باپ کے ساتھ یا غلام کا آقا کے ساتھ ہو اور پھر یہ سب کافر کے مقابلے میں اُسی طرح ہوتے ہیں جس طرح شکار کے لئے۔

دوسری آیت نے کفار کے دوستوں سے ایمان ہی کی نفی کر دی ہے اور یہ بتا دیا ہے کہ یہ لوگ اس جرم کی پاداش میں غضبِ الٰہی، عذابِ خداوندی اور ذلت دائمی کے مستحق ہیں اور ان میں اکثر تو فاسق و فاجر ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ مشرکین سے واقعی دوستی خود نفاق کی ایک دلیل ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ واقعاً اہلِ ایمان نہیں ہیں بلکہ اپنے کفر و نفاق پر باقی ہیں[1]

آیتِ مبارکہ میں ان کے فاسق کے جانے کی دو علتیں بیان کی گئی ہیں:-

(۱) یہ لوگ امرِ الٰہی سے خارج ہوتے ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ یہ بات لفظ کفر سے حاصل ہو نہیں ہوتی۔

(۲) یہ لوگ کفر میں فاسق یعنی سرکش ہیں لہٰذا اس مقام پر تنہا فسق مراد نہیں بلکہ وہ فسق جو کفر کے بارے میں ہوتا ہے یعنی انتہائی سرکشی اور بغاوت[2]

و : محمّد رسول الله والذین معه اشدّآء علی الکفار رحمآء بینهم

مفسرین کرام نے اس آیت کے ذیل میں حسن کا یہ قول درج کیا ہے:

"مسلمانوں میں کفار سے اجتناب کا ملکہ اتنا زیادہ ہو گیا تھا کہ ان کے کپڑوں کو اپنے کپڑوں سے اور ان کے جسموں کو اپنے جسموں سے مس نہ ہونے دیتے تھے"[3]

علامہ زمخشری فرماتے ہیں:-

"مسلمانوں کا ہر دور میں فرض ہے کہ اس تشدد کا بھی خیال رکھیں اور اس نرمی کا بھی لحاظ رکھیں۔ اپنے بھائیوں کی حمایت کریں اور اپنے مخالفین

---

[1] کشاف ج ۱ ص۵۲

[2] مجمع البیان ج ۶ ص۱۷۱

[3] مجمع البیان ج ۶ ص۲۷ ، کشاف ج ۳ ص۱۱۵

پر سختیوں سے کام لیں"[1]

لیکن افسوس کہ آج مسلمانوں کا طرزِ عمل اس کے بالکل برعکس ہو گیا۔ کل تک آپس میں ایک دوسرے پر مہربان تھے اور آج دشمنوں کے ساتھ مہربانیاں ہیں ان کے ساتھ حسن سلوک ہے۔ اور آپس میں صرف سختیاں ہیں تشدد ہے، ایک دوسرے کی عداوت ہے ایک دوسرے کے خون کا پیاسا ہے۔ ہر شخص دوسرے بھائی کو دشمن کے سامنے لقمۂ اجل بنا کر پیش کرنے کی فکر میں ہے۔ وطن و مذہب سے خیانت ہو رہی ہے۔ استعماری اذہان سے محبت و اخلاص کا اظہار ہو رہا ہے مشرق و مغرب کو اپنے سروں پر مسلط بنایا جا رہا ہے یہ اور بات ہے کہ انھیں اسی دُنیا میں ان کے اپنے اعمال کی پاداش مل رہی ہے اور یہ اپنے کئے کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔

افسوس صد افسوس! ریسمانِ اتحاد ٹوٹ گئی۔ وحدتِ اسلامیہ پارہ پارہ ہو گئی۔ اختلافات کی آگ بھڑک اُٹھی اور خرمنِ اتحاد خاکستر ہو گیا۔

آمدم برسرِ مطلب۔ ہمارا ان چند آیتوں کو بطور نمونہ پیش کرنے سے مطلب یہ تھا کہ ہم ان کے مفاہیم و مقاصد پر ٹھنڈے دل سے غور کریں۔ اور یہ دیکھیں کہ کیا ان تعلیمات و احکام والے نبیؐ کے لئے جائز ہے کہ وہ ایک مشرک یا کافر پر صرف اس لئے رحم کرے کہ ان کا رشتہ دار ہے اور اسطرح اپنی تمام تعلیمات پر پانی پھیر دے!

کیا یہ ممکن ہے کہ رسولِ اکرمؐ ایک غیر مسلم انسان کے احسانات و مجاہدات کو قبول کریں جبکہ

---

[1] درحقیقت اسلام نے یہ تشدد اور یہ سخت گیری ہر غیر مسلم کے لئے روا نہیں رکھی ہے اس لئے کہ انھیں غیر مسلموں میں سے اہلِ کتاب اور اہلِ ذمہ بھی ہیں جن کے حفظِ نفس و مال و آبرو کے احکامات و تعلیمات اسلامی شریعت میں بکثرت پائے جاتے ہیں بلکہ یہ تمام تر تشدد آمیز قوانین صرف اُن اشخاص کے لئے ہیں جو قوانینِ جزیہ کے قائل اور پابند نہ ہوں بلکہ اپنی سرکشی پر اڑے ہوئے ہوں۔ اسکے علاوہ اہلِ ذمہ اور دیگر کفار میں ایک فرق یہ بھی ہے کہ اہلِ ذمہ صاحبانِ کتب ہیں۔ یہ توحید کا ایک مفہوم رکھتے ہیں۔ اور مشرکین توحید کے قائل نہیں ہیں اور کفار اصل خدا کے وجود ہی کے منکر ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان کے ساتھ تشدد آمیز سلوک ہونا ہی چاہیئے۔ یہ بھی یاد رہے کہ حضرت ابوطالبؑ اہلِ کتاب میں سے نہیں ہیں لہٰذا مسلمانوں کے خیال کے مطابق ان کو ان آیات کے مفاد میں داخل ہونا چاہیئے۔ استغفر اللہ
جوادی

آپ کی دعا یہ ہے کہ خدایا کسی کافر کا ممنونِ کرم نہ بنانا۔ اس لئے کہ احسان و اعانت سے دل میں جذبۂ تشکر پیدا ہوتا ہے اور جذبۂ تشکر ایک گہری محبت کا پیش خیمہ ہے۔

کیا یہ تمام باتیں اس زجر و توبیخ، وعد و وعید، ترہیب و تخویف کے منافی نہیں ہیں جنھیں ان آیات میں استعمال کیا گیا ہے۔ اب تو صرف یہی صورت ممکن ہے کہ ہم رسولِ اسلام کو اپنے قوانین سے منحرف اور اپنے دستور کا مخالف تصور کر لیں اور مومنِ قریش حضرت ابو طالبؑ کے کفر کا قول اختیار کر لیں تاکہ ان کی نصرت و امداد، حفاظت و رعایت اور حمایت و نگرانی کسی دماغی الجھن کا باعث نہ بن سکے۔

ورنہ ان احسانات و الطاف کے اعتراف کے بعد اس ذکرِ خیر، ثنائے دوام، تعظیمِ عظیم اور احترامِ شدید کے بعد کفر کا قول اختیار کرنا ایک غیر ممکن سی بات ہے۔

پھر یہ تمام باتیں ان اقوال و اعترافات سے قطع نظر کر کے ہو رہی ہیں۔ جن میں حضرت ابو طالبؑ نے اپنے اسلام۔ ایمان، عقیدہ اور جذبات کا اظہار فرمایا ہے اور جو آج تک تاریخ کے صفحات اور زمانہ کے اوراق پر نورِ ایمان کی روشنائی اور ضیائے یقین کی شعاعوں سے تحریر ہیں۔

حضرت علیؑ کی زبان پر

جب ہم حضرت ابو طالبؑ کے ایمان کا جائزہ اُن کے فرزند امیر المومنینؑ کے کلمات کی روشنی میں لینا چاہتے ہیں تو ہمیں ہر تذکرہ اولائے ایمان سے معمور اور ہر یاد براہینِ عقیدہ سے کلو نظر آتی ہے۔

اِدھر باپ کی آنکھیں بند ہوتی ہیں اور اُدھر رسولِ اکرمؐ کی خدمت میں پہونچ جاتے ہیں تاکہ تجہیز و تکفین کے دستور و تعلیمات معلوم کریں اور جب رسول اکرمؐ ان تعلیماتِ اسلامیہ کو بیان کر دیں تو انھیں کے مطابق تجہیز و تکفین کی جائے۔

سوال یہ ہے کہ کیا یہ طریق و سلوک تجہیز و تکفین غیر مسلم کے جنازہ کے ساتھ جائز ہے۔؟

پھر رسولِ اکرم بھی چچا کے جنازہ میں کس شان سے شریک ہو جاتے ہیں کہ زبانِ مبارک پر ذکرِ خیر ہے اور آنکھوں سے سیلِ اشک رواں ہے۔ پھر جیسے جیسے دن گزرتے جاتے ہیں اور حالات ناسازگار ہوتے جاتے ہیں۔ ویسے ہی ویسے رسولِ اکرمؐ کے لئے ابو طالبؑ کی یاد تازہ ہوتی جاتی ہے اور علیؑ کی نظروں میں باپ کی تصویر پھرتی رہتی ہے۔ وہ اُن کے مجاہدات وہ اُن کی شانِ حمایت و رعایت اور وہ اُن کا طرزِ اعلان و تحفظ ۔!

یہ خیالات دل میں آتے ہیں اور آنکھوں سے ایک سیلاب جاری ہوتا ہے دل میں خارِ غم کھٹکنے لگتا ہے اور زبانِ الم ترجمان پر یہ اشعار آ جاتے ہیں:

ابا طالب! عصمة المستجير — وغيث المحول و نور الظلم
قد هدّ فقدك اهل الحفاظ — فصلى عليك ولي النعم

ولقاك ربّك رضوانه
فقد كنت للمصطفىٰ خير عمٍّ[۱]

"اے پناہ گزینوں کے پناہ دینے والے، اے ابرِ کرم، اے نورِ ظلمات ابوطالبؑ آپ کی موت نے دل توڑ دیئے۔ اللہ آپ پر رحمت نازل کرے، خالق آپ کو اپنی رضا سے سرفراز کرے آپ تو حضرت رسولِ اکرمؐ کے بہترین چچا تھے"

زمانہ گزر رہا ہے، بنی امیہ، اپنے مظالم اور اپنی سیاہ کاریوں میں مشغول ہیں۔ روایتیں وضع ہو رہی ہیں اور حضرت علیؑ ان اڑتی ہوئی چنگاریوں کو دیکھ رہے ہیں۔ ایک دن وہ بھی آ گیا جب آپ رحبہ میں ایک مجمع کے سامنے تشریف فرما تھے اور ایک شخص کھڑا ہو کر کہتا ہے۔

"یا امیر المومنینؑ! آپ کا مرتبہ یہ ہے اور آپ کے والد جہنم میں ہیں"

یہ سننا تھا کہ چہرہ کا رنگ بدل گیا۔ غیظ و غضب کے آثار اُبھرے۔

افسوس! بنی امیہ ایسے ننگِ انسانیت اعمال پر اتر آئے ہیں۔ اب مرنے والوں پر بھی مظالم ڈھائے جا رہے ہیں جب کہ وہ موت کی حفاظت اور دوام و بقا کی آغوش میں ہیں۔ اب تو زندگی کی قدروں میں صرف ان کا ذکرِ خیر اور اُس کی مدح و ثنا ہے۔ کیا اس کا ارادہ ہے کہ اس تذکرہ کو بھی مردہ بنا دیں۔ کیا یہ چاہتے ہیں کہ روایات وضع کر کے حق کی نورانیت اور اس کی پاکیزگی کو بھی بدنما اور داغدار بنا دیں: یہ سوچا اور ایک مرتبہ تڑپ کر فرمایا:

"خاموش خاموش! خدا تیرا بُرا کرے محمدؐ کو نبی بنانے والے کی قسم! اگر میرا باپ تمام روئے زمین کے انسانوں کی شفاعت کرنا چاہے تو اللہ قبول کرے گا کیا یہ ہو سکتا ہے کہ بیٹا قسیم النّار والجنۃ ہو اور باپ جہنّم میں ہو۔ قیامت کے دن ابوطالب کا نور سوائے انوارِ خمسہ کے تمام انوار پر غالب آ جائے گا"[۲]

---

[۱] الحجۃ ص۲۴ تذکرۃ الخواص ص۱۲، شیخ الابطح ص۵۰، معجم القبور ج ۱ ص۲۰۶، الغدیر ج ۳ ص۹۹ ج۔ ص۲۷۹، ص۳۸۹، اعیان الشیعہ ج ۳۹ ص۱۴۰

[۲] الحجۃ ص۱۵، تذکرۃ الخواص ص۱۱۔ شیخ الابطح ص۳۲، الغدیر ج ۷ ص۳۸۸

ظاہر ہے کہ جس کا مرتبہ اتنا بلند ہو کہ خالق نے اسے قسیم نار و جنّت بنایا ہو[۱] اُس کی شرافت و نجابت کو کس درجہ بلند تر ہونا چاہیئے۔ کیا اسکے سلسلۂ نسب میں غیر مومنِ کامل اور غیر موحد بھی کوئی ہو سکتا ہے؟ ہرگز نہیں!

ایک بیٹے اور ایسے باعظمت بیٹے کے لئے کس قدر عیب و نقص کی بات ہے کہ اس کا باپ غیر مومن اور شرک سے ملوث ہو۔ درحقیقت یہ ایک ایسی بات ہے جو بیٹے کی حیثیت کو کم کر دیتی ہے اور اسکی عظمت کو گھٹا کر منزلت کو گرا دیتی ہے۔

کبھی فرماتے تھے خدا کی قسم میرے باپ، میرے جدامجد عبدالمطلبؑ ہاشم اور عبدمناف نے کبھی کسی بُت کے سامنے پیشانی نہیں جھکائی۔

سوال یہ ہے کہ پھر کس کی عبادت کرتے تھے۔؟ درحقیقت یہ لوگ دینِ ابراہیمی کے پیرو تھے اور بیتِ خدا کی طرف نماز ادا کیا کرتے تھے[۲]

ابو طفیل عامر بن واثلہ نے حضرت علیؑ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ جب میرے باپ کا وقتِ وفات قریب آیا تو حضرت رسول اکرمؐ تشریف لائے اور ان کے بارے میں مجھے ایک ایسی خبر دی جو دنیا و مافیہا کی ہر خیر سے بہتر تھی[۳]

کبھی فرمایا کرتے تھے۔ خدا کی قسم ابوطالب بن عبدالمطلب ایک مردِ مومن و مسلمان تھے یہ اور بات ہے کہ قریش کی اذیتوں کے خوف سے بنی ہاشم کے تحفظ کے لئے اس کا اظہار نہ کرتے تھے۔[۴]

کبھی فرماتے تھے کہ حضرت ابوطالبؑ کا اُس وقت تک انتقال ہی نہیں ہوا جب تک کہ خدا کا رسولؐ ان سے راضی نہیں ہو گیا۔[۵]

---

[۱] یہ روایت حضرت ابوبکر سے مروی ہے الریاض النضرۃ ج ۲ ص۱۶۳، ۲۴۴

[۲] الغدیر ج ۷ ص۳۸۸، العباس ص۱۸ مرآۃ العقول ص۳۶۳ معجم القبور ج ۱ ص۲۰۰

[۳] الحجۃ ص۲۳، الغدیر ج ۷ ص۳۸۸

[۴] الحجۃ ص۲۷، الغدیر ج ۷ ص۳۸۹، معجم القبور ج ۱ ص۲۰۰

[۵] الغدیر ج ۷ ص۳۷۰، ۳۸۹، الحجۃ ص۲۳، اعیان الشیعہ ج ۳۹ ص۱۳۰

حضرت امیرؑ کے یہ اقوال وارشادات جن میں ایمان ابوطالبؑ کی واضح وظاہر شہادتیں اور بنی اُمیّہ کے جعل وفریب کی کھلی ہوئی تردیدیں پائی جاتی ہیں، انھیں ایسے جذبات پر محمول نہیں کیا جاسکتا جن میں واقعہ وحقیقت سے کوئی کوئی ربط نہ ہو۔

میرے خیال میں کوئی مسلمان بھی ایسا نہ ہوگا جو اتنی بڑی جرأت کرسکے اور ان فرامین و ارشادات کو قرابت کے جذبات پر محمول کرسکے، اس لئے کہ یہ اندازِ فکر امام المسلمین علی ابنِ ابی طالبؑ کی شخصیت پر کھلا ہوا حملہ ہے اور احادیث وارشاداتِ نبویہؐ کا کھلم کھلا مذاق!

کیا وہ علیؑ جس کے بارے میں نصِ پیغمبرؐ علی مع الحق والحق مع علی یدور معه حیثما دار" موجود ہو وہ حق کو چھوڑ کر جذبات کی رو میں بہہ سکتا ہے۔

ہم رسول اکرمؐ کے ان تمام اقوال کو بیان نہیں کرنا چاہتے جن میں امیرالمومنینؑ کی شخصیت وعظمت کو ظاہر کیا گیا ہے اس لئے کہ آپ کی عظمت روزِ روشن کی طرح ظاہر اور آفتاب عالمتاب کی طرح واضح ہے۔

اگر کوئی شخص آپ کو جذباتی انسان کہتا ہے تو اس کے معنیٰ یہ ہیں کہ وہ رسولِ کریمؐ کو بھی ایک جذباتی انسان مانتا ہے۔

اگر معاذ اللہ حضرت ابوطالبؑ کی موت کفر پر واقع ہوتی تو امیرالمومنینؑ کا فریضہ تھا کہ ان سے برائت وبیزاری کا اظہار کرتے۔ ان کی بے ایمانی کو عالم آشکارا کرتے ہوئے ان پر تبرّا ضرور فرماتے۔

آپ کو یہ حق کسی صورت میں بھی نہیں تھا کہ دشمنِ خدا سے اظہارِ محبّت اور کافر سے اظہارِ اخلاص کریں۔ یہ بات اللہ سے اخلاص کے خلاف ہے اور علیؑ جیسا مومن ومخلص ایسا کام نہیں کرسکتا ہے۔

لیکن یہاں تو معاملہ برعکس ہے۔ باپ سے محبت ہی محبت ہے، اخلاص ہی اخلاص ہے گویا کہ حضرت علیؑ اپنے پدرِ بزرگوار کو ایمان کی اُس منزل پر فائز جانتے ہیں۔ جس منزل تک عام انسان کی رسائی غیر ممکن ہے۔ ورنہ کوئی بھی انسان عقیدہ کے مقابلے میں قرابت داری کا لحاظ نہیں کرسکتا ہے۔

مثل مشہور ہے کہ عقیدہ سے بڑا کوئی رشتہ اور دین وایمان سے مستحکم کوئی قرابت نہیں ہوتی۔ یہی وہ قوت ہے جو ہر تند وتیز سیلاب کا مقابلہ کرتی ہے اور یہی وہ طاقت ہے جو ہر بڑے طوفان کو روک دیتی ہے۔

تاریخ اسلام ہمارے سامنے ہے غزوۂ بنی مصطلق میں جب عبداللہ بن ابی بن سلول نے کچھ نفاق آمیز کلمات کہہ کر مسلمانوں میں افتراق پیدا کرنا چاہا تو اس کا بیٹا عبداللہ دوڑتا ہوا رسول اکرمؐ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کرنے لگا۔ یا رسول اللہ میں نے سنا ہے کہ آپ میرے باپ کو قتل کرنا چاہتے ہیں۔ اگر یہ صحیح ہے تو پھر آپ مجھے حکم دیں۔ میں اس کا سر لے کر آتا ہوں کسی دوسرے کو اس خدمت پر مامور نہ کریں، ایسا نہ ہو کہ کوئی دوسرا میرے باپ کو قتل کرے اور میں اس قاتل کو نہ دیکھ سکوں، جذبات میں آکر اسے قتل کر ڈالوں اور اس طرح ایک مومن کا خون کر کے جہنم کا مستحق بن جاؤں[1]۔

اللہ رے احتیاط واخلاص! بیٹا یہ چاہتا ہے کہ باپ کو اپنے ہاتھ سے قتل کر دے تاکہ اسلام کا مقصد بھی حاصل ہو جائے اور اپنے ایمان وعقیدہ پر حرف بھی نہ آنے پائے۔ ایسا نہ ہو کہ کوئی دوسرا قتل کردے اور فطرتِ بشریہ کی بنا پر جذبات میں آکر ایک مومن کا خون کر کے جہنم اور عذابِ الٰہی کا مستحق بن جائے۔

اور کیا کہنا رسولِ اکرمؐ کے فضل وکرم کا کہ ابن ابی کو صرف اس کے بیٹے کے ایمان واخلاص کی بنا پر چھوڑ دیا[3]۔

اس واقعے سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ دینی جذبات اور ایمانی رجحانات قرابت کے احساسات پر ہمیشہ غالب رہتے ہیں۔

---

[1] زمخشری کا کہنا ہے کہ عبداللہ کا نام حباب تھا لیکن چونکہ حباب شیطان کا ایک نام ہے اس لئے آنحضرت نے ان کا نام عبداللہ رکھ دیا تھا۔

[2] زمخشری نے نقل کیا ہے کہ جب عبداللہ بن ابی نے مدینہ میں داخلہ کا قصد کیا تو اس کے بیٹے نے اس کا راستہ روک دیا۔ اور کہا کہ پہلے رسول اکرمؐ کی عزت اور اپنی ذلت کا اعتراف کرو پھر مدینہ میں داخلہ کا قصد کرو۔ جب اس نے انکار کیا تو بیٹے نے بگڑ کر کہا کہ میں تمہاری گردن اڑا دوں گا باپ نے یہ دیکھ کر اپنی ذلت کا اعتراف کرلیا۔

[3] کامل ج ۲ ص ۱۳۲ طبری ج ۲ ص ۲۶۰، کشاف ج ۲ ص ۴۶۱، تفسیر علی بن ابراہیم ص ۶۸۰ مجمع البیان ج ۲۸ ص ۸۵-۸۶

صفین کی فیصلہ کن جنگ ختم ہو چکی ہے۔ عدی بن حاتم اپنے بیٹے زید کے ساتھ قتل گاہ سے گزر رہے ہیں کیا دیکھتے ہیں کہ انھیں مقتولین میں سے معاویہ کا ایک فوجی زید کا ماموں بھی ہے زید نے ماموں کی حالت دیکھی اور چیخنا شروع کر دیا۔ میرے ماموں کا قاتل کون ہے۔ ایک شخص آگے بڑھا اور کہنے لگا میں اس کا قاتل ہوں۔ زید نے نیزہ سے وار کیا اور اسے ہلاک کر دیا۔

یہ دیکھنا تھا کہ عدی بن حاتم نے زید کی طرف رُخ کیا اور نہایت ہی سخت لہجہ میں خطاب کیا۔ "اے زنِ احمق کے بچے اگر میں نے تجھے ان لوگوں کے حوالے نہ کر دیا تو گویا میں مسلمان ہی نہیں۔" مگر افسوس کہ زید بھاگ کر معاویہ سے جا ملا۔ اور معاویہ نے بھی نہایت ہی اکرام و احترام کے ساتھ اس کا استقبال کیا۔

عدی نے دیکھا کہ بیٹا ہاتھ سے نکل گیا ہے تو بد دُعا کیلئے ہاتھ اُٹھا دیئے۔

"خدایا! زید مسلمانوں سے الگ ہو کر ملحدوں سے مل گیا ہے۔ اسے ایک ایسا تیر مار دے جو خطا نہ کر سکے۔ خدا کی قسم اب نہ میں اس سے بات کروں گا اور نہ اس کے ساتھ ایک چھت کے نیچے جمع ہوں گا۔"[1]

یہ ہے عقیدہ کا کرشمہ کہ عدی بن حاتم عقیدہ کی خاطر اپنے بیٹے کو موت کے گھاٹ اتار دینے پر آمادہ ہو گئیں۔ جب یہ ممکن نہیں ہوتا تو کم از کم بد دعا کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

مسلمانو! کیا عدی کے سینے میں باپ کا دل نہ تھا؟!

جنگ صفین میں یہ واقعہ اپنی نوعیت کا منفرد نہیں ہے۔ بلکہ اسی قسم کا ایک واقعہ اور بھی ملتا ہے کہ لشکرِ معاویہ سے ایک شخص مبارز طلبی کرتا ہوا نکلا' ادھر لشکرِ اسلام سے ایک مجاہد نکلا حق و باطل کی جنگ شروع ہو گئی۔ معرکہ تیغ ہوا جات آگے بڑھی' دونوں گھوڑوں سے اتر پڑے۔ عراق کا حق پرست شام کے باطل پرست سینے پر سوار ہو گیا۔ چاہا کہ خود ہٹا کر اس کا گلا کاٹے۔ کیا دیکھا کہ اس کا حقیقی بھائی ہے۔ ہاتھ اٹھتے اٹھتے رہ گیا۔ لشکرِ اسلام نے آواز دی۔ جلدی کام تمام کر

---

[1] مجھے یاد ہے کہ میں نے اس واقعہ کے نشانات الغدیر سے معین کئے تھے۔ لیکن اتفاق سے اُس وقت مکمل حوالہ نوٹ نہ کر سکا اور پھر بعد تلاش بسیار بھی نہ مل سکا۔ لہٰذا یہ بھی ممکن ہے کہ واقعہ الغدیر کے علاوہ دوسری ہی کتاب سے لیا ہو۔ ویسے اس واقعہ کا تذکرہ کتاب صفین ص۵۹۹ میں بھی موجود ہے اور کامل ابن اثیر جلد ۳ ص۱۶۵ میں بھی ایک اشارہ ہے۔

اس نے جواب دیا۔ "ارے یہ تو میرا بھائی ہے"۔ آواز آئی۔ "اچھا چھوڑ دے"

لیکن کیا کہنا اخلاص کا دل میں سوچنے لگا کیا خونی رشتہ ایمان پر بھی غالب آسکتا ہے؟ یہ سوچا اور پکارا ــــ "اُس وقت تک نہ چھوڑوں گا جب تک امیرالمومنینؑ اجازت نہ دے دیں" آپ نے فرمایا۔ "اچھا چھوڑ دے" ظاہر ہے کہ اگر امیرالمومنینؑ کی طرف سے یہ خصوصی اجازت نہ ملتی تو ایک بھائی دوسرے بھائی کا کام تمام کر دیتا۔

تو کیا یہ مان لیا جائے کہ راہِ خدا کے یہ مجاہدینؑ اُس مجاہدِ اکبر سے زیادہ اسلام دوستی اور خوفِ خدا رکھتے تھے۔ جس کی تلوار نے رؤساء مشرکین کو موت کے گھاٹ اتارا تھا اور جس کے بازوؤں کے بل بوتے پر اسلام کھڑا ہوا ہے۔

ہرگز نہیں! پھر کیونکر ممکن ہے کہ حق و باطل کا فیصلہ کن' حق کا ہمراز و دم ساز' باطل کا جانی دشمن اپنی زبان پر خلافِ توقع کلمات صرف اس لئے جاری کرے کہ جذبات دین سے مقابل ہو گئے ہیں۔

خدا کی قسم! اگر علی علیہ السلام کو اپنے باپ کے ایمان و عقیدہ پر یقین نہ ہوتا تو کبھی بھی مذمت کرنے والوں کو منع نہ کرتے بلکہ آپ بھی انہی کے ہم آواز اور ہم زبان ہوتے' اس لئے کہ آپ حق کے ساتھی حق کے تابع حق کے رئیس ہونے کی حیثیت سے حق گوئی' حق بیانی اور حق ترجمانی کے زیادہ حق دار تھے۔

بھلا رسولِ اکرمؐ کے بعد علیؑ سے زیادہ اوامر و نواہی احکام و تعلیمات قرآنی کی پابندی کرنے والا اور کون ہو گا۔؟

کیا یہ ممکن ہے کہ قرآن دُشمنِ خدا و رسُولؐ سے براءت اور قطع تعلق کا حکم دے اور علیؑ اُس کی شان میں رطب اللسان رہیں۔ استغفراللہ! علیؑ جیسا مجسمۂ حق کبھی قرآن کی مخالفت نہیں کر سکتا۔

اس مقام پر امیرالمومنین حضرت علی علیہ السلام کے وہ چند فقرات بھی قابلِ توجہ جو آپ نے صفین کے موقع پر دوست و دشمن کو خطاب کر کے فرمائے تھے۔

آپ فرماتے ہیں ــ

"ہم رسول اکرمؐ کے ساتھ میدان جنگ میں اپنے باپ بھائی' چچا اور بیٹے

سب سے جنگ کرتے تھے اور اس جہاد سے ہمارے ایمان وعقیدہ میں زیادتی صبر وتحمل میں اضافہ اور قوتِ جہاد میں صلابت پیدا ہوتی تھی۔"

مسلمانوں کے دینی جذبات اور احقاقِ حق کے رجحانات کی صحیح ترجمانی یہی ہے کہ اگر خاندان تباہ ہوتا ہے تو ہو جائے لیکن قرآنی دستور پر حرف نہ آنے پائے۔!

▲▲▲

اہلبیتِ اطہارؑ کی زبان پر

جب ہم سیرت اہلِ بیتِؑ اطہار کا جائزہ لیتے ہیں تو ہمیں صاف طور پر یہ نظر آتا ہے کہ ان میں سے ہر امام اور ہر معصوم تہمت وافترا کے اِن تمام قلعوں کو مسمار کر رہا ہے جو شیخ بطحا کے ایمان کو پوشیدہ کرنے اور حق کی رونق کو مٹانے کے لئے تیار کئے گئے ہیں تاکہ حق کی رونق و آبرو باقی رہ جائے اور باطل کی بنیادیں منہدم ہو جائیں۔ حق کی آواز گونجنے لگے اور باطل کے نعرے صدا بصحرا ہو جائیں۔

جیسے جیسے باطل نے اپنے جعل وفریب میں اضافہ کیا ویسے ہی ویسے کلمۂ حق کی گونج بڑھتی گئی۔ قلب وجگر حرکت میں آگئے۔ اور فضاء نغمہائے ایمان سے معمور ہو گئی۔ جیسے جیسے باطل کی تاریکیاں بڑھتی گئیں۔ اور اوراقِ تاریخ سیاہ ہوتے گئے۔ ویسے ہی ویسے ایمان کی شعاعوں میں اضافہ ہوتا گیا اور ہدایت کی کرنیں پھوٹتی رہیں تاکہ ظلمات کا دامن چاک ہو جائے اور گم کردہ راہ طالبِ حق کو اس کی حقیقی منزل تک پہنچا دیا جائے۔

ایک شخص نے جس کے کان باطل کی آوازوں سے گونج رہے تھے! امام سجّاد (زین العابدینؑ) علیہ السّلام سے سوال کیا کہ کیا حضرت ابو طالبؑ مومن تھے؟

حضرت نے فرمایا۔ "ہاں"

اس شخص نے چاہا کہ ان تہمتوں کا سرچشمہ بھی معلوم کر لیا جائے جو ایمانِ ابو طالبؑ کے خلاف وضع کی گئی ہیں۔ عرض کی۔

"بعض لوگ تو انھیں کافر سمجھتے ہیں"۔؟

یہ سننا تھا کہ امامؑ کا دل تڑپ گیا۔ ایک مظلومیت بھری آہ کھینچی اور فرمایا:

"تعجب بالائے تعجب! آخر یہ لوگ ابوطالبؑ پر تہمت رکھتے ہیں یا رسولِ اکرمؐ پر! قرآن کریم نے متعدد آیات میں اس بات سے منع کیا ہے کہ کوئی مومن عورت کسی کافر کی زوجیت میں رہے۔ حالانکہ حضرت فاطمہؑ بنتِ اسد بلاشک و شبہ مومنہ بلکہ سابقات میں سے تھیں اور رسولِ اکرمؐ نے انھیں تاحیات حضرت ابوطالبؑ کی زوجیت سے جدا نہیں کیا"۔[1]

امام سجادؑ کے بیان سے صاف طور پر واضح ہو جاتا ہے کہ ایمانِ ابوطالبؑ پر اعتراض کرنا درحقیقت رسولِ اکرمؐ کی شخصیت پر اعتراض کرنے کے مترادف ہے کہ حضورؐ نے قرآنِ کریم کے مکرر حکم کو نافذ نہیں کیا۔ اور آخر تک یونہی ٹالتے رہے۔

قرآن کا منشا تھا کہ ایمان والا دل کفر کے زیرِ سایہ نہ رہے اور معاذاللہ رسولِ اکرمؐ حضرت ابوطالبؑ کی زندگی تک اس کی مخالفت کرتے رہے۔ اس لئے کہ حضرت فاطمہؑ بنتِ اسد کے ایمان میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہ تھی اور نہ ان کے خلاف یہ مصنوعی روایتیں وضع ہوئی تھیں۔ اور نہ کوئی مورخ آج تک اس بات کا قائل ہوا ہے کہ رسولِ اکرمؐ نے اس رشتۂ زوجیت کو منقطع کر دیا تھا۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ رسولِ اکرمؐ کی نظر میں حضرت ابوطالبؑ کا ایمان پوری طرح ثابت تھا ورنہ آپ کسی طرح بھی حکمِ قرآنی کی مخالفت نہیں کر سکتے تھے۔

حضرت ابوطالبؑ کے ایمان پر حملہ کرنا ایک اتنی بڑی جرأت ہے جس میں خود رسولِ اکرمؐ بلکہ بنیادِ اسلام کو مقابل قرار دے کر یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ معاذاللہ رسولِ اکرمؐ بھی وحیِ الٰہی کی مخالفت کرتے تھے اور آپ کو بھی تعلیماتِ اسلامیہ اور احکامِ الٰہیہ کا مطلق خیال نہ تھا۔

اس کے بعد امام محمد باقرؑ کا دور آتا ہے۔ ایک شخص آپ سے اس حدیثِ مجہول کے بارے میں سوال کرتا ہے۔

---

[1] الحجۃ ص۲۴، الحدیدی ج ۳ ص۳۱۲، الغدیر ج ۷ ص۳۸۱، اعیان الشیعہ ج ۳۹ ص۱۳۶-۱۳۷
شیخ الابطح ص۷۶

"ابوطالبؑ جہنم میں ہیں"؟ (معاذاللہ)

تو آپ فرماتے ہیں:

"اگر ساری دنیا کا ایمان ایک پلڑے میں رکھا جائے اور حضرت ابوطالبؑ کا ایمان دوسرے پلڑے میں تو ابوطالبؑ کا پلہ بھاری رہے گا"۔

پھر فرماتے ہیں:۔

"کیا تجھے معلوم نہیں کہ حضرت امیرالمومنینؑ اپنی زندگی میں حضرت عبداللہؑ، حضرت آمنہ اور حضرت ابوطالبؑ کی طرف سے حج کرنے کا حکم دیا کرتے تھے اور اپنے بعد کے لئے وصیت بھی فرما گئے تھے"۔[1]

ابوطالبؑ کا ایمان عام انسانوں کے ایمان سے مختلف حیثیت رکھتا ہے، لوگوں کا ایمان تقلیدی ہو سکتا ہے لیکن ابوطالبؑ کا ایمان عرفان و بصیرت کا نتیجہ تھا۔ لوگوں کا ایمان اپنے لئے ہوتا ہے اور حضرت ابوطالبؑ کا ایمان جہاد و دفاع اور نصرت و امداد کے لئے تھا۔

ظاہر ہے کہ ایسے شخص کا ایمان جو ایک مرکزی شہر کا رئیس، ایک جانِ عرب خاندان کا ذمہ دار، صاحبِ عظمت و جلالت اور مالک جاہ و حشم ہو، بڑی عظمت رکھتا ہے۔ جب کہ ایمان لانے والا یہ بھی جانتا ہے کہ ایمان قبول کرنے کے بعد نہ یہ جاہ و حشم رہ جائے گا اور نہ یہ شان و عظمت، بلکہ ایک ایسے یتیم کی متابعت کرنا پڑے گی جو کل تک اپنی ہی آغوش میں پل رہا تھا۔

اس کے بعد امامؑ نے امیرالمومنینؑ کے طرزِ عمل سے استدلال کر کے یہ واضح کر دیا کہ حج جیسا اہم فریضہ جو ارکانِ اسلام میں شمار ہوتا ہے کسی ایسے انسان کی طرف سے نہیں ہو سکتا جس کا اس اسلام سے کوئی رشتہ اور اس کے ارکان سے کوئی تعلق نہ ہو۔

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کے اقوال و ارشادات میں ایک ایسا ذخیرہ پایا جاتا ہے جس میں آپ نے اپنے جدِّ بزرگوار کی توصیف و تعریف اور مدح و ثنا کی ہے اور

---

[1] منہج القبور ج ۱ ص۱۸۹، الحجۃ ص۱۰، شیخ الابطح ص۳۲، الغدیر ج ۷ ص۱۸۰/۳۹۱، اعیان الشیعہ ج ۳۹ ص۱۳۶
الحدیدی ج ۲ ص۳۱۲، شرح النہج میں روایت علی بن محمد کی طرف منسوب ہے حالانکہ اصل میں محمد بن علی ہے

جسا زعناصر کی تردید فرمائی ہے۔

تب وہ دور تھا جب بنی اُمیّہ کے مظالم کا خاتمہ ہو رہا تھا اور ایک ایسی حکومت کی
تھی جس کا ظاہری شعار حق کو اہلِ حق تک پہنچانا اور بنی ہاشم کی حمایت کرنا تھا۔ ظاہر
ہی نتیجہ یہ تھا کہ علویوں کی گردن سے کچھ عرصے تک یہ تلواریں ہٹ جائیں۔ اِن
سے اٹھا دیے جائیں، ہادیانِ حق کو اتنا موقع مل جائے کہ وہ اپنے پیغام کو
تک پہنچا سکیں۔ جب تک کہ برسرِ اقتدار آنے والی حکومت مستقر نہ ہو جائے اور دوبارہ
شروع نہ ہو۔

حالتِ زمانہ نے آپ کو اتنا موقع دے دیا کہ آپ اسلامی تعلیمات اور الٰہی احکام کو
حقانیت کی شعاعوں اور ہدایت کی کرنوں کو عالم کے ہر امکانی حصّے تک پہنچائیں۔ چنانچہ
میں ثانی حد تک اپنے جدِّ محترم کے بارے میں بھی ارشادات فرمائے ہیں۔

جب کسی شخص نے سوال کر لیا کہ کیا ابوطالبؑ جہنم میں ہیں؟ تو فرما دیا کہ یہ جھوٹ ہے، ایسی
نہیں لائے۔ ابوطالبؑ کی مثال اُن اصحابِ کہف کی ہے جنھوں نے ایمان کو چھپایا
کیا۔ اللہ نے ان لوگوں کو دُہرا اجر عنایت کیا۔ حضرت ابوطالبؑ نے بھی ایمان کو
اللہ نے ان کو بھی دہرا اجر دیا ہے۔ حضرت ابوطالبؑ دنیا سے اُس وقت تشریف
جب جنت کی بشارت دے دی گئی ہے۔

اس کے بعد نہایت ہی تعجب کے ساتھ فرمایا کہ آخر یہ کیسی باتیں ہیں۔؟ ابوطالبؑ کے انتقال
یہ وحی لے کر آئے تھے کہ ”اے محمّدؐ! اب مکّہ سے نکل چلو، اب یہاں تمہارا
نہیں ہے۔“ ؎۱

امام صادقؑ کے اس کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ جناب ابوطالبؑ کو اللہ تعالیٰ نے دُہرا
کیا ہے اس لئے کہ انھوں نے مصلحتِ وقت کا لحاظ کرتے ہوئے اپنے ایمان کو مخفی رکھا
نہیں ہونے دیا۔ یعنی اگر ایک طرف ایمان کا اجر و ثواب ہے تو دوسری طرف اس تقیہ
کہ ایمان کا مخفی رکھ لینا اور اس کا کسی پر ظاہر نہ ہونے دینا ہر شخص کے بس کی بات

؎۱ ص ۱۸ / ۱۱۵، الحدیدی ج ۳ ص ۳۱۲، الغدیر ج ۷ ص ۱۸۱ / ۳۹۱، معجم القبور ج ۱ ص ۱۹۱
الشیعہ ج ۳۹ ص ۱۳۲

نہیں ہے۔

اس کے بعد آپ نے اصحابِ کہف کی مثال دے کر یہ واضح کر دیا کہ تقیہ پر دُہرا اجر ملنا کوئی نئی بات نہیں ہے اور حضرت ابوطالبؑ کا تقیہ میں زندگی گزار دینا بھی تاریخ کا کوئی انوکھا حادثہ نہیں ہے، اس سے پہلے نصِ قرآنی کے بموجب اصحابِ کہف میں یہ تمام باتیں پیدا ہو چکی ہیں۔

امام علیہ السّلام کا یہ فرمانا کہ پروردگارِ عالم نے ابوطالبؑ کو دُنیا ہی میں جنّت کی بشارت دے دی تھی، بظاہر عجیب معلوم ہوتا ہے لیکن یہ تعجب اُس وقت ختم ہو جاتا ہے جب ہمارے سامنے ایک ایسی حدیث ؎۱ پیش کی جاتی ہے جس میں جنّت کی بشارت کا تذکرہ ہے اور اس میں ایسے نام شمار کرائے گئے ہیں جن کو جہاد، نصرت، قربانی، دفاع اور امدادِ دین میں حضرت ابوطالبؑ سے کوئی نسبت نہ تھی۔

اس کے بعد امامؑ اپنے دعوے کو ایک مستحکم دلیل سے مضبوط بناتے ہیں۔ جس کا مضمون یہ ہے کہ ایک ایسا انسان جس کے مرتے ہی نبوت کا سکون و قرار مٹ جائے، وحیِ الٰہی کو یہ کہہ کر مکّہ سے نکلنے کا حکم دینا پڑے کہ اب تمہارا کوئی مددگار نہیں رہا۔ اسے کسی طرح بھی کافر نہیں کہا جا سکتا۔

ایک مرتبہ امام جعفر صادقؑ نے یونس بن نباتہ سے سوال کیا۔ یونس! لوگوں کا حضرت ابوطالبؑ کے بارے میں کیا خیال ہے؟ عرض کی، لوگ کہتے ہیں کہ وہ جہنم میں ہیں اور اُن کا مغز سر اُبل رہا ہے۔

آپ نے غصّے میں آ کر فرمایا۔ یہ دُشمنِ خدا جھوٹے ہیں۔ ابوطالبؑ انبیاء و صدیقین، صلحاء و شہداء کے ساتھ ہیں اور ان حضرات سے بہتر کوئی رفیق ممکن نہیں ہے ؎۲

ایک مرتبہ ایک شخص نے سوال کر لیا۔ لوگ ابوطالبؑ کو کافر خیال کرتے ہیں۔ آپ نے فرمایا یہ جھوٹے ہیں۔ کیا وہ بھی کافر ہو سکتا ہے جس کا یہ قول ہو:

؎۱ عشرۂ مبشرہ کی طرف اشارہ ہے۔ (جوادی)

؎۲ حجتہ ص ۱۷، شیخ الابطح ص ۳۲/۲۵، الغدیر ص ۳۹۲

الم تعلموا انا وجدنا محمداً
نبیا کموسیٰ خط فی اول الکتب[1]

"ہم نے محمدؐ کو موسیٰ کی طرح نبیِ برحق پایا ہے"۔

کبھی فرماتے تھے آخر ابوطالبؑ کیسے کافر ہو سکتے ہیں جن کا قول یہ ہے:

لقد علموا ان ابننا لا مکذب لدینا ولا یعبا بقول الاباطل
وابیض یستسقی الغمام بوجھہ
ثمال الیتمیٰ عصمۃ للارامل[2]

"دنیا جانتی ہے کہ میرا فرزند نہ غلط گو ہے اور نہ دروغ بیان
وہ ایسا مبارک ہے جس کے طفیل میں بارش ہوتی ہے۔ وہ یتیموں اور بیواؤں کا
والی ووارث ہے۔"

مقصد یہ ہے کہ وہ انسان کس طرح کافر فرض کیا جا سکتا ہے جو محمدؐ کو نبی، صادق بابرکت، فیاض، والیٔ ایتام، وارثِ بیوگان اور ایک وجیہ و شکیل شخصیت تسلیم کرتا ہو۔

آپ فرماتے ہیں کہ امیرالمومنینؑ کو حضرت ابوطالبؑ کے اشعار بہت زیادہ محبوب تھے آپ چاہتے تھے کہ ان کی تدوین ہو جائے تاکہ پڑھے جائیں اور مشتہر ہوں۔ چنانچہ آپ اکثر حکم دیا کرتے تھے کہ ان اشعار کو خود پڑھو اور اپنے بچوں کو پڑھاؤ اس لئے کہ حضرت ابوطالبؑ دینِ خدا پر تھے اور ان اشعار میں بڑا علم ہے[3]

امیرالمومنینؑ کی دیگر شہادتوں کے علاوہ خود یہ حدیث بھی حضرت ابوطالبؑ کے درجۂ عظیم اور بلند منزل کی نشاندہی کر رہی ہے۔ امامؑ کا منشا یہ ہے کہ ان کے اشعار نقل کئے جائیں ان کی تعلیم دی جائے اور انھیں حفظ کیا جائے تاکہ ان سے رسالت کا عرفان حاصل ہو اور مذہبی معلومات میں اضافہ ہو۔

---

[1] الغدیر ج ۷، ص۳۹۲
[2] الغدیر ج ۷، ص۳۹۲
[3] الحجۃ ص۲۵، الغدیر ج ۷، ص۳۹۵

اس کے بعد امام موسیٰ کاظمؑ کا دور آتا ہے۔ درست ابن منصور آپ سے حضرت ابوطالبؑ کے بارے میں سوال کرتے ہیں لیکن اس سوال کا تعلق اُن کے ایمان سے نہیں ہے اس لئے کہ یہ بات درست کی نظر میں واضحات میں سے تھی، بلکہ سوال یہ ہے کہ کیا حضرت ابوطالبؑ رسولِ اکرمؐ کے لئے بھی حجتِ خدا تھے؟

آپ نے فرمایا نہیں وہ امانت دار وصایائے مرسلین تھے۔ جنھیں آنحضرتؐ تک پہنچا دیا تھا۔
عرض کی کیا یہ وصیتیں اس لئے دی گئی تھیں کہ یہ رسولِ اکرمؐ پر حجتِ خدا تھے؟
فرمایا، نہیں۔ اگر یہ حجت ہوتے تو وصیتیں ان کے حوالے کیوں کرتے خود ہی کیوں نہ رکھتے
پھر ابوطالبؑ کا موقف کیا ہے؟
وہ پیغمبر اکرمؐ کے احکام کے معترف تھے۔ اور اسی لئے تمام وصایا ان کے حوالے کر دیئے تھے۔[1]

یہ حدیثِ مبارک ہمارے اس دعوے کی مستحکم دلیل ہے کہ ابوطالبؑ ایک تاریخی اور دینی ضرورت تھے۔ جن کے ذریعہ پروردگارِ عالم کو ملّتِ ابراہیمی کی شعاعیں رسولِ اکرمؐ تک پہنچانا تھیں اور جنھیں ابراہیمیت اور محمدیت کے درمیان واسطہ بننا تھا۔

اندازِ حدیث سے صاف ظاہر ہے کہ سوال کرنے والا حضرت کے ایمان کی طرف سے بالکل مطمئن تھا۔ وہ یہ جانتا تھا کہ آپ تمام انبیاء کی وصیتوں کے امانت دار ہیں ایسا انسان کافر نہیں ہو سکتا اس لئے اس نے گفتگو کا رُخ بدل کر اُس اہم منزل کا سوال کیا جو اُس کی نظر میں ابوطالب کے لئے ہو سکتی تھی۔ یعنی کیا وہ رسولِ اکرمؐ کے بھی حجتِ خدا تھے۔؟ امام نے نہایت ہی صراحت کے ساتھ جواب دے کر موقف کو واضح فرما دیا اور بتلا دیا کہ وہ رسولِ اکرمؐ کے دین اور ان کی تعلیمات کے معترف و مقر تھے اور بس!

ابان بن محمود نے امام رضا علیہ السّلام کو لکھا۔ میں آپ پر فدا، اب تو مجھے حضرت ابوطالبؑ کے ایمان میں شک ہونے لگا ہے۔ آپ نے فوراً جواب میں تحریر فرمایا:

من یشاقق الرسول من بعد ما تبین لہ الھدیٰ ویتبع غیر سبیل
المومنین نولہ ما تولیٰ ونصلہ جھنم وساءت مصیراً۔ (نساء ۱۱۵)

---

[1] العباس ص۱۸، الغدیر جلد ۷، ص۳۹۵

"یعنی جو لوگ ہدایت کے واضح ہونے کے بعد رسولؐ سے اختلاف کریں گے اور مومنین کے راستہ کو ترک کردیں گے اُن کا حشر بُرا ہوگا۔ وہ جہنمی ہیں اگر تو نے ابوطالبؑ کے ایمان کا اقرار نہ کر لیا تو تیرا انجام بھی جہنم ہوگا۔"[۱]

امام رضاؑ کے اس جواب سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابوطالبؑ کے ایمان میں شک کرنا گویا رسولِ اکرمؐ کی شخصیت کا انکار ہے حضرت ابوطالبؑ کا ایمان اپنی وضاحت و صراحت کی بناء پر شک و شبہ کے قابل نہیں ہے اب اگر اس کے بعد بھی کوئی شخص شک کرتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ رسولِ اکرمؐ کا بھی مخالف ہے اور ہدایت کے واضح ہونے کے بعد بھی اس سے چشم پوشی کرتا ہے۔

ظاہر ہے کہ جو شخص ہدایت سے اعراض کرے گا۔ مومنین کے راستے سے الگ ہو جائے گا۔ وہ دائرہ ایمان سے خارج ہو جائے گا۔ اس کے قدم صراطِ مستقیم اور جادۂ حق سے باہر ہوں گے اور ایسے شخص کا ٹھکانہ جہنم ہوگا۔

اس کے علاوہ حضرت ابوطالبؑ کے ایمان میں شک کرنا رسول اکرمؐ کو اذیت دینا ہے اور آنحضرتؐ کا اذیت دینے والا بنص قرآنی مستحق عذابِ الٰہی و لعنت ابدی ہے ارشاد ہوتا ہے۔

ان الذین یوذون اللہ و رسولہ لعنھم اللہ فی الدنیا والآخرۃ
واعدلھم عذابًا مھینًا ——— (احزاب ۵۷)

"جو لوگ خدا و رسول کو اذیت دیتے ہیں ان پر دُنیا و آخرت میں لعنت ہے اور ان کے لئے دردناک عذاب مہیا کیا گیا ہے۔"

والذین یوذون رسول اللہ لھم عذاب الیم ——— (توبہ ۶۱)

"جو لوگ رسول خدا کو اذیت دیتے ہیں ان کے لئے دردناک عذاب ہے"

خود حدیثِ نبویؐ میں وارد ہوا ہے:—

"من اٰذی شعرۃ منی فقد اٰذانی ومن اٰذانی فقد اٰذی اللہ۔

"جس نے میرے ایک بال کو بھی اذیت دی اُس نے مجھے اذیت دی اور جس نے مجھے اذیت دی اُس نے خدا کو اذیت دی۔"[۲]

---

[۱] الحدیدی ج ۳ ص ۳۱۱، الحجۃ ص ۱۶، الغدیر ج ۷ ص ۳۸۱/۳۹۹، معجم القبور ج ۱ ص ۱۸۹، اعیان الشیعہ ج ۳۹ ص ۱۳۶

[۲] صوعق محرقہ ص ۱۱۱

امام حسن عسکری علیہ السلام اپنے آبائے کرامؑ کے حوالے سے ایک مفصل حدیث نقل فرماتے ہیں جس کا ایک حصّہ یہ ہے:

"پروردگارِ عالم نے رسول اکرمؐ کی طرف وحی فرمائی کہ میں نے تمہاری تائید دو قسم کے شیعوں سے کی ہے کچھ بظاہر تمہاری نصرت کرتے ہیں اور کچھ پوشیدہ طور پر۔ جو لوگ درپردہ کمک کرتے ہیں اُن کے سردار اور اُن میں سب سے افضل ابوطالبؑ ہیں اور جو لوگ بظاہر امداد کرتے ہیں اُن کے سردار ابوطالبؑ کے فرزند علیؑ ابنِ ابی طالبؑ ہیں"

اس کے بعد فرمایا کہ ——

"ابوطالبؑ کی مثال اُس مومن آلِ فرعون کی ہے جو اپنے ایمان کو چھپائے ہوئے تھا۔"[۱]

امام کے ارشاد کا مقصد یہ ہے کہ رسولِ اکرمؐ کے ناصرین میں ایک جماعت اُن لوگوں کی بھی ہے جو آپ کی درپردہ اعانت کرتے تھے اس لئے کہ زمانہ کے حالات اظہارِ ایمان کے لئے سازگار نہ تھے اور مصلحتِ وقت اعلانِ امر کی مقتضی نہ تھی جس طرح کہ قرآن مجید میں ملائکہ کی خفیہ نصرت کا تذکرہ مکرر و مسلسل طور پر نظر آتا ہے، ارشاد ہوتا ہے:—

انزل جنودا لم تروھا ——— (توبہ ـ ۲۶)

وایدہ بجنود لم تروھا ——— (توبہ ـ ۴۰)

ان یمدکم ربکم بثلاثۃ اٰلاف من الملائکۃ منزلین
——— (آل عمران ـ ۱۲۴)

یمددکم ربکم بخمسۃ اٰلاف من الملائکۃ مسومین ——— (آلِ عمران ـ ۱)

انی ممدکم بالف من الملائکۃ مردفین (انفال ـ ۹)

اور اس کے علاوہ متعدد آیتیں۔

اس کے بعد آپ حضرتؑ کے ایمان کو مومن آلِ فرعون کے ایمان سے تشبیہ دیتے ہیں۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح مومن آلِ فرعون نے اپنے ایمان کو پوشیدہ نہ کیا ہوتا تو حضرت موسیٰ کا بچنا دشوار اور اُن کا قتل یقینی تھا۔ اسی طرح اگر حضرت ابوطالبؑ نے اپنے ایمان کو پردہ میں رکھ کر

---

[۱] الحجۃ ص ۱۱۵ الغدیر ج ۷ ص ۳۶۸

کفار کو اپنا ہم مسلک وہم مشرب ظاہر نہ کیا ہوتا تو نبی اکرمؐ کی نصرت سخت دشوار ہوجاتی اور حضرت کا بچنا ناممکن ہوجاتا۔

کسی مسلمان کو یہ اختیار نہیں ہے کہ ان تمام اقوال وارشادات کو رشتہ داری اور قرابتداری کے جذبات پر محمول کردے اس لئے کہ اہلبیتِ معصومینؑ کی عصمت وطہارت کی شہادت کے لئے قرآن مجید میں آیتِ تطہیر موجود ہے اور زبان پیغمبرؐ پر حدیثِ ثقلین۔

آیتِ تطہیر کا اعلان ہے کہ یہ ہر رجس وعیب سے مبّرا ومنزہ ہیں اور حدیثِ ثقلین بتا رہی ہے کہ یہ قرآن کی عدیل ومثیل ہیں جو معجزۂ پیغمبرؐ، رشتہ زمین وآسمان اور باعثِ نجاتِ امتِ اسلامیہ ہے۔

ایسی صریح آیۂ مبارکہ اور ایسی متفق علیہ حدیث کے بعد یہ تو ہم بھی نہیں ہوسکتا کہ ائمہ اطہارؑ حق سے الگ ہوکر صرف رشتہ اور قرابت کا لحاظ کریں گے۔ ؟

قرآن کریم میں بے شمار آیات اور زبان رسالت کے مختلف ارشادات اس بات کا صریحی اعلان کر رہے ہیں کہ یہ شخصیتیں کسی وقت بھی حق سے اعراض نہیں کر سکتیں۔ ان کی فکر کسی وقت بھی رشتہ وقرابت میں اسیر نہیں ہوسکتی۔ یہ اسبابِ نجات، عدیلِ قرآن اور مصاحبِ حق ہیں۔

اس کے علاوہ قرآن مجید میں بکثرت آیتیں ایسی بھی ہیں جن میں دشمنانِ خدا کی دوستی سے روکا گیا ہے خواہ ان سے کسی قدر مضبوط رشتہ کیوں نہ ہو بلکہ اگر وہ باپ اور بھائی بھی ہوں۔ جب بھی ایک مسلمان کا فریضہ ہے کہ ان سے ترک موالات اور ان کی طرف سے برأت کا اعلان کرے میں نے مانا کہ حضرت ابوطالبؑ ائمہ اہلبیتؑ کے خاندانی بزرگ اور مورثِ اعلیٰ تھے لیکن کیا یہ بھی تصور ہوسکتا ہے کہ صرف اسی بزرگی اور قرابت کی بناء پر یہ حضرات قرآن کریم کے احکام وتعلیمات کو ٹھکرا دیں گے؟ استغفر اللہ!

حقیقت یہ ہے کہ ان مقدس شخصیتوں کے بارے میں اس قسم کے تصورات اسلامؑ رسولِ اسلامؐ اور قرآنِ کریم پر کھلا ہوا حملہ ہیں۔ قرآن کی عصمت وطہارت پر حملہ کرنے والا کبھی بھی مسلمان نہیں کہا جاسکتا۔

اصحابؓ وعلماء کی زبانؐ پرؒ

ہماری نظر میں ایسے اصحاب کرام بھی ہیں جن کی آنکھوں پر لذات دُنیا اور اغراضِ مادیہ کے حجابات غالب نہیں تھے بلکہ انھوں نے نور ایمان کا مطالعہ ومشاہدہ کیا تھا اور اس کو علی الاعلان ظاہر بھی کیا تھا۔ ہمارا موضوعِ کلام اُن تمام اقوال وارشادات کا تذکرہ نہیں ہے۔ اس لئے کہ یہ بات کتاب کو اس کے حدود سے خارج کردے گی۔ لیکن تاہم چاہتے ہیں کہ اربابِ انصاف کے سامنے ان ارشادات کا بھی ایک نمونہ پیش کردیں تاکہ حضرت ابوطالبؑ کی عظمت کا اور بھی صحیح اندازہ ہوسکے۔

حضرت ابوبکر کا اعلان ہے کہ ابوطالبؑ کا اُس وقت تک انتقال نہیں ہوا جب تک کہ انھوں نے لا الٰہ الا اللہ مُحَمَّدٌ رسول اللہ نہیں کہہ لیا۔[۱]

اِسی کلام کی تائید حضرت عباس نے بھی کی ہے۔[۲]

عبداللہ بن عباس سے ایک شخص سوال کرتا ہے کہ کیا حضرت ابوطالبؑ مسلمان تھے۔ ؟ آپ نے جواب دیا، بھلا وہ شخص کیونکر مسلمان نہ ہوگا جس کا قول یہ ہو:۔

وقد علموا ان ابننا لا مکذب علینا ولا یعبا بقول الاباطل

یاد رکھو ابوطالبؑ کی مثال اصحاب کہف کی ہے جن کو ایمان کے پوشیدہ کرنے اور کفر کے اظہار پر دُہرا اجر عنایت ہوا تھا۔[۳]

---

۱ شرح النہج ج ۳ ص۳۱۲ شیخ الابطح ص۷۱، الغدیر ج ۷ ص۳۷۰/۴۰۱، اعیان الشیعہ ج ۳۹ ص۱۳۶

۲ شیخ الابطح ص۷۱، الغدیر ج ۷ ص۳۹۹/۴۰۱، اعیان الشیعہ ج ۳۹ ص۱۳۶

۳ الحجۃ ص۹۵، ص۱۱۵، الغدیر ج ۷ ص۳۹۵

حضرت ابوذر جیسا جلیل القدر صحابی جس پر نہ دُنیا کے سیم وزر کا کوئی اثر ہوا اور نہ معاویہ کے رعب و دبدبہ کا، صاف لفظوں میں اعلان کر رہا ہے کہ خدائے وحدہٗ لاشریک کی قسم حضرت ابوطالبؑ کا اُس وقت تک انتقال ہی نہیں ہوا جب تک کہ وہ اسلام نہیں لائے۔[1]

حسان بن ثابت اپنے اشعار میں کہتے ہیں۔

فان تبکوا ما لکا

فابکوا الوفی أخا الوفیٰ

"اگر کسی مرنے والے پر رونا چاہتے ہو تو وفادار اور وفادار کے بھائی پر گریہ کرو۔"

سبطِ ابنِ جوزی کہتے ہیں کہ ان سے مُراد حضرت حمزہؓ اور حضرت ابوطالبؑ ہیں۔

حضرت ابوطالبؑ کے ایمان کے یہ اعلانات کسی ایک دور یا کسی ایک طبقہ سے مخصوص نہیں ہیں بلکہ جس انسان پر بھی اغراض و خواہشات کا غلبہ نہیں ہوا، جس کی آنکھوں پر تعصب و عداوت کے دبیز پردے نہیں پڑے وہ اسی اعلان میں سرشار نظر آتا ہے۔ بلکہ میں تو یہ بھی دیکھتا ہوں کہ اگر کسی شخص نے عداوت کرنا بھی چاہی تو جلالت قدر نے بالآخر اپنا اعتراف کرا ہی لیا۔

عباسی بادشاہ عبداللہ مامون جس کی حیثیت سے کوئی شخص ناواقف نہیں ہے وہ بھی یہ کہتا ہوا نظر آتا ہے کہ ابوطالبؑ اپنے ان اشعار کی بنا پر قطعی مسلمان تھے۔

نصرت الرّسول رسول الملیك ... ببیض تلالأ کلمع البروق

أذب واحمی رسول الألٰه ... حمایة حَام علیه شفیق

وما ان ادبّ لاعدائه ... دبیب البکار حذار الفنیق

ولکن ازیر لهم سامیا

کما زار لیث بغیل مضیق [2]

میں نے خدا کے رسولؐ کی نصرت بجلی کی طرح چمکتی ہوئی تلواروں سے کی ہے۔

میں نے ایک شفیق حمایت کرنے والے کی طرح ان کی حمایت کی ہے

میں ان کے دشمنوں کے سامنے اس طرح ڈر کر نہیں چلتا تھا جیسے اطفال حیوان اپنے بڑے سے دبتے ہیں۔

بلکہ میں شیر نر کی طرح ڈکارتا ہوا سامنے آتا تھا۔

---

[1] الغدیر ج ۷ ص۳۹۹

[2] الحدیدی ج ۳ ص۳۱۴، الغدیر ج ۷ ص۳۳۷، الحجۃ ص۱۴۵، دیوانِ ابی طالب ص۱۰

ابوجعفر اسکافی جاحظ کے رسالۂ عثمانیہ کی رد کرتے ہوئے حضرت ابوطالبؑ کا تذکرہ ان الفاظ میں کرتے ہیں،

"حقیقت یہ ہے کہ ابوطالبؑ رسولِ اکرمؐ کے باپ تھے، وہی اُن کے کفیل مددگار اور حامی تھے۔ اگر وہ نہ ہوتے تو دین قائم نہ ہوتا۔ لیکن افسوس کہ اغلب روایات کی بناء پر وہ مسلمان نہ تھے۔"[1]

ہمیں انتہائی تعجب ہے۔ اور ہم تو یہ تصور بھی نہیں کر سکتے کہ یہ آخری فقرہ بھی ابوجعفر اسکافی ہی کا ہوگا۔ اس لئے کہ یہ آخری فقرہ اپنے سابقہ فقرات سے بالکل متضاد حیثیت رکھتا ہے اور علامہ اسکافی خود بھی حضرت ابوطالبؑ کے ایمان کے معترف ہیں۔

ہمارے خیال کی مزید تصدیق اس بات سے ہوتی ہے کہ ہمارے بیان کا ماخذ ان کا اصل رسالہ نہیں ہے بلکہ اس کا وہ خلاصہ ہے جو حسن سندوبی نے تیار کیا ہے۔ اور یہ وہ حسن سندوبی ہیں جن کی اہلبیتؑ دشمنی اور معاویہ و یزید دوستی کا اظہار مقدمہ میں کیا جا چکا ہے۔ پھر اگر یہ فقرہ تسلیم کر بھی لیا جائے تو یہ ان کی ذاتی رائے کو ظاہر نہیں کرتا بلکہ اس میں اغلب روایات کا مفہوم بیان کیا گیا ہے جس کو ذاتی عقیدے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ چنانچہ ایک دوسرے مقام پر آپ نے ان لوگوں کا بھی تذکرہ کیا ہے جو ابوطالبؑ کی وجہ سے مسلمان ہوئے تھے۔ ملاحظہ ہو۔

ابوطالبؑ ہی کی وجہ سے بنی ہاشم نے بنی مخزوم، بنی سہم اور بنی جمع سے مقابلہ کیا۔ انھیں کی وجہ سے شعیب کی مصیبتیں برداشت کیں اور انھیں کی وجہ سے حضرت فاطمہ بنتِ اسد مسلمان ہوئیں جن کی شخصیت ابوبکر وغیرہ سے زیادہ اہم تھی۔ اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ آپ اسلام نہیں لائے تو یہ صرف تقیہ تھا۔"[2]

---

[1] رسائلِ جاحظ ص۳۲

[2] رسائل جاحظ ص۵۱

اس کے علاوہ علامہ اسکافی کا صحیح مذہب ابنِ ابی الحدیدی کے بیانات سے دریافت کیا جاسکتا ہے۔

انتہا یہ ہے کہ جاحظ جیسا متعصب انسان بھی جب حضرت ابو طالبؑ کا تذکرہ اپنے رسالہ عثمانیہ میں کرتا ہے تو اس بات پر مجبور ہو جاتا ہے کہ حضرت علی علیہ السلام کے سابق الاسلام ہونے پر ابو طالبؑ کی طرف سے کوئی اعتراض نہ کرسکے۔ چنانچہ کہتا ہے:

"کیا تجھے معلوم نہیں کہ قریش بلکہ تمام اہلِ مکہ میں نبی کریمؐ کو اذیت دینے کی جراءت اُس وقت تک نہیں ہوئی جب تک ابو طالبؑ زندہ رہے۔" ؎۱

تذکرۃ الخواص کے مؤلف ابن جوزی نے جناب ابو طالبؑ کا تذکرہ کرتے ہوئے پہلے امیر المومنینؑ کے اقوال وارشادات نقل کئے ہیں۔ اس کے بعد خود جناب ابو طالبؑ کے کارہائے نمایاں بیان کئے ہیں۔ اور آخر میں تحریر فرمایا ہے۔

"حضرت ابو طالبؑ کے اہلِ جنت ہونے میں کوئی تامل نہیں ہے اس لئے کہ اس کے دلائل وشواہد حد واحصاء سے باہر ہیں اور نبی کریمؐ کی نصرت میں آپ کا خاص اہتمام۔ کفار ومشرکین سے دفاع کرنے میں انتظامِ مخصوص۔ رسولِ اکرمؐ کا آپ کی موت پر گریہ، پورے سال کا عام الحزن قرار دینا، دعائے رحمت واستغفار، ایک مدت تک دعائے خیر سے یاد کرتے رہنا۔ یہ باتیں میرے دعوے کے اثبات کے لئے کافی ہیں۔" ؎۲

اس کے بعد مؤلف نے ائمہ اطہارؑ کے اقوال اور حضرت ابو طالبؑ کے اشعار وارشادات سے استدلال کرتے ہوئے آخر میں بیان کیا ہے کہ:

"کسی مورخ نے آج تک حضرت علیؑ پر یہ اعتراض نہیں کیا کہ آپ کے والد بزرگوار کفار میں سے تھے۔ حالانکہ معاویہ، عمرو عاص، عبداللہ بن زبیر اور مروان جیسے دشمنانِ جان موجود تھے، جنھوں نے آپ کی تنقیص وتوہین میں کوئی دقیقہ

؎۱ رسائل جاحظ ص۵

؎۲ تذکرۃ الخواص ص۱۰، ۱۱

نہیں اٹھا رکھا تھا۔ مزید لطف یہ ہے کہ آپ برابر اُن کے آباو اجداد کا تذکرہ فرمایا کرتے تھے اور ان کے کفر وشرک کو طشت ازبام کیا کرتے تھے۔

درحقیقت یہ طرزِ تاریخ آپ کے اسلام پر بہترین دلیل ہے بلکہ اس بات کو بھی واضح کرتا ہے کہ آپ کے کفر کا قائل انتہائی متعصب ترین انسان ہے۔

اے صاحبِ انصاف! ذرا دیکھ تو سہی ان شپرہ چشم افراد نے نورِ آفتاب کو کس طرح چھپا دیا ہے۔" ؎۱

حقیقت یہ ہے کہ مولف کے یہ کلمات ایک منطقی استدلال اور واقعی برہان کی حیثیت رکھتے ہیں۔ بھلا یہ کیونکر ممکن ہے کہ امیر المومنینؑ ان کے آباو اجداد کی حقیقت بیان کریں اور وہ لوگ اس نکتہ سے غافل ہو جائیں۔ میرا تو عقیدہ ہے کہ اگر ان دشمنانِ دین کو حضرت ابو طالبؑ کے اسلام میں ذرا بھی شک ہوتا تو وہ امیر المومنینؑ کے مقابلے میں اس کا تذکرہ ضرور کرتے۔ یہ لوگ تو ایسی تہمتوں پر بھی آمادہ تھے جن سے ایمان، انسانیت، ضمیر اور وجدان سب شرمندہ ہو جائیں۔ ان لوگوں کا سکوت اس بات کی واضح دلیل ہے کہ آپ کا اسلام دشمنوں کی نظر میں بھی واضحات کی حیثیت رکھتا تھا۔

مورخین میں اس مسئلے پر اختلاف ہے کہ ابو طالبؑ مسلمان ہوئے تھے یا کفر ہی پر باقی رہے تھے۔ دونوں طرف کے دلائل ہیں دونوں طرف احادیث رسولؐ ہیں۔ مجھے اس مسئلے پر رائے دینے کی جراءت نہیں ہوسکتی لیکن میں صرف اتنی بات کہنا چاہتا ہوں کہ حضرت ابو طالبؑ ایک مردِ مومن تھے۔ اس لئے کہ انسان کسی قدر بھی عطوف ورحم کرنے والا ہو۔ کتنا بھی اپنی اولاد اور اپنے اعزاز سے محبت کرنے والا ہو لیکن وہ کسی وقت بھی اُس نظریئے یا عقیدہ سے غافل نہیں ہوسکتا جو اس کے قریب یا دشتہ دار کے ذہن میں پایا جارہا ہے بلکہ جس کی بنا پر وہ اپنے دین کو تباہ وبرباد کرکے ایک دوسرے دین کی بنیاد ڈالنا چاہتا ہے اس لئے کہ انسان کو اپنا مذہب بہت عزیز ہوتا ہے وہ اس کا احترام کرتا ہے، اس پر جان قربان کرتا ہے۔ بلکہ اپنا عزیز قریب، باپ، بیٹا اور بھائی بھی اس کی مخالفت

؎۱ تذکرۃ الخواص ص۱۰، ۱۱

کرتاہے. تو اُسے قتل کرنے پر آمادہ ہوجاتا ہے.

ظاہر ہے کہ جب یہ عام انسان کا دستور ہے تو ابو طالبؑ جیسے صاحبِ جاہ وحشم انسان پر تو خود اپنی ذاتی اور مرکزی دونوں حیثیتوں سے لازم تھا کہ وہ اپنے دین سے دفاع کریں اور اپنی قوم میں اپنا وقار برباد نہ ہونے دیں۔ لیکن دیکھا یہ جاتا ہے کہ آپ اپنے بھتیجے کی مدد کر رہے ہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ آپ دل سے ضرور مومن تھے. اگرچہ اس کا اظہار نہیں فرمایا۔ اس لئے کہ مصلحت وقت اور سیاستِ زمانہ کے تقاضے اس اظہار کے خلاف تھے. ظاہر ہے کہ اگر آپ ابتدائے بعثت اور صبح اسلام ہی سے اپنے ایمان واسلام کا اظہار کر دیتے تو تمام قریش اُسی وقت سے مخالف ہوجاتے آپ کا پورا وقار واحترام ختم ہوجاتا اور پھر اُس طرح محمدؐ عربی کی امداد نہ کرسکتے، جس طرح آپ نے کی ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا کہ دین ضعیف کا ضعیف ہی رہتا۔ یہی وہ اسباب تھے جنھوں نے آپ کو ایمان کے پوشیدہ رکھنے پر مجبور کر دیا۔ ورنہ آپ کے قصائد، خطبے اعمال وافعال اس بات کی واضح دلیل ہیں کہ آپ مومنِ کامل تھے. آپ کا جہاد ودفاع، آخر وقت تک رسولِ اکرمؐ کی مدح وثناء، قصائد وخطبے اور وصیتِ آخر اس بات کی دلیل ہے کہ آپ بہترین اصحاب اور منتخب ناصرین میں سے تھے. کاش آج بھی اسلام کو ایسے ہی نصرت کرنے والے اور ایسی نداز کے اعلاء کلمۃ الحق والے مل جاتے، جیسے کہ صدرِ اسلام اور ابتدائے دعوت میں حضرت ابوطالبؑ تھے۔ اگر ایسا ہوجائے تو آج بھی اسلام کا وقار بلند تر ہوجائے.

یہ ہیں حضرت ابوطالبؑ محمد مصطفےٰؐ کے کفیل وناصر، امیرالمومنین اسداللہ الغالب علیؑ ابن ابی طالب کے والد بزرگوار، بلکہ یہ ہے وہ عظیم انسان جس کی آغوشِ تربیت میں پل بڑھ کر یہ دونوں ستارے زینتِ آسمانِ دین ودُنیا بن گئے ہیں"۔ [1]

اس واضح حقیقت اور ظاہر وباہر بیان کے بعد کسی تنقید وتبصرہ کی ضرورت نہیں رہ جاتی۔ صفحاتِ تاریخ گواہ اور حالات شاہد ہیں کہ دینی رشتہ خون کے رشتہ پر ہمیشہ غالب رہتا ہے. ہم سابق میں اس قسم کے واقعات بھی نقل کرچکے ہیں کہ انسان اپنے عقیدہ کی خاطر ہر ممکن قربانی پیش کر دیتا ہے اور جب بھی عقیدہ اور رشتہ میں ٹکراؤ ہوجاتا ہے. عقیدہ کی فتح

---

[1] معجم القبور ج ۱ ص ۱۹۴، حاشیہ شرح قصیدہ علویہ ص ۵۸

ہوتی ہے اور قرابت کی شکست۔

ڈاکٹر طٰہٰ حسین فرماتے ہیں:

"حضرت ابوطالبؑ کی نبی کریمؐ پر مہربانیاں معروف اور آپ کی دینی حمایت شہرۂ آفاق ہے"۔ [1]

حضرت ابوطالبؑ کے بارے میں استاذ عبدالعزیز سید الاہل نے ایک کتاب تالیف کی ہے جس کے بارے میں بعض حضرات کا خیال ہے کہ مؤلف نے حضرت کے اسلام کا انکار کیا ہے لیکن میرا نظریہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ میرا خیال یہ ہے کہ استاد موصوف نے جس صراحت کے ساتھ حضرت کے سابق الاسلام اور کامل الایمان ہونے کا اعتراف کیا ہے. اس کی نظیر کم ملتی ہے۔ بلکہ اگر پوری کتاب میں مقدمہ کی صرف چند سطریں ہی ہوتیں تو بھی وہ میرے مقصد کو ثابت کرنے کے لئے کافی تھیں۔ چنانچہ آپ اپنی کتاب کے مقدمہ میں خود تحریر فرماتے ہیں

"یہ کسی طرح مناسب نہیں ہے کہ ایک ایسا شخص جس نے نبوتؐ کی حمایت وحفاظت میں چالیس سال سے زیادہ گزارے ہوں، اس کی خبریں اس طرح قطع وبرید کے ساتھ بیان کی جائیں، اُس کے سوانح حیات کو اس طرح منتشر کر دیا جائے کہ اُس کے نقل کرنے والے بہت کم ہوں اور اس قلیل تعداد کے افراد بھی مختلف الخیال ہوں۔ نتیجہ یہ ہو کہ تمام زندگی رسالت کی خدمت کرنے والے انسان کے بارے میں وقتِ احتضار کے لئے ایسی باتیں بیان کی جائیں جن سے غرض مندی اور خواہش پرستی بالکل نمایاں ہو۔ حضرت ابوطالبؑ نے اپنی پوری زندگی اتباعِ رسولؐ میں گزاری ہے اپنے بچوں کو ان کے اتباع کا حکم دیا ہے. اپنا سارا گھر ان کی خاطر لٹا دیا ہے، دشمنوں سے مقابلہ کیا ہے اور عزم محکم کے ساتھ آخر وقت تک نصرتِ رسولؐ پر کمربستہ رہے ہیں. ان کا وجود نصرتِ رسولِ اکرمؐ کے لئے ایک تاریخی ضرورت تھا جس کا ظہور پذیر ہونا اسلام کی تبلیغ اور پیغامِ الٰہی کی نشر واشاعت کے لئے انتہائی ضروری تھا، جیسا کہ

---

[1] کاش تاریخ میں ایسا کوئی اعتراف ہوتا۔

ابن خلدون نے بھی اعتراف کیا ہے[1] اور یہ بھی اللہ کی ایک مشیت تھی، ورنہ کوئی نظام کوئی قانون اُس وقت تک ترقی نہیں کر سکتا۔ جب تک اس کے اعوان و انصار نہ ہوں، اسلام کا انتشار و اشتہار بھی اگرچہ انصار و اعوان ہی کے ذریعہ ہوا ہے۔ لیکن ان کی حیثیت اسلام کے مقابلے میں ثانوی تھی۔ یہ سب اسلام کے چاہنے والے تھے اور وہ اسلام کے قائم کرنے والے اگر وہ نہ ہوتے تو ان کا ذکر ہی نہ ہوتا[2]

حضرت ابوطالبؑ نے اپنے فریضے کو پوری طرح ادا کیا اور اپنے بار کو صحیح طریقے سے اٹھایا۔ انھوں نے نبی کریمؐ کی نصرت کی۔ ان کا ہاتھ بٹایا، دشمنوں کا مقابلہ کیا اور کسی قسم کے تکبر سے کام نہیں لیا۔ جب کہ دوسرے افراد بہک رہے تھے اور آپ تمام قریش کے سردار بھی تھے۔[3]

آپ کی وفات پر رسول اکرمؐ نے گریہ فرمایا اور ظاہر ہے کہ اگر وہ نہ روئیں گے تو کون روئے گا۔ آپ نے ان کی تربیت کی تھی۔ ان کی کفالت و حفاظت کی تھی۔ ان کے لئے باپ کے بعد باپ اور نصرت کے وقت ناصر تھے۔ بلکہ ابتدائے تبلیغ میں محمدؐ کی پوری جماعت تھے[4]

اس کے بعد ہماری نظر، جارج جرداق کی کتاب "صوات العدالۃ الانسانیہ" پر پڑتی ہے جس میں فاضل مؤلف نے شیخ بطحا کی خدمت میں عقیدت کے گلدستے اور مدح و ثناء کے تحفے پیش کئے ہیں۔ بہتر معلوم ہوتا ہے کہ اس مبارک تذکرہ کی چند سطریں یہاں بھی نقل کر دی جائیں۔ آپ فرماتے ہیں:۔۔۔

"جب حضرت عبدالمطلب کا انتقال ہوا تو آنحضرتؐ کی کفالت ابوطالبؑ (والدِ علیؑ) کے حوالے ہوئی۔ آپ انھیں کی محبت، شفقت اور حسنِ تربیت کے سایہ میں پروان چڑھے جیسا کہ باپ کا منشا تھا۔"[5]

---

[1] کاش تاریخ میں ایسا کوئی اعتراف ہوتا۔
[2] و [3] ابوطالب شیخ بنی ہاشم ص۸۵ و ص۸۶
[4] ابوطالب شیخ بنی ہاشم ص۸۹
[5] صوت العدالۃ ج ۱ ص۵۵

اس کے بعد حضرت عبدالمطلب کی ابوطالبؑ سے وصیت کا تذکرہ کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں۔

"حضرت عبدالمطلب نے ابوطالبؑ کا انتخاب اسی لئے کیا تھا کہ وہ ان کے حالات و جذبات سے صحیح طریقے پر واقف تھے۔ آپ کی اولاد میں شفقت و محبت کا جذبہ اکثر کے دل میں موجود تھا لیکن وہ جذبہ جو ابوطالب کے دل میں تھا وہ کسی کو بھی حاصل نہ تھا۔ اور ظاہر ہے کہ محبت و عطوفت کے جذبات تربیت کے مقابلے میں زیادہ موثر ثابت ہوتے ہیں یہی وجہ تھی کہ حضرت عبدالمطلب نے ابوطالبؑ کا انتخاب کیا۔ علاوہ اس کے ابوطالبؑ خود بھی اپنے بھتیجے سے ایک ایسی محبت و الفت رکھتے تھے جو ہمدردی کے لئے کسی وصیت و نصیحت کی محتاج نہ تھی، چہ جائیکہ جب اتنی اہم وصیت کا اضافہ بھی ہو جائے۔

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ حضرت ابوطالبؑ ایک جلیل القدر عظیم المرتبت شخصیت کے مالک تھے۔ آپ کی حیثیت ایک ایسے اہم اور تجربہ کار انسان کی تھی جو ہر مصلحت، ہر امانت داری و ہر اخلاص پر عمل پیرا رہتا ہو۔"[1]

اس کے بعد فرماتے ہیں:

"ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جس دن اللہ نے عبدالمطلب کی اولاد میں محمدؐ کو نبوت کے لئے منتخب کیا تھا، اُسی دن ابوطالبؑ کو ان کی کفالت و تربیت کے لئے چن لیا تھا۔ ابوطالبؑ نے اپنی قوت فکر و نظر کی بناء پر محمدؐ میں اُس بات کا ادراک کر لیا تھا جسے کوئی نہ سمجھ سکا تھا۔"[2]

اس کے علاوہ بھی چند پُر مغز، با معنی اور لطیف و دقیق کلمات اس کتاب کے صفحات میں نظر آتے ہیں"

"اگر ابوطالبؑ کے نفسِ مبارک کی معنویت محمدؐ کے نفسِ مقدس میں نظر آئے تو کوئی تعجب نہیں ہے اس لئے کہ نفس ذات کا ایک جزو ہے اور اس ذات نے تکمیل کی منزلیں ابوطالبؑ کے زیرِ سایہ گزاری ہیں"[3]

"حضرت ابوطالب پہلے وہ شخص ہیں جنھوں نے اسلام میں رسولِ اکرمؐ کی مدد اور ان کی تبلیغی نشر و اشاعت کے لئے اشعار نظم کئے ہیں آپ کی نظر میں محمدؐ کی شان

---

[1] تا [3] صوت العدالۃ ص۵۸، ص۵۹ ج ۱۔

میں معمولی سے معمولی بات بھی بہت بڑی معلوم ہوتی تھی۔"[1]

"ابوطالبؑ نے کسی آن بھی اس بات کو فراموش نہیں کیا کہ محمدؐ میرے خاندانی اخلاق کی فرد اکمل ہے اور وہ ایک استمراری شکل ہے جس میں حضرت عبدالمطلبؑ، عبداللہ اور ابوطالبؑ کی تصویریں وقت واحد میں اُجاگر ہوتی ہیں۔"[2]

جس وقت ابوطالبؑ کا انتقال ہوا نبی کریمؐ نے محسوس کیا کہ آج ایک عظیم ستون منہدم ہو گیا ہے ایک بڑی طاقت ختم ہو گئی ہے اور حضرت کا یہی احساس اس بات کی واضح دلیل ہے کہ آپ کو ابوطالبؑ سے ایک بڑا مستحکم روحانی تعلق تھا۔ اگر محمدؐ عربی کے اس احساس کا منشا فقط یہ تھا کہ ابوطالب کے مرنے سے ایک جاں نثار کم ہو گیا ہے۔ ایک فداکار مر گیا ہے ایک دفاع کرنے والا اُٹھ گیا ہے، ایک بچانے والا نہیں رہا جیسا کہ خود ان کے قول سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ جب تک چچا زندہ رہے قریش کو نظر بھر کر دیکھنے کی جرأت نہ ہو سکی۔ تو پھر اس عمیق حزن اور گہرے الم کا منشا کیا تھا جو ہر وقت محمدؐ کے دل پر چھایا رہتا تھا جب کہ انھیں اس بات کا یقین تھا کہ چاہے ساری دُنیا مخالف ہو جائے میری رسالت کامیاب ہو کر رہے گی حقیقت یہ ہے کہ محمدؐ کے اس مستقل حزن والم کا منشا صرف یہ تھا کہ آپ اپنے لئے ایک بہت بڑا خلا محسوس کر رہے تھے۔ اپنے سامنے ایک بڑے عزیز اور شفیق کو غائب دیکھ رہے تھے۔ یا یوں کہا جائے کہ اپنی ذات میں ایک کمی محسوس کر رہے تھے، اس لئے کہ آپ کا ماضی وحال سب مرنے والے ہی سے وابستہ تھا۔[3]

اس کے بعد فاضل مولف نے دوسرے مقام پر اس قلبی اتحاد کو نقل کیا ہے جو محمدؐ و علیؑ کے درمیان تھا۔ تاکہ اس سے یہ بات واضح ہو سکے کہ محمدؐ و ابوطالبؑ کا قلبی تعلق ہی بڑی حد تک ایک شاندار مستقبل کا پیش خیمہ ثابت ہوا۔ اور یہ شجرۂ طیبہ بڑے اچھے پھلوں کا موجب و باعث بن گیا۔

"محمدؐ و علیؑ میں مودت و اخوت کے تعلقات برابر جاری رہے۔ پیغام الٰہی کی اشاعت

۱۔ ۲۔ صوت العدالۃ ص۵۸، ص۵۹ ج ۱

۳۔ صوت العدالۃ۔ ج ۱ ص[illegible]

میں دونوں برابر سے کوشاں رہے۔ اس اتحاد و اتفاق کی بنیادیں اُس وقت قائم ہوئی تھیں جب محمدؐ نے ابوطالبؑ کو دیکھا تھا اور علیؑ نے محمدؐ کو ظاہر ہے کہ جب ایسے تین افراد ایک گھر میں جمع ہو جائیں تو عظمت کا کیا عالم ہو گا۔ یہی وہ خاندانی کمالات وخصوصیات تھے جو حضرت ابوطالبؑ، محمدؐ اور علیؑ کی عظمت کی تکمیل پر آمادہ کر رہے تھے۔ جس کا نتیجہ ابوطالبؑ کے یہاں قربانی اور فداکاری کی شکل میں ظاہر ہوا۔ اور علیؑ کے یہاں فکرِ رسا، شعور عمیق اور معجز نما قربانی کی صورت میں۔"[1]

ممکن ہے کوئی انسان یہ خیال کرے کہ جارج جرداق کے اس پورے کلام میں کوئی ایسا کلمہ نہیں ہے جس سے حضرت ابوطالبؑ کے اسلام و ایمان پر روشنی پڑتی ہو بلکہ مؤلف نے اپنے پورے کلام میں ان کی جاں نثاری، فداکاری اور قربانی و محبت کا تذکرہ کیا ہے اور ظاہر ہے کہ اِسے اسلام سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

لیکن میں سمجھتا ہوں کہ مؤلف کا اتنا ہی بیان میرے دعوے کے اثبات میں کافی ہے نور کو دیکھنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ پھیلی ہوئی روشنی اس کے وجود کا ثبوت مہیا کر دیتی ہے۔ ہمیں اس کی ضرورت نہیں ہے کہ ہم ایک ایک لفظ پر انگلی رکھ کر بتائیں کہ اس لفظ سے ایمان ظاہر ہوتا ہے اور اس سے عقیدہ۔ ہم صرف ایک کلمہ کی طرف اشارہ کر دیتے ہیں جس میں مولف موصوف نے ابوطالبؑ کو ایک تاریخی ضرورت قرار دیا ہے اور ان کو اتنا وسیع النظر تسلیم کیا ہے جو تمام دنیا کے لوگوں سے بہتر حضرت محمدؐ کی معنویت کا انکشاف کر سکے۔ بھلا یہ کیونکر ممکن ہے کہ محمدؐ، عبدالمطلبؑ، عبداللہ اور ابوطالبؑ کے اخلاق کے تسلسل کا نام ہو اور یہ تمام کے تمام غیر مسلم ہوں۔ استغفر اللہ! بھلا یہ کون سا نفس تھا جو محمدؐ کے نفس میں اس طرح متحد و فنا ہو گیا تھا کہ دونوں کے اس معنوی امتزاج و اتحاد سے ایک نفس لا یتجزیٰ کی تشکیل ہو گئی تھی۔

مؤلف کا یہ کہنا کہ بیت طالبی کے خصوصیات نے باپ اور بیٹے کو اس بات پر مجبور کر دیا کہ محمدؐ کی عظمت کی صحیح تحلیل کریں تاکہ یہ تحلیل ایک ایسی فداکاری اور قربانی کے جذبہ کی شکل میں ظاہر ہو جس میں خیر کے تعلقات ہوں، رسالت کی کامیابی کی کوششیں ہوں۔ فکر و شعور۔ قربانی و ایثار کے معاملات ہوں اور آخر میں یہ شعور ابوطالبؑ، محمدؐ اور علیؑ کو ایک نقطہ پر اس طرح جمع کر دے کہ اب یہ

۱۔ صوت العدالۃ ج ص۷۹

ایک ناقابلِ تقسیم وحدت ہوجائے اور ایک بلند و بالا باکمال اجتماع کی شکل اختیار کرلے۔ کیا اِس بات کی دلیل نہیں ہے کہ ابوطالبؑ مومنِ کامل تھے؟ کیا وہ خیر کے تعلقات جو ابوطالبؑ اور نبی کریمؐ میں قائم تھے۔ وہ کفر و شرک کے تعلقات تھے کیا کسی مشرک سے خیر کی امید ہوسکتی ہے؟ کیا مشرک میں کوئی ایسا خیر فرض کیا جاسکتا ہے جس کے تعلقات کے لئے دوسری طرف پیغامبرِ توحید ہو؟

حقیقت یہ ہے کہ جب تعلقات اتنے گہرے اور ایمانی رشتے اتنے مستحکم ہوں تو پھر محمدؐ کو ابوطالبؑ کی وفات کا ایک عمیق احساس ہونا ہی چاہیئے اس لئے کہ اِن کی وفات سے گھر کا وارث، تبلیغ کا رکنِ اعظم اور حمایت و حفاظت کا ایک بڑا ذمہ دار دُنیا سے اُٹھ گیا ہے

یہ ضروری تھا کہ حزن و الم محمدؐ کے دل پر مسلط رہتے۔ یہ لازمی تھا کہ دل شکستگی کے آثار چہرۂ انور سے نمودار ہوں۔ یہ قدرتی امر تھا کہ ابوطالبؑ کی وفات کا ایک بے پناہ اثر آپ پر ہوتا۔ خواہ آپ کو اس پر کتنا ہی یقین کیوں نہ ہو کہ دین کی نصرت اللہ کے حوالے ہے اس کی تکمیل خالق کے ذمہ ہے اِس لئے کہ ابوطالبؑ فقط ایک مددگار ہی نہ تھے بلکہ روحانی تعلقات اور ایمانی معاملات کے طرفِ معاملہ بھی تھے۔

اگر ذکرِ خیر کی اِس داستان کو کسی مقام پر موقوف ہونا ہے تو بہتر یہ ہے کہ اِس سلسلے کو اِسی مقام پر قطع کردیا جائے اس لئے کہ عقیدت کے گلدستے، محبت کے نذرانے اور اعترافات کے خزانے شیخ بطحا کی خدمت میں پیش کئے جاچکے ہیں

زمانوں کی سیر ہوچکی، ادوارِ تاریخ کا مطالعہ ہوچکا، بزرگ شخصیتوں کے بیانات سنے جا چکے، مختلف الخیال، متعدد العقائد اور مختلف الطبقات افراد کے افادات سامعہ نواز ہوچکے، اب قلم کو رک جانا چاہیئے۔

اب حق واضح ہوچکا، حقیقت عالم آشکار ہوچکی، باطل کی آواز دب چکی، مسموم فضا صاف ہوچکی، شور و شغب، چیخ و پکار ختم ہوچکی۔ فضیلت و رذالت کا امتیاز قائم ہوچکا، حق و باطل الگ الگ ہوچکے۔ اب داستانِ مدح و ثنا کے عطر بیز دفتر کو بند ہونا چاہیئے۔

چند لمحے حدیدی کے ساتھ

ہم پچھلے صفحات میں ایسے اشخاص کے کلمات سے استدلال کرچکے ہیں جن کی صداقت و حق بیانی میں کسی کلمہ گو کے لئے شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے اس میں ایک طرف رسولِ اکرمؐ کے فرامین ہیں اور دوسری طرف ائمہ اطہارؑ کے ارشادات —— اِس کے بعد ان رجالِ فکر اور عظمائے مذاہب کے بیانات ہیں جنھوں نے اس نورانیت کا اظہار کیا ہے۔ اور دوسروں کی طرف رہنمائی کی ہے۔ حق کا ادراک کیا ہے اور طریقِ مستقیم پر گامزن ہونے کی کوشش کی ہے۔

لیکن بہرحال چونکہ بیان کسی حد تک طولانی ہوچکا ہے۔ اس لئے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ابن ابی الحدید کی شرحِ نہج البلاغہ کے بعض کلمات پر بھی تبصرہ کردیا جائے کہ موصوف نے ایک طرف حضرت کی تعریف و توصیف کے پُل باندھے ہیں تو دوسری طرف ایک کلمہ سے اس پوری عمارت کو منہدم کرنا چاہا ہے۔ ہمارا فرض ہے کہ ہم اِس کلمہ کا صحیح محاسبہ کریں۔ اور حقیقتِ مطلب کو واضح و آشکار بنائیں۔

وقتِ بعثتِ پیغمبرؐ کے حالات کا جائزہ لیتے ہوئے آپ نے اس زمانے کے افراد کو چند حصوں پر تقسیم کیا ہے جن میں کچھ معطلہ تھے اور کچھ غیر معطلہ۔

معطلہ اُس جماعت کا نام ہے جو خالق کائنات کی منکر، تناسخ[1] کی قائل اور بت پرست ہے

---

[1] ہندوؤں میں یہ عقیدہ آواگون کے نام سے مشہور ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ انسان کی روح بعد موت نہ فنا ہوتی ہے نہ عالمِ برزخ کی طرف منتقل ہوتی ہے بلکہ ایک دوسرے جسم میں ڈال دی جاتی ہے یہ اعمال پر منحصر ہے، اچھے افراد کی روح محلسرا میں اور برے افراد کی روح کتوں کی بستی میں۔

غیر معطلہ لوگوں میں کچھ وہ تھے جو خدا پرست اور توحید کے قائل تھے۔ قبیح افعال سے اجتناب کرتے تھے اور تقویٰ و ورع کے پابند تھے جیسے حضرت عبداللہؑ، عبدالمطلب اور ابوطالبؑ۔[1]

اِس عبارت سے صاف ظاہر ہے کہ حضرت ابوطالبؑ خدا پرست اور توحید شناس تھے۔ گناہوں سے اجتناب کرتے تھے اور تقویٰ و احتیاط کے پابند تھے آپ اُن لوگوں میں سے نہیں تھے جو بت پرست فاسق اور قائل تناسخ رہے ہوں۔

ظاہر ہے کہ گناہوں اور قبیح باتوں سے اجتناب کرنے والے انسان کے لئے یہ غیر ممکن ہے کہ وہ نورِ ایمان کو اپنی آنکھوں سے دیکھے، صراطِ مستقیم کا مشاہدہ کرے اور پھر اسے اختیار نہ کرے!

دوسرے مقام پر جناب امیرؑ کے امتیازات و خصوصیات کا تذکرہ کرتے ہوئے رقم طراز ہیں۔

"میں کیا مدح کر سکتا ہوں اُس شخص کی جس کا باپ ابوطالبؑ جیسا انسان سید البطحا، شیخ قریش اور رئیسِ مکہ ہو"۔

پھر فرماتے ہیں:۔۔۔

"ابوطالبؑ ہی وہ انسانِ کبیر ہے جس نے رسولِ اکرمؐ کا تحفظ کیا۔ ان کی نگرانی کی کفار و مشرکین کے شر سے انھیں محفوظ رکھا اور پھر ان کی خاطر زحمتیں، مصیبتیں اور اذیتیں برداشت کیں چنانچہ روایت میں ہے کہ جب آپ کا انتقال ہو گیا تو رسولِ اکرمؐ پر وحی نازل ہوئی کہ اب مکہ چھوڑ دیجئے کہ آپ کا مددگار مر گیا ہے"۔[2]

یہ ظاہر حدیدی کی نظر میں ابوطالبؑ کی طرف نسبت ایک شرف ہے۔ ان کی اولاد میں شمار ہونا امامت کی خصوصیات میں سے ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ ابوطالبؑ کی وجہ سے امیر المومنینؑ کو خاندانی عظمت اور موروثی شرافت بھی حاصل تھی۔ کہ جس کا باپ اتنے صفات کا حامل ہو اُس سے بہتر کون کریم النسل ہو سکتا ہے۔

اس کے بعد ابوطالبؑ کی خدمات اور زحمات کا تذکرہ کرتے ہوئے اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ انھوں نے اسلام اور رسول اسلامؐ کی خاطر اذیتیں تکلیفیں اور مصیبتیں برداشت کی ہیں یہاں تک کہ ان کے بعد رسولؐ کے لئے کوئی ایسا سایہ باقی نہ رہ گیا تھا جہاں ٹھہر کر دم لے سکیں

---

[1] شرح النہج ج ۱ ص ۳۹

[2] الحدیدی ج ۱ ص ۱۰۹

کوئی ایسا قلعہ نہ رہ گیا تھا جس کی پناہ میں اپنی جان بچا سکتے۔ اس لئے آپ کو ہجرت کرنا پڑی جیسا کہ خود فرماتے ہیں ۔۔۔ "جب ابوطالبؑ کا انتقال ہو گیا تو قریش نے آپ کو اذیتیں دینا شروع کر دیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ آپ کو وطن چھوڑ کر ہجرت کرنا پڑی"۔[1]

"یہ بھی یاد رہے کہ حضرت علیؑ تمام افراد پر تقدیم، شرف اور احسان کے مدعی تھے اس لئے کہ ان کے بھائی رسول اکرم اور ان کے باپ ابوطالبؑ تھے اور ابوطالبؑ اُس شخصیت کا نام ہے جس کے بارے میں ہر سیرت کا مطالعہ کرنے والا جانتا ہے کہ اگر وہ نہ ہوتے تو اسلام لم یکن شیئاً مذکوراً کوئی قابل ذکر چیز نہ ہوتا۔ اب اگر کوئی شخص یہ اعتراض کرے کہ ابوطالبؑ کی یہ تعریف خلافِ حقیقت ہے اس لئے کہ پروردگار نے خود ترویج دین کی ذمہ داری لی ہے خواہ ابوطالبؑ زندہ رہیں یا مر جائیں؟۔ تو میں جواب دوں گا کہ پھر رسولِ اکرمؐ کی مدح وثنا بھی بیکار ہے اور یہ کہنا بھی غلط ہے کہ رسولِ اکرمؐ نے لوگوں کو ضلالت سے نکالا، جہالت سے بچایا اور آپ کا مسلمانوں پر کوئی حق ہے یا اگر آپ نہ ہوتے تو زمین پر کوئی خدا پرست نہ ہوتا اس لئے کہ یہ تمام باتیں بھی اللہ ہی کی طرف سے ہوئی ہیں"۔

پھر فرماتے ہیں۔

"اگر کوئی یہ کہے کہ رسولِ اکرمؐ کی مدح وثناء اس لئے کی جاتی ہے کہ پروردگارِ عالم نے اپنے افعال کو ان کے ہاتھوں انجام دیا ہے، اپنے خیر و برکت کے لئے ان کو وسیلہ اور واسطہ قرار دیا ہے تو میں بعینہٖ یہی بات ابوطالبؑ کے لئے کہوں گا"۔[2]

شاید اس مقام پر یہ مناسب ہوگا کہ ہم اس نکتہ کو بھی واضح کر دیں کہ ابن ابی الحدید کے یہ تمام بیانات اُس خطبہ کی شرح پر ہیں جو حضرت امیر المومنینؑ نے جنگ صفین سے واپسی پر ارشاد فرمایا تھا جس کا خلاصہ یہ ہے:

"آلِ محمدؐ کا قیاس اس امت کے کسی فرد پر نہیں ہو سکتا اس لئے کہ ساری کائنات پر ان کے احسانات ہیں اور احسان مند کبھی محسن کے برابر نہیں ہو سکتا یہ دین کی بنیاد اور یقین کے ستون ہیں۔ حد سے بڑھنے والا ان کی طرف پلٹتا

---

[1] الحدیدی ج ۳ ص ۳۲۲

[2] شرح النہج ج ۱ ص ۱۴۷

ہے اور پیچھے رہ جانے والا ان سے ملحق ہوتا ہے یعنی یہ کمالِ و شرف کے نقطۂ اعتدال پر ہیں۔ انھیں حقِ ولایت حاصل ہے اور انھیں میں پیغمبرؐ کی وصیت و وراثت منحصر ہے۔"

کیا اس وضاحت کے بعد بھی ابن ابی الحدید کے ان کلمات کی شرح کی ضرورت ہے کیا اب بھی یہ بتانے کی ضرورت ہے کہ مولف کی نظر میں حضرت علیؑ کے لئے ابو طالبؑ اسی طرح باعثِ فخر ہیں جس طرح رسول اکرمؐ میرے خیال میں تو صرف اتنا ہی اشارہ کافی ہے کہ فاضل مؤلف نے کمالِ شرف اور عظمت کا ایک مجموعہ تیار کیا ہے جسکے اجزاء ابو طالبؑ محمدؐ اور علیؑ ہیں۔

ہمیں اس بیان کی بھی ضرورت نہیں ہے کہ ابن ابی الحدید نے حضرت ابو طالبؑ کے نام کے ساتھ "علیہ السلام" کا لفظ استعمال کیا ہے۔ اور یہ وہ مقدس لفظ ہے جس کا استعمال صرف امام، نبی، وصی یا اس کے ہم مرتبہ افراد کے لئے ہوتا ہے۔ صحابۂ اکرام میں ہزاروں افراد ایسے ہیں جن کے لئے یہ لفظ استعمال نہیں ہوتا ہے۔

اور ظاہر ہے کہ ابو طالبؑ سے زیادہ سلام کا مستحق کون ہو سکتا ہے؟ یہی وہ انسان ہے جس نے اسلام کی بنیادوں کو مستحکم بنایا اگر یہ نہ ہوتا تو بقول حدیدی اسلام قابلِ تذکرہ شئے نہ ہوتا

اس کے بعد مؤلف نے خود اپنے دل سے ایک معترض فرض کر کے اس کا جواب بھی دے دیا کہ مدح و ثنا، تعریف و توصیف کا سلسلہ اپنی آخری منزل پر پہنچ جائے اور آخر میں یہ بھی واضح کر دیا کہ اگر ابو طالبؑ کے افعال قابل تعریف نہیں ہیں تو خود رسولِ اکرمؐ کے کارہائے نمایاں بھی قابلِ توصیف نہیں ہو سکتے۔

میں نے حدیدی کے یہ منتشر فقرات صرف اسی لئے نقل کئے ہیں کہ ان کے ان آخری فقروں کا جائزہ لیا جا سکے جو انھوں نے اپنی گفتگو کے خاتمہ پر تحریر فرمائے ہیں[1]

درحقیقت یہ فقرات وہ ہیں جو سابقہ بیانات سے پوری طرح تضاد رکھتے ہیں۔ اس لئے کہ ان فقرات میں رسولِ اکرمؐ کے محسن و کفیل کے خلاف افترا پردازی کی گئی ہے۔ اگرچہ یہ تمام افترا پردازیاں اس طویل و عریض کتاب کی ۱۱ سطروں سے زیادہ نہیں ہیں جس کے متعدد صفحات ان براہین و دلائل سے پُر کئے گئے ہیں جن سے آپ کی شخصیت اور آپ کے ایمان و عقیدہ پر روشنی پڑتی ہے۔

---

[1] شرح النہج ج ۱ ص ۳۰۵-۳۱۸

لیکن پھر بھی مؤلف نے چاہا کہ ان چند سطروں کا اضافہ کر دیا جائے تو ہمارا بھی فریضہ ہو گیا کہ ہم ہر کلمہ کی کمزوری کو ظاہر کر کے یہ بتائیں کہ یہ خاتمہ انتہائی پوچ اور بے معنی ہے۔

مؤلف کتاب اپنے تمام دلائل و براہین نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں:۔

"حقیقت یہ ہے کہ میری نظر میں یہ مسئلہ بہت مشکوک ہے[1]۔ روایات آپس میں متعارض و متضاد ہیں اور حقیقت کا علم صرف خدا کو ہے۔ پھر میرے دل میں وہ رسالہ بھی کھٹک رہا ہے جو نفسِ زکیہ نے منصور کے نام لکھا تھا جس میں لکھا تھا کہ میں بہتر سے بہتر کا بھی بیٹا ہوں اور بدتر سے بدتر کا بھی، میں سردارِ اہلِ جنت کا بھی فرزند ہوں اور سردارِ اہلِ جہنم کا بھی۔"

ظاہر ہے کہ یہ نفسِ زکیہ کی طرف سے ابو طالبؑ کے کفر کی گواہی ہے اور چونکہ وہ گھر کے آدمی ہیں اور رسولِ اکرمؐ سے قریب العہد بھی ہیں، جس دور میں روایہ.. سازی کا کاروبار شروع نہ ہوا تھا اس لئے ان کا قول قرینِ قیاس ہے۔

حدیدی کا کہنا ہے کہ اس مقام پر روایات متعارض ہیں، کون سی روایات؟ جن میں ایک طرف وہ روایتیں ہیں جن کا تعلق خود رسول اکرمؐ سے ہے وہ روایتیں ہیں جن کا تعلق ائمۂ معصومینؑ سے ہے وہ اقوال و افعال ہیں جن کا تعلق حضرت ابو طالبؑ سے ہے جن میں ہر روایت آپ کے ایمان و اسلام کا بیانگِ دہل اعلان کر رہی ہے اور دوسری طرف وہ روایت ہے جس کا خریدار معاویہ اور بائع مغیرہ بن شعبہ جیسے افراد اور جس کا بازار شام میں قائم کیا گیا تھا

یاد رکھئے تعارض ہمیشہ اسی وقت ہوا کرتا ہے جب دونوں طرف کے راوی وثاقت اور اعتبار کے لحاظ سے برابر ہوں۔ علم رجال کی میزان میں دونوں کے پلّے مساوی ہوں جس کا تصوّر بھی اس مقام پر محال ہے۔

اس لئے کہ عترتِ اطہارؑ کی روایت اور وہ بھی رسول اکرمؐ سے مغیرہ جیسے افراد کی روایت کے برابر فرض نہیں کی جا سکتی۔

اس کے بعد موصوف نے نفسِ ذکیہ محمد بن عبد اللہ بن الحسین بن امام الحسنؑ کے اس

---

[1] شرح النہج ج ۲ ص ۳۱۰

خط میں استدلال کیا ہے جو انھوں نے منصور کے نام تحریر کیا تھا۔
میں نے اس خط کی حتی الامکان تلاش کی ہے۔ مجھے اس میں یہ فقرات نظر آئے ہیں:

• اللہ نے جاہلیت اور اسلام دونوں ادوار میں مجھے منتخب آباؤ اجداد عطا کئے ہیں، یہاں تک کہ جہنّم میں بھی ہمارا منتخب درجہ ہے۔ ہم ایک طرف جنّت میں سب سے بلند درجے کے مالک ہیں تو دوسری طرف جہنّم کے سب سے زیادہ خفیف عذاب کے۔ ہم خیر الاخیار بھی ہیں اور خیر الاسرار بھی۔ خیر اہلِ جنّت کے بھی فرزند ہیں اور بہترین اہلِ جہنّم کے بھی۔"

اس کے بعد میں نے اس خط کے راویوں کو تلاش کیا تو کامل میں کچھ نہ مل سکا۔ لیکن صاحب کتاب شیخ الابطح نے اس کا راوی عثمان بن سعید المدنی کو قرار دیا ہے اور لکھا ہے کہ سعید ایک مجہول راوی ہے۔

طبری نے اس رسالہ کی کٹی پھٹی سندیوں درج کی ہے:—

• مجھ سے محمد بن یحییٰ نے بیان کیا ہے کہ میں نے اس رسالہ کو محمد بن بشیر سے نقل کیا ہے اس کے علاوہ اس رسالہ کو ابوعبد الرحمٰن نے کتابِ اہلِ عراق سے نقل کیا ہے اور اسی طرح حکم بن صدقہ بن نزار سے ابن ابی حرب نے اس رسالہ کی تصحیح کی ہے" ؎۲

بھلا اس ابتر قسم کی سند پر کیونکر اعتبار کیا جا سکتا ہے۔ اس میں محمد بن یحییٰ ہے خدا جانے اس کا جد کون ہے۔! ہم نے میزان الاعتدال میں اس نام کے ستّرہ آدمی دیکھے ہیں لیکن سب ہی متروک، ضعیف، ناقابل استدلال، دجّال، واضع احادیث صاحبِ احادیثِ منکرہ و منفردہ غیر معتبر، راوی ضعفا، تنزیر؎۳ شاذ اور بغیر سنے روایت کرنے والے ہیں۔

؎۱ طبری ج ۱۰ ص ۱۹۶، کامل ابن اثیر ۵ ص ۵ (البتہ اس میں لفظ "جہنّم" کے بجائے شر یہ ہے اور آخری فقرہ نہیں ہے محاضرات تاریخ الامم ص ۶۵، کامل ج ۳ ص ۱۲۷ (اس کتاب میں پورا رسالہ ہے لیکن یہ فقرے اصلاً موجود نہیں ہیں)۔ ؎۲ طبری ج ۶ ص ۱۶۵
؎۳ الغدیر ج ۵ ص ۲۲۹ محمد بن یحییٰ بن زرین المصیصی - یہ دجال اور واضع احادیث تھا۔ میزان الاعتدال ج ۳ ص ۱۴۷

۲۔ اس کے بعد محمد بن بشیر ہے۔ اس نام کے دو آدمی ہیں۔ ایک محمد بن بشیر بن مروان الکندی الواعظ یہ بھی ابن معین کی رائے میں غیر موثق ہے ؎۱
۳۔ ہمیں نہیں معلوم یہ ابوعبد الرحمٰن کون صاحب ہیں اور ابن ابی حرب کس بلا کا نام ہے
۴۔ اتفاق سے حکم بن صدقہ کا بھی کوئی ذکر خیر میزان الاعتدال میں نہیں ہے۔

ہمیں زیادہ بحث و تمحیص کی ضرورت بھی نہیں ہے، ہم تو صرف یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ یہ مہمل رسالہ ابن ابی الحدید کے دل میں کیسے کھٹک گیا۔ ہمیں اس معنوی اختلاف سے تعجب نہیں جو ابن ابی الحدید کامل، طبری، اور خضری کی روایتوں میں پایا جاتا ہے بلکہ تعجب اس فخر و مباہات پر ہے کہ انسان اس بات پر بھی فخر کرے کہ میں سید الاشرار کا لال ہوں اور میں بہترین اہلِ نار کا فرزند ہوں! کیا جہنم میں بھی کوئی بہتری ہے؟

پھر یہ سردار اہلِ جہنّم کا بیٹا ہونا بھی غلط ہے، اس لئے کہ اگر جہنّم میں سرداری ہوگی تو اس کو ملے گی جو شر الاشرار اور بدترین خلائق ہو، نہ کہ اس کو ملے گی جو خیر الاشرار اور بقول رسول اکرمؐ خفیف ترین عذاب کا مستحق ہو! استغفر اللہ!

پھر یہ خفت عذاب بھی شفاعت ہی کا نتیجہ ہے، تو کیا صاحبِ خلقِ عظیم شفاعت میں اس قدر بخل سے کام لے گا؟ معاذ اللہ۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ فخر و مباہات ایک دیوانے آدمی کے لئے تو سزاوار ہے لیکن نفس زکیہ جیسے انسان کے لئے جو ایک ریاست عظمیٰ کا طالب ہو حکومتِ وقت سے معارض ہو قطعاً غیر ممکن ہے۔

یہی وجہ ہے کہ ہمیں منصور دوانیقی کے جواب میں یہ فقرے نظر آتے ہیں:

"تمہارا خیال ہے کہ تم خفیف ترین عذاب والے کے فرزند ہو، تم خیر الاشرار کے دلبند ہو، حالانکہ یہ غلط ہے کہ جہنّم میں کم و زیادہ عذاب کا سوال نہیں۔ کفر چھوٹا بڑا نہیں ہوتا ہے۔ شر میں خیر غیر ممکن ہے۔ مومن کے لئے اہل نار پر فخر کرنا مناسب نہیں ہے، جیسا کہ عنقریب تمہیں معلوم ہو جائے گا۔

وسیعلم الذین ظلموا ای منقلب ینقلبون ؎۲

؎۱ المیزان ج ۲ ص ۲۱
؎۲ طبری ج ۶ ص ۱۹۷، کامل ج ۵ ص ۶، محاضرات الامم۔ العباسیہ ص ۶۶، کامل مبرد ج ۳ ص ۱۴۷

حقیقت یہ ہے کہ منصور کا یہ جواب اس رسالہ کا بہترین علمی اور اخلاقی جواب ہے جیسا کہ ہم نے خود بھی واضح کیا ہے، چاہے اس سوال و جواب کی کوئی واقعیت ہو یا نہ ہو۔

ابن ابی الحدید کی روایت میں نفس زکیہ کا قول اس طرح درج ہے "انا ابن شر الاشرار" دیکھنا یہ ہے کہ آیا یہ عنوان شر الاشرار حضرت ابوطالبؑ پر منطبق ہو سکتا ہے یا نہیں؟

ہمارا خیال یہ ہے کہ شر الاشرار سے مراد چاہے تمام عالمین کے اشرار ہوں یا صرف قریش اور اُس دَور کے اشرار، بہر صورت اس عنوان کا اطلاق ابوطالبؑ پر غیر ممکن ہے۔ ابھی تک کوئی کاذب، جعل ساز اور افترا پرداز ایسا پیدا نہیں ہوا جس کی شقاوت اس منزل تک پہونچ گئی ہو کہ وہ حضرت ابوطالبؑ کا شمار اشرار میں کرے، چہ جائیکہ شر الاشرار؟

کیا یہ ابوطالبؑ وہی نہیں ہے جن کے فیوض و برکات سے سارا عالم عرب مستفیض ہو رہا تھا۔ اور جن سے آج تک تمام دنیا مستفید ہو رہی ہے۔

کیا شر الاشرار ایسا ہی ہوتا۔ یہ جو اسلام کا ستون محکم ہو اور جس کے بغیر اسلام ناقابل ذکر ہو۔

کیا ایسے شریر انسان کا بھی کوئی احسان اُس رسولؐ پر ہو سکتا ہے جس کی ہر آن یہ دُعا تھی کہ خدایا کسی فاسق و فاجر انسان کا احسان گردن پر نہ آجائے؟

کیا ابوطالب کی حالت اس ابولہب اور ابوجہل سے بھی بدتر تھی جن کے شر سے تمام عالم مملو اور جن کے فساد سے معمورۂ ارض اسلام متزلزل تھا!

ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ رسولِ اکرم کی حمایت و حفاظت شر ہو اور ان کو اذیت و تکلیف دینا کارِ خیر ہو۔ لاحول ولا قوۃ الا باللہ!

ہم نے مانا یہ رسالہ نفسِ زکیہ ہی کا ہے اور یہ تمام خلافِ عقل حرکات انھیں سے صادر ہوئی ہیں (معاذ اللہ) لیکن سوال یہ ہے کہ شر الاشرار کا اطلاق ابوطالبؑ پر کس دلیل سے ہوگا

کیا یہ صرف خیال آرائیاں نہیں ہیں؟

کیا ان کے پس پردہ کوئی خاص مقصد کار فرما نہیں ہے؟

آخر اس سے مراد طلحہ بن عبید اللہ کیوں نہیں ہے؟ جبکہ وہ ام اسحٰق جدۂ نفسِ زکیہ کا باپ تھا۔

عبد العزیٰ کیوں نہیں ہے جب کہ وہ نفسِ زکیہ کا نانا تھا۔ اس لئے کہ نفسِ زکیہ کی والدہ صاحبہ ہند بنت ابی عبیدہ بن عبد اللہ بن زمعہ بن الاسود بن المطلب بن اسد بن عبد العزیٰ تھیں اور عبد العزیٰ کا کفر معروف بھی تھا۔[1]

ہمارا یہ دعویٰ نہیں ہے کہ نفسِ زکیہ کی مراد یہی دونوں ہیں بلکہ یہ بھی ابن ابی الحدید کی طرح کا ایک خیال ہے جس کے بعد یہ سوال رہ جاتا ہے کہ ابن ابی الحدید نے ان دونوں کے بارے میں کیوں احتمال نہیں دیا اور ابوطالبؑ کو کیوں مراد لے لیا۔!

ہم نے مانا کہ نفسِ زکیہ کی مراد ابوطالبؑ ہی ہیں تو اب سوال یہ ہے کہ حدیدی کے دل میں نفس زکیہ کا قول تو کھٹکنے لگا اور امام جعفر صادقؑ کے اقوال کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ جب کہ یہ اقوال بھی اس کے پیش نظر تھے اور یہ دونوں حضرت ہمعصر بھی تھے۔ پھر نفس زکیہ کو جلالت و علم، معرفت صداقت و امانت اور اعلاء کلمۃ الحق میں امام جعفر صادق سے کوئی نسبت بھی نہ تھی

حدیدی کی یہ حرکت بالکل ایسی ہی ہے کہ انسان سارا اونٹ نگل جائے اور پھر ایک بال حلق میں اٹکنے لگے۔ یہ عجیب حلق ہے کہ جب چاہے بڑی سے بڑی چیز اتر جائے اور جب چاہے ایک معمولی جملہ بھی اٹک جائے۔

سوال یہ ہے کہ اس سینے میں امیر المومنینؑ اور دیگر ائمۂ اطہار کے اقوال کیوں نہیں کھٹکے۔ جب کہ ان کی عظمت مسلّم اور ان کے اقوال و ارشادات بے شمار اور شہرہ آفاق ہیں۔

اگر نفسِ زکیہ ابوطالبؑ کی خیر خواہ اولاد میں ہیں تو کیا امیر المومنینؑ اور دیگر ائمۂ اطہارؑ اس کے خلاف تھے کہ ایک کافر کو مسلمان بنا دیا۔ کیا نفسِ زکیہ کا تقویٰ و ورع ان سب سے زیادہ تھا؟

ہمارا عقیدہ تو یہ ہے کہ یہ رسالہ نفس زکیہ کا نہیں ہے[2] اور اگر ہے تو ان کی مراد ابوطالبؑ جیسا مجاہد نہیں ہے اور اگر ہے تو ائمۂ اطہارؑ کے مقابلے میں ان کے اقوال کی قیمت نہیں ہے۔

---

[1] نسب قریش ص۵۳، ص۲۲۷ شیخ الابطح ص۸۲

[2] حق تو یہی ہے کہ یہ رسالہ نفس زکیہ کا نہیں ہے اور اگر ہے تو سیاست عباسیہ نے ان میں فقرات کا اضافہ کر دیا ہے ورنہ ایک عاقل ایسی باتیں نہیں کر سکتا جس سے خود اُسکی توہین و تنقیص ہوتی ہو۔

حدیدی کا کہنا ہے کہ چونکہ نفس زکیہ کا عہد رسول اکرمؐ کے زمانے سے قریب تھا اس لئے روایت میں جعل کے احتمالات نہیں ہیں۔

تعجب انگیز امر ہے کہ حدیدی نفس زکیہ کے اقوال پر اعتماد فرما لیتے ہیں جن کا زمانہ حضرت ابوطالبؑ کے ڈیڑھ سو سال بعد کا ہے اور امیر المومنینؑ کے اقوال کو نظر انداز کر جاتے ہیں. جنھوں نے ابوطالبؑ ہی کی آغوش میں پرورش پائی ہے.

آپ فرماتے ہیں کہ چونکہ ان کا زمانہ رسول اکرمؐ سے قریب تھا لہٰذا روایت جعلی نہیں ہے. اور پھر خود ہی معاویہ کے دور کی جعلی روایتیں نقل کرتے ہیں جس کا زمانہ رسولِ اکرمؐ ہی کا زمانہ تھا۔

میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس قول کا مقصد کیا ہے ؟ اس کا منبع کہاں ہے ؟ یہ نقرہ دل میں کیسے اٹک گیا۔!

ہم اس لئے خاموش ہوئے جاتے ہیں کہ غزالی کے قول کی بناء پر "مسلمان سے بدظنی حرام ہے اور مسلمان کی حرمت کعبہ سے زیادہ ہے" !

حدیدی اپنی اس کجرفتاری سے ایک ایسا قدم بھی اُٹھاتے ہیں جو پہلے سے زیادہ مضحکہ خیز اور تعجب انگیز ہے، آپ فرماتے ہیں۔

"بعض طالبین نے ایک کتاب[1] "اسلام ابوطالبؑ" کے موضوع پر لکھ کر میرے پاس تقریظ کے لئے بھیجی کہ میں ان بیانات کی تائید کروں تو میں پریشان ہو گیا کہ میری نظر میں معاملہ صاف نہ تھا۔ چنانچہ میں نے بھی صرف ابوطالبؑ کے حقوق اور اُن کی عظمت کا لحاظ کرتے ہوئے جلد کے اوپر یہ شعر لکھ دیئے

ولولا ابوطالب وابنہ ۔۔۔ لما مثل الدین شخصاً فقاما
فذاك بمکۃ آوی وحامی ۔۔۔ وھذا بیثرب جس الحماما
تکفل عبد مناف بامر ۔۔۔ واودی فکان علی تماماً
فقل فی ثبیر مضیٰ بعد ما ۔۔۔ قضی ما قضاہ وابقی شماماً
فللہ ذا فاتحا للھدیٰ ۔۔۔ وللہ ذا للمعالی ختاماً

[1] الحجۃ علی الذاہب الیٰ تکفیر ابوطالبؑ ۔ السید شمس الدین

وما ضر مجد ابی طالب ۔۔۔ جھول لغا او بصیر تعامًا
کما لا یضر ایات الصباح
من ظن ضوء النھار انظلاما

"اگر ابوطالب اور اُن کے فرزند نہ ہوتے تو آج دین قائم نہ ہو سکتا ان میں سے ایک نے مکہ میں حمایت و حفاظت کی اور دوسرے نے مدینہ میں موت سے پنجہ آزمائی کی. حقیقت یہ ہے کہ ابوطالبؑ نے ایک ذمہ داری لی تھی جس کو علیؑ نے پورا کیا۔ کوہ ثبیر کے پھول تو مرجھا گئے لیکن خوشبو آج تک باقی ہے خدا بھلا کرے اُنھوں نے مکہ سے خیر کا آغاز کیا اور انھوں نے بلندیوں کا خاتمہ کر دیا۔ ابوطالبؑ کو کوئی نقصان نہیں پہونچا سکتا خواہ کوئی لغویت کرے یا تجاہل عارفانہ! اس لئے کہ ان کی وضاحت کسی کے انکار سے چھپ نہیں سکتی"

اور اس طرح میں نے حضرت ابوطالبؑ کے تعظیمی حق کو بھی ادا کر دیا اور اپنے موقف کو بھی باقی رکھا۔ اس لئے کوئی جزمی فیصلہ نہیں دیا۔"[1]

العجب ثم العجب ! ابوطالبؑ کا ایمان مشکوک ہے لیکن اُن کا حق تعظیم قیامت تک مسلمانوں کی گردن پر ہے۔ وہ خود مسلمان نہ تھے لیکن اگر نہ ہوتے تو اسلام بھی نہ ہوتا ــــ خدا جانے یہ اتنا بڑا حق کفر سے پیدا ہوا ہے یا ضلالت سے ؟ لطف یہ ہے کہ اشعار میں بھی اُسی عظمت کا اعتراف ہے.

باپ بنیاد اسلام، بیٹا تکمیل اسلام !
باپ محافظ اسلام، بیٹا موت کا مقابل!
باپ ذمہ دار اسلام، بیٹا تمام جہاد و دفاع!
باپ ابتدائے خیر و ہدایت، بیٹا انتہائے بلندی و رفعت۔

کیا اس ہدایت سے مراد غیر اسلام ہے یا ہدایت اسلامی کا آغاز کرنے والا انسان "کافر تھا" استغفر اللہ !" حضرت ابوطالبؑ کا حق بھی ادا ہو گیا۔ اور ایمان کا اعتراف بھی نہیں کرنا

---

[1] شرح النہج ج ۳ ص ۲۱۷-۲۱۸

پڑا۔" پانی بھی پی لیا اور آچھو بھی ہوگیا۔ حقیقت یہ ہے کہ حدیدی نے اپنی پوری حیثیت آخر کے دو شعروں میں واضح کردی ہے۔!

ابو طالبؑ کے ایمان وعقیدہ کے لئے کیا نقصان ہے۔ اگر حدیدی جیسے افراد تجاہل عارفانہ سے کام لے کر اس کا انکار کردیں۔ اُن کی بزرگی وجلالت میں کون سا سقم پیدا ہوتا ہے اگر حدیدی اپنے مخصوص اغراض وخواہشات کی بناء پر اس کو مشکوک بنادے!

افترا پردازی اور جعل سازی

مقدمہ کتاب میں ہم اس چور بازاری کی نشاندہی کرچکے ہیں جسے معاویہ نے مسلمانوں کی دولت سے قائم کیا تھا اور جس میں جعل حدیثیں اور جھوٹی روایتیں بکا کرتی تھیں جس کا مقصد حدیثوں کو وضع کرنا، قرآنی آیات کی من مانی تاویل کرنا اور احکامِ الٰہیہ کا مسخ کرنا تھا جس کے مختلف کارہائے نمایاں نے تاریخ کی پیشانی کو داغدار اور داستانِ عالم کے چہرہ کو سیاہ کردیا ہے۔

ظاہر ہے کہ اس بازار سے ابو طالبؑ کو وہی حصہ ملنا چاہیئے تھا جو قلعہ خورزنق کے معمار کو ملا تھا کہ جب قلعہ تیار ہوگیا تو اسے پشتِ بام سے نیچے پھینک کر ہلاک کردیا گیا۔ اسلامی داستان نے یہی سلوک حضرت ابو طالبؑ کے ساتھ کیا ہے۔ مختلف افسانے صرف اس لئے گڑھے گئے کہ آپ کی عظمت وجلالت اور آپ کے ایمان وعقیدہ کو بدنما بنایا جائے۔ آپ کے اس جہادِ مسلسل کو بھلا دیا جائے جس سے رسالت کو روزِ اوّل ہی قتل ہو جانے سے بچالیا تھا۔

ہمارا فریضہ ہے کہ ہم اس مقام پر ان تمام افترا پردازیوں کی طرف ایک اشارہ جو غرض مند اور ضمیر فروش لوگوں نے اپنے مقاصد کو حاصل کرنے کے لئے کی ہیں اور جن سے حقیقتاً ابو طالبؑ کا دامنِ ایمان پاک وپاکیزہ ہے

ہم چاہتے ہیں کہ ایسی تمام روایات کو تبصرہ وتنقید کی منزل میں لاکر دیکھیں کہ ان کی صحت کہاں تک ہے اور ان کا پس منظر کیا ہے؟

ملاحظہ ہو پہلی آیت: ومنهم من يستمع اليك وجعلنا على قلوبهم اكنة ان يفقهوه وفى اذانهم وقرا وان يروا كل اية لا يؤمنوا بها حتى اذا جاءوك يجادلونك يقول الذين كفروا ان هذا الا اساطير الاولين وهم ينهون عنه وينأون عنه وان يهلكون الا انفسهم وما يشعرون

ولو ترى اذ وقفوا على النار فقالوا يليتنا نرد ولا نكذب بايت ربنا ونكون من المؤمنين ط

ان تینوں آیتوں میں قرآنِ کریم نے ان مشرکین کے حالات کی طرف اشارہ کیا ہے جو رسولِ اکرمؐ کے بیانات سنتے تھے لیکن ان کو قبول نہیں کرتے تھے. گویا کہ ان کے کان بہرے اور ان کے دلوں پر پردے پڑے ہوئے تھے. رسولِ اکرمؐ سے بحث کرتے تھے. اور کہتے تھے کہ یہ تمام آیتیں تو پرانی داستانیں ہیں۔ ان میں جھوٹ اور افترا کے علاوہ اور کیا ہے. یہ تھا ان کا انتہائی کفر اور ان کی آخری گمراہی[1]

یہی نہیں بلکہ اس سے بڑھ کر یہ لوگوں کو قرآن سننے سے بھی منع کرتے تھے کہ انھیں اس بات کا خوف تھا کہ کہیں قرآن کی حیثیت وجلالت ان کے دلوں میں جگہ نہ کر لے یا یہ کہ یہ لوگ رسولِ کریمؐ کے اتباع سے رک سکتے تھے کہیں ایسا نہ ہو کہ لوگ دائرہ اسلام میں داخل ہو جائیں اور اس طرح وہ اپنے مقصد میں ناکام رہیں۔ یہ لوگ خود بھی رسولِ اکرمؐ سے دور بھاگتے تھے اور یہ فرار درحقیقت نورِ الٰہی سے تھا جس کا نتیجہ گمراہی کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے جو واقعی ہلاکت ہے۔

ایک دن وہ آئے گا جب یہ لوگ جہنم کے کنارے کھڑے کئے جائیں گے فرطِ ندامت سے سر جھکائے ہوں گے۔ غصہ سے اپنے ہونٹ چباتے ہوں گے اور یہ سوچتے ہوں گے کہ کاش

---

[1] زمخشری نے کشاف ج ۱ ص ۴۴۷ پر نقل کیا ہے کہ یہ آیت ابوسفیان، ولید، نضر، عتبہ، شیبہ، ابوجہل جیسے وغیرہ کے لئے نازل ہوئی ہے. یہ رسولِ اکرمؐ کی باتیں سن کر مذاق اڑا دیتے تھے یہی بات بیضاوی ج ۲ ص ۱۹۴ اور مجمع البیان ج ۷ ص ۱۳ پر موجود ہے۔

ہم نے آیاتِ الٰہیہ کا انکار نہ کیا ہوتا، کاش ہم دوبارہ واپس کر دیئے جاتے اور دنیا میں جا کر باایمان بن جاتے۔

ظاہر ہے کہ ان تینوں آیات کا ایک ہی مفہوم ہے. سب مشرکین ہی کے طرزِ عمل ہی کو بیان کر رہی ہیں اور ان ہی کی مذمت کر رہی ہیں۔ لیکن خدا برا کرے تحریف کرنے والوں کا کہ انھوں نے درمیانی آیت کو اپنی منزل سے ہٹا کر اسے حضرت ابوطالبؑ کی طرف موڑ دیا۔ چنانچہ طبری نے سفیان ثوری کے حوالے سے حبیب بن ابی ثابت سے اور انھوں نے ایک شخص کے حوالے سے ابنِ عباس سے نقل کیا ہے کہ ان کی رائے میں یہ آیت حضرت ابوطالبؑ کی شان میں نازل ہوئی ہے کہ وہ لوگوں کو رسولِ اکرمؐ کی اذیت سے روکتے تھے لیکن خود اسلام سے دور بھاگتے تھے[1]

اس روایت کے سلسلے میں ہمارے حسبِ ذیل ملاحظات اور مواخذات ملاحظہ ہوں۔

الف: — اس سلسلۂ سند میں ایک سفیان ثوری ہے جس کا کام روایت میں جعلسازی کا تھا کاذبین کا کاتب[2] اور ضعفاء کا راوی تھا[3]

ابنِ مبارک کہتے ہیں کہ ایک دن سفیان ایک روایت میں خرد برد کر رہا تھا دفعتاً مجھے دیکھ لیا تو شرما گیا۔ کہنے لگا میں اسے آپ کی طرف سے نقل کرتا ہوں[4]

ابنِ معین کا قول ہے کہ سفیان کی روایتیں مثل ہوا کے ہیں[5]

ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں نقل کیا ہے کہ سفیان نے فریابی سے نقل کیا ہے کہ اگر میں روایت کو بعینہٖ نقل کرنے پر اتر آؤں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ نقل کرنا ہی چھوڑ دوں[6] سفیان کی روایتیں صلت بن دینار ازدی سے بھی ہوتی ہیں جس کا بغضِ علیؑ مشہور

---

[1] تفسیر ابنِ کثیر ج ۲ ص ۱۲۷ الغدیر ج ۸ ص ۳

[2] میزان الاعتدال ج ۲ ص ۱۲۷ ۔ لغدیر ج ۸ ص ۳

[3] اضعاف المبطاء ص ۲، دلائل الصدق ج ۱ ص ۳۱۳

[4] دلائل الصدق ج ۱ ص ۲۴، اعیان الشیعہ ج ۳۵ ص ۱۳۸

[5] دلائل الصدق ج ۱ ص ۳۴

[6] دلائل الصدق ج ۱ ص ۳۴

عالم ہے اور اسی لئے ارباب رجال نے اسے مطعون قرار دیا ہے لیکن سفیان بڑے اطمینان سے اس سے روایت کرتا ہے اور کہتا ہے کہ مجھ سے ابو شعیب نے بیان کیا ہے اس کا نام نہیں لیتا۔ اسی لئے تو شعبہ نے کہا ہے کہ جب سفیان کوئی روایت بغیر نام کے کرے تو مت قبول کرو اس لئے کہ یہ ابو شعیب مجنون کی روایت ہے [1]

بعض لوگوں نے سفیان کو شیعہ قرار دیا ہے لیکن ظاہر ہے کہ تشیع اور یہ روایتیں دو متضاد چیزیں ہیں۔ بھلا یہ ممکن ہے کہ ائمہ اہلبیتؑ کا ماننے والا شیعہ، ان کے اخبار و احادیث پر ایمان لانے والا انسان حضرت ابوطالبؑ جیسی باعظمت شخصیت کے بارے میں ایک ایسی مہمل روایت نقل کرے؟ ہرگز نہیں یہ شخص یا تو شیعیت سے خارج ہے یا اس کی یہ روایت غلط ہے

علامہ محسن امین عاملی نے اعیان الشیعہ [2] میں اس کے حالات نقل کرتے ہوئے بیان کیا ہے کہ میری نظر میں یہ شخص خراب ہے، اس نے مذہب شیعہ کے امام حضرت صادقؑ پر بھی اعتراضات کئے ہیں [3] اگرچہ بعض اسے شیعہ [4] کہتے ہیں اور بعض زیدی [5]

ب :- اس حدیث میں حبیب اور ابن عباس کا درمیانی شخص معلوم نہیں ہے اور یہ وہ بات ہے جس سے بڑے بڑے سربستہ راز کھلتے ہیں اور بڑے بڑے بزرگ رسوا ہو جاتے ہیں۔

ج :- علامہ امینی دام ظلہ کا کہنا ہے کہ یہ روایت صرف حبیب نے بیان کی ہے اور اس کے بارے میں ابن عیان اور ابن خزیمہ کی رائے یہ ہے کہ یہ جعلساز تھا۔

عقیلی کا کہنا ہے کہ یہ عطا سے حدیث بیان کرتا ہے لیکن ناقابل قبول ہے۔

آجری نے ابن داؤد سے نقل کیا ہے کہ حبیب نے عاصم بن ضمرۃ سے کوئی صحیح روایت بیان نہیں کی۔ [6]

---

[1] دلائل الصدق ج ۱ ص ۳۸ میزان الاعتدال ج ۱ ص ۴۶۸
[2] اعیان الشیعہ ج ۳۵ ص ۱۳۷ - ۱۴۸
[3] 〃 〃 ج ۳۵ ص ۱۴۲ - ۱۴۸
[4] 〃 〃 ج ۳۵ ص ۱۴۱
[5] 〃 〃 ج ۳۵ ص ۱۳۹
[6] الغدیر تہذیب التہذیب ج ۲ ص ۱۷۹

ابن جعفر نحاس کا کہنا ہے کہ اگر کسی حدیث کو سن کر میں خود بھی نقل کردوں تو یہ دلیل صحت ہے [1]

اب آپ غور کریں کہ یہ شخص کس قدر لاپروا اور مسخرہ تھا۔

د ـــ قرطبی کہتے ہیں کہ "یہ آیت تمام کفار کے بارے میں ہے کہ وہ رسولِ اکرمؐ کے اتباع سے روکتے ہیں اور خود بھی بھاگتے ہیں۔" یہی معنی حسن و عباس سے بھی منقول ہیں [2]

علامہ امینی نے نقل کیا ہے کہ طبری، ابن منذر، ابن ابی حاتم، ابن مردویہ نے علی بن ابی طلحہ اور عونی کے واسطے سے نقل کیا ہے کہ ابن عباس اس آیت کو تمام کفار کے بارے میں جانتے تھے [3] آپ فرماتے ہیں کہ سب کی رائے میں روکنے کا تعلق رسولؐ یا قرآن سے ہے جس طرح کہ بھاگنے کا تعلق بھی انھیں سے ہے۔ [4]

ھ ـــ علاوہ سفیان کے کسی ایک شخص نے بھی ابن عباس سے ایسی روایت نقل نہیں کی پھر ابن عباس کا مسلک [illegible] معلوم ہو چکا ہے لہٰذا ان کی طرف نسبت دینا افترا ہے

و - [illegible] ہم آیات [illegible] لیتے ہیں تو ہمیں یہ صاف نظر آتا ہے کہ ان تینوں آیتوں کا [illegible] اور مقصد ایک [illegible] یہ کیونکر ممکن ہے کہ درمیان سے ایک آیت کو [illegible] کرکے اسے کسی دوسرے انسان کی شان میں نازل کر دیا جائے۔

ز ـــ درمیانی آیت کا کسی الگ مقصد کے لئے ثابت کرنا آیت کے ظاہر کے بھی خلاف ہے اس لئے کہ مفسرین کے قول کی بنا پر آیت میں نہی کا تعلق رسولؐ یا قرآن سے ہے یعنی یہ لوگ رسولِ کریم کے پاس آنے سے یا قرآن مجید کی آیات سننے سے نہی کرتے اور اور روکتے ہیں۔ حالانکہ اگر ان لوگوں کی تاویل قبول کر لی جائے تو مطلب یہ ہوگا کہ رسولِ کریمؐ کو اذیت کرنے سے روکتے ہیں حالانکہ ضمیر کے مرجع میں اذیت کا کوئی ذکر نہیں ہے

ح ـــ اس تاویل سے بدتر خیال ان غرض مندوں کا ہے جو آیت کو صرف حضرت ابوطالبؑ کی شان میں ثابت کرنا چاہتے ہیں۔ اس لئے کہ آیت میں صیغے جمع کے ہیں اور ایک شخص کے لئے مفرد کے صیغے استعمال ہوتے ہیں۔ پھر یہ کیونکر کہا جا سکتا ہے کہ ابوطالبؑ رسول اللہؐ

---

[1] دلائل الصدق ج ۱ ص ۲۶
[2]-[3]-[4] الغدیر ج ۸ ص ۳

سے بھاگتے تھے جب کہ انھوں نے ایک آن کے لئے بھی رسول ؐ سے جدائی اختیار نہیں کی تو کیا نصرت و حمایت، دفاع و جہاد ہی کا نام فرار ہے۔ کیا دین کی ترویج، اسلام کی اشاعت ہی کو اسلام اور رسولِ اکرم ؐ سے فرار کہتے ہیں۔؟

ط ــ بہتر یہ ہے کہ ہم اس مقام پر مفسرین کے باقی اقوال بھی نقل کردیں تاکہ یہ معلوم ہوسکے کہ یہ آیت کن کن لوگوں کے بارے میں ہے۔ ہمارے اس بیان کا دار و مدار علامہ امینی کی تحقیقات پر ہے۔ اور وہ نہایت ہی معتبر اور امین عالم ہیں۔

○ امام رازی نے اپنی تفسیر میں دو قول نقل کئے ہیں۔ ایک یہ کہ یہ آیت کفار و مشرکین کے بارے میں ہے اور دوسرے یہ کہ ابوطالبؑ کے بارے میں ہے اور پھر فرمایا ہے کہ پہلا قول ہی صحیح ہے اور اس کی دو دلیلیں ہیں:۔

(۱) آیات کے تسلسل میں مذمت پائی جاتی ہے لہٰذا اس آیت میں بھی مذمت ہونی چاہیئے اور ظاہر ہے کہ ابوطالبؑ کا رسول اکرم ؐ کو اذیت کرنے سے روکنا کوئی مذموم کام نہیں ہے لہٰذا وہ مراد نہیں ہیں۔

(۲) اس آیت کے بعد بیان ہوا ہے کہ یہ لوگ اس عمل سے ہلاک ہو رہے ہیں اور ظاہر ہے کہ نبی کی حفاظت و حمایت موجب ہلاکت و تباہی نہیں ہوسکتی۔ پھر اگر یہ کہا جائے کہ ہلاکت کا تعلق دوسرے فقرہ سے ہے یعنی چونکہ یہ دینِ نبی سے بھاگتے ہیں اس لئے ہلاک ہو رہے ہیں تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس جملہ کا ظاہر یہ ہے کہ اس کلمہ کا تعلق پورے کلام سابق سے ہے نہ کہ صرف ایک فقرہ سے جیسا کہ ہم خود بھی استعمال کرتے ہیں کہ فلاں شخص فلاں شئے سے بھاگتا ہے اور نفرت کرتا ہے۔ حالانکہ اس میں اُسی کا نقصان ہے ظاہر ہے کہ اس جملہ میں نقصان کا تعلق بھاگنے اور نفرت کرنے دونوں سے ہے۔"

ابن کثیر نے اپنی تفسیر ج ۲ ص ۱۲۷ پر پہلے قول کو ابن حنفیہ، قتادہ، مجاہد اور ضحاک سے نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہی قول صحیح ہے اور یہی ابن جریر کا بھی مسلک ہے نسفی نے تفسیر خازن کے حاشیہ پر ج ا ص ۲ میں لکھا ہے کہ قولِ اوّل صحیح ہے یہ اور بات ہے کہ لوگوں نے ابوطالبؑ کو بھی مراد لیا ہے۔

زمخشری نے کشاف ج ا ص ۴۴۸ اور شوکانی نے اپنی تفسیر ج ۲ ص ۱۰۳ پر قولِ

اوّل کو نقل کرکے قولِ ثانی کو ضعیف قرار دیا ہے۔[۱]

بعض لوگوں نے اس آیت کو رسولِ اکرم ؐ کے ہر چچا کے لئے بیان کیا ہے۔ کہ یہ سب بظاہر ساتھ تھے لیکن باطناً مخالف تھے۔[۲]

ظاہر ہے کہ انھیں اعمام میں سے حضرت حمزہ اور عباس بھی ہیں۔ اب اگر حمزہ و عباس کا یہ انجام تصوّر کیا جاسکتا ہے جو آیت نے بیان کیا ہے تو پھر آگے جائے دم زدن نہیں ہے۔ میری نظر میں یہ قول بھی اس قول سے زیادہ تعجب خیز نہیں ہے۔ جس میں علیؑ و عباس کو جہنمی فرض کیا گیا ہے۔ استغفر اللہ!

ی ــ ان تمام قرائن سے واضح ہو جاتا ہے کہ اس روایت کا پس منظر کیا تھا؟ اور اس غلط تاویل کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ بھلا یہ کیونکر ممکن تھا کہ کفار و مشرکین کے سلسلے کی آیت اس مومن اوّل پر منطبق ہو جاتی جس کے ایمانِ کامل پر رسولِ اکرم ؐ کے احادیث ائمہ اطہارؑ کے ارشادات اور صحابۂ کرام کے اقوال، عظماءِ فکر کے بیانات اور خود حضرت ابوطالبؑ کے قصائد اور خطبۂ شہادت دے رہے ہیں کہ سندِ سواکن نبی اور معنویت برہم کن شیرازۂ قرآن ہے انھیں اسباب کی بنا پر ہر مسلمان کا فرض ہے کہ ایسی روایات کو درخورِ اعتنا نہ سمجھے۔ ان کا منشاء و مصدر ایسے ہی اشخاص ہیں جو ابھی ابھی حضرت علیؑ و حضرت عباسؓ کے ناری ہونے کی شہادت دے چکے ہیں۔ استغفر اللہ!

آیت نمبر ۲ و ۳ :

(۱)۔ ماکان للنبی والذین اٰمنوا ان یستغفروا للمشرکین ولو کانوا اولی قربی من بعد ماتبین لھم انھم اصحٰب الجحیم ○

(۲)۔ انک لاتھدی من احببت ولکن اللہ یھدی من یشاء وھو اعلم بالمھتدین ○

پہلی آیت کا خلاصہ یہ ہے کہ نبی کو مشرکین کے لئے استغفار کرنے کا حق نہیں ہے۔

---

[۱] الغدیر ج ۸ ص ۷

[۲] اسباب النزول ص ۹۸ تفسیر ابن کثیر ج ۲ ص ۱۳۷

خواہ وہ کتنے ہی عزیز قریب کیوں نہ ہوں اس لئے کہ وہ جہنمی ہیں۔
دوسری آیت کا مطلب یہ ہے کہ نبی اپنے پاس سے کسی کی ہدایت نہیں کرسکتا ہے۔ یہ
تو صرف اللہ کا کام ہے وہ ہی بہتر جانتا ہے۔

ہم دیکھنا چاہتے ہیں کہ خواہش پرست افراد نے ان آیتوں کو حضرت ابوطالبؑ پر کس طرح منطبق کیا ہے اس لئے زیادہ مناسب ہے کہ ان تمام اقوال کو نقل کردیں جو اس سلسلے میں سامنے آتے ہیں۔

۱۔ اسحٰق بن ابراہیم نے عبدالرزاق، معمر، زہری، سعید بن المسیب کے واسطے سے نقل کیا ہے کہ جب ابوطالبؑ کا وقتِ وفات آیا تو رسول اکرمؐ تشریف لائے۔ ابوجہل بھی وہاں [illegible] تھا۔ عبداللہ بن امیہ بھی حاضر تھا۔ آنحضرت نے [illegible] مایا۔ چچا کلمۂ توحید پڑھو تاکہ [illegible] یہ قیامت [illegible] آئے۔ ابوجہل [illegible] عبداللہ [illegible] نے کہا، دیکھو ابوطالب! عبدالمطلب کے دین کو نہ چھوڑنا۔ رسول اکرمؐ [illegible] نے فرمایا [illegible] وقت [illegible] ہوگا [illegible] اللہ کی طرف سے [illegible] استغفار نہ کرنا [1]

۲۔ ابی الیمان نے شعیب، زہری، سعید بن المسیب کے واسطے سے مسیب سے نقل کیا ہے کہ جب ابوطالبؑ کا وقتِ آخر آیا تو رسول اکرمؐ تشریف لائے۔ اتفاقاً وہاں ابوجہل اور ابن امیہ بھی موجود تھا۔ حضرتؐ نے چچا سے فرمایا۔ چچا کلمہ پڑھو تاکہ قیامت میں اللہ کے سامنے پیش کرسکوں۔ دونوں بول پڑے دیکھو عبدالمطلب کے دین سے اعراض نہ کرنا۔ پھر تو آنحضرت اپنی فرمائش کرتے رہے اور یہ دونوں اپنی سی کہتے رہے۔ یہاں تک کہ ابوطالبؑ نے کہہ دیا کہ ہم عبدالمطلب کے دین پر ہیں۔ اور کلمہ نہیں پڑھا۔ حضرت نے استغفار کا قصد کیا تو آیت نازل ہوگئی۔ پھر اللہ نے تسلی دی کہ تم خود کسی کو ہدایت نہیں کرسکتے۔ یہ صرف ہمارا کام ہے [2]

---

[1] بخاری ج ۲ ص ۲۰۱ ج ۳ ص ۸۷
[2] بخاری ج ۳ ص ۱۰۷

۳۔ حرملہ بن یحییٰ التجیبی نے عبداللہ بن وہب، یونس، ابن شہاب، سعید کے واسطے سے مسیب سے یہی روایت نقل کی ہے [1]

۴۔ محمد بن عبادہ اور ابن ابی عمر نے مروان، یزید بن کیسان، ابی حازم کے واسطے سے ابوہریرہ سے نقل کیا ہے کہ رسولِ اکرمؐ نے ابوطالبؑ سے وقتِ وفات کلمہ پڑھنے کے لئے کہا تو آیت اتری۔ تم کسی کی ہدایت نہیں کرسکتے [2]

۵۔ محمد بن حاتم بن میمون نے یحییٰ بن سعید، یزید بن کیسان، ابی حازم اشجعی کے واسطے سے ابوہریرہ سے نقل کیا ہے کہ آنحضرتؐ نے ابوطالبؑ سے کلمہ پڑھنے کے لئے کہا تو انھوں نے جواب دیا کہ اگر قریش کی اس ملامت کا خوف نہ ہوتا کہ موت سے ڈر گئے تو تمہارا دل خوش کردیتا۔ اس پر آیت اتری۔
اے رسولؐ! ہدایت تمہارے بس کی نہیں ہے۔ [3]

پہلی تین حدیثوں کے رواۃ

(۱)

اس مقام پر ہمارے حسبِ ذیل ملاحظات و مواخذات ہیں

حدیث اوّل :-

الف :- ان راویوں میں ایک اسحٰق بن ابراہیم ہے جس کا مکمل نام درج نہیں کیا گیا۔ خدا جانے یہ اسحٰق ضعیف ہے یا وہ ہے جس کا استاد ہی ساقط ہے یا وہ ہے جو غیر معتبر ہے یا وہ ہے

---

[1] مسلم ج ۱ ص ۴۰
[2] مسلم ج ۱ ص ۴۱
[3] مسلم ج ۱ ص ۴۱

جس کا علم ذہبی کو نہیں ہے یادہ ہے جیسے دارقطنیؒ نے ضعیف قرار دیا ہے یادہ ہے جیسے
ابن عدی اور ازدی نے واضح حدیث اور کاذب قرار دیا ہے یادہ ہے جیسے حاکم نے غیر قوی
اور ضعیف کہا ہے یادہ ہے جیسے دارقطنیؒ نے غیر قوی، نسائیؒ نے غیر ثقہ۔ ابو داؤدؒ نے لاشئ
محض، محمد بن عوف طائیؒ نے کاذب قرار دیا ہے یا پھر وہ ہے جس کی احادیث منکر اور ناقابلِ
عمل ہیں۔[1]

شاید یہ اسحٰق بن ابراہیم دبری ہے جو عبدالرزاق کا ساتھی تھا جس کو ذہبی نے صاحبِ
حدیث نہیں تسلیم کیا ہے۔ بلکہ بعض منکر حدیثوں کا راوی بھی قرار دیا ہے۔ اب خدا جانے
یہ روایت اس کی ذاتی ہے یا اسی عبدالرزاق سے ماخوذ ہے جس کا ذکر ذہبی نے کیا ہے[2]
صاحبِ شیخ الابطح کی نظر میں اس سے مراد اسحٰق بن ابراہیم راہویہ ہے[3]۔ جس کے
بارے میں ذہبی کا خیال ہے کہ ابوعبیدہ آجری نے ابو داؤد سے نقل کیا ہے کہ اسحٰق بن راہویہ
اپنی موت سے پانچ مہینے پہلے ہی متغیر ہو گیا تھا۔ اسی لئے میں نے اس کے روایات کو رد کیا ہے
ابوالحجاج سے اس کی روایت کا ذکر کیا گیا تو انھوں نے فرمایا کہ وہ آخر میں گڑبڑ ہو گیا تھا۔ اس کے
بعد اس کے منکر احادیث کا تذکرہ کیا ہے[4]
لیکن میری نظر میں اس سے مراد دبری ہی ہے اس لئے کہ وہ عبدالرزاق کا مصاحب
تھا اور یہ روایت بھی عبدالرزاق ہی سے ہے۔

ب ـــ اس کے بعد عبدالرزاق کا ذکر آتا ہے۔ یہ کون ہے؟ شاید عبدالرزاق بن عمر الثقفی
ہو، جو ضعیف، غیر معتبر، منکر الحدیث تھا اور بقول دارقطنیؒ اس کی کتاب بھی ضائع
ہو گئی تھی۔ بلکہ بقول ابومسہر جب زہری کی روایات کی کتاب گم ہو گئی تو اس نے اپنے پاس سے دوسری
روایتیں شروع کر دیں[5]

---

۱ میزان الاعتدال ج ۱ ص ۶۸، ۸۴
۲ المیزان ج ۱ ص ۸۵
۳ شیخ الابطح ص ۸۰
۴ المیزان ج ۱ ص ۸۶
۵ المیزان ج ۱ ص ۱۲۶

اس کی شخصیت کے متعلق ذہبی کا قول ہے کہ اس کے احادیث منکرات ہیں بلکہ یہ وہ شخص
ہے جس نے معمر بن راشد سے دس ہزار روایتیں نقل کی ہیں[1]

ج ـــ اس کے بعد معمر کا ذکر ہے جو کذاب، مجہول اور راویٔ منکرات کے علاوہ کوئی اور نہیں ہے شاید
یہ وہی ابن راشد[2] ہے جس کے بارے میں ذہبی کا قول ہے کہ اس کے اوہام مشہور ہیں اور
ابوحاتم کا قول ہے کہ بصرہ کے اس کے تمام روایات مشکوک ہیں[3] خود عبدالرزاق نے کہا ہے کہ
میں نے اس سے کئی ہزار حدیثیں نقل کی ہیں[4]

ماشاءاللہ یہ کثیر مقدار۔ خدا اور بھی زیادہ کرے اور مبارک بھی کرے
فرمایئے! اس سلسلے میں کوئی معقول آدمی بھی نظر آیا۔ یا سب کے سب......!

(۲)

حدیث ثانی

الف۔ اس سلسلۂ سند میں ایک ابی الیمان ہے جس کی ایک ہی حدیث ہے اور وہ بھی غیر مستند!
ب۔ دوسرا شعیب ہے جس نام کے سب کذّاب، ضعیف، راوی منکرات اور مجہول وغیرہ ہیں۔

(۳)

ان دونوں حدیثوں کا سلسلہ زہری پر آکر مل جاتا ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس زہری کی روایات کو کس طرح قبول کروں جب کہ اس کی بیان کردہ وہ حدیث بھی ہے جس میں حضرت علیؑ اور حضرت عباسؓ کے جہنمی اور بے دین ہونے کا تذکرہ ہے کیا ایسے بدنفس، بدطینت اور ذلیل آدمی کی روایت ابوطالبؑ کے بارے میں قبول ہو سکتی ہے جو امیرالمومنینؑ پر اتنا بڑا بہتانِ عظیم رکھتا ہو!
اس کی بے دینی کے اسباب بالکل واضح ہیں اور حضرت ابوطالبؑ کے بارے میں اس شخص سے اس سے زیادہ کوئی اور توقع نہیں ہو سکتی اس کے تیرِ ستم کا نشانہ خود حضرت علیؑ بھی ہیں اور حضرت ابوطالبؑ تو انھیں کے والد ماجد ہیں!

---

۱ المیزان جلد ۱ ص ۱۸۸۔ الغدیر ج ۵ ص ۲۵۳ (عبدالرزاق عثمان کی بھی توہین کیا کرتا تھا)
۲ شیخ الابطح ص ۷۰
۳ المیزان ج ۳ ص ۱۸۸
۴ المیزان ج ۲ ص ۱۸۸

ہمیں اِس تذکرہ کی ضرورت نہیں ہے کہ یہ جعل ساز تھا۔[1] اس لئے کہ علیؑ و عباس کے معاملہ میں اس کی روایت جعل سازی کا اعلیٰ ثبوت ہے البتہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس مقام پر اس نکتہ کی طرف اشارہ کر دیا جائے کہ عبدالرزاق اور معمر نے اس روایت میں زہری کا ساتھ دے دیا ہے۔ لیکن زہری بے ایمانی اور بے دینی کی اُس منزل پر تھا کہ یہ لوگ آخر تک اس کا ساتھ نہ دے سکے۔ عاجز آکر راستے سے الگ ہو گئے۔ چنانچہ عبدالرزاق نے معمر سے نقل کیا ہے کہ زہری کے پاس عروہ کی دو روایتیں علیؑ کے بارے میں تھیں۔ میں نے اس سے ان کے بارے میں سوال کیا تو اس نے جواب دیا کہ تم سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ بہرحال ان روایتوں کو تو خدا جانے البتہ ہاشم کے بارے میں زہری اور عروہ پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔[2]

اس مقام پر زہری کا ایک واقعہ اور بھی ملتا ہے۔ اور وہ یہ کہ ایک شخص مدینہ کی مسجد میں آیا۔ کیا دیکھا کہ زہری اور عروہ بن زبیر حضرت علیؑ کا تذکرہ کر رہے ہیں اور ان کی مذمت کر رہے ہیں اس نے اس بات کی اطلاع امام زین العابدینؑ کو دی۔ آپ تشریف لائے اور فرمایا اے عروہ تو وہی ہے جس کے باپ نے میرے والد سے مقدمہ بازی کی اور آخر کار ہار گیا اور اے زہری اگر تو مکہ میں ہوتا تو تجھے تیرے باپ کا گھر بھی دکھا دیتا۔[3]

(۴)

حدیث ثالث:

الف۔ حرملہ بن یحییٰ التجیبی ۔ یہ انوکھی حدیثوں کا راوی تھا۔ ابوحاتم نے اِسے قابل استدلال نہیں سمجھا۔ عبداللہ بن محمد فرہاذان نے اسے ضعیف قرار دیا ہے[4] مشہور ہے کہ اس کے پاس ابن وہب کی تمام روایتیں، علاوہ دو کے محفوظ تھیں۔

ب۔ تعجب یہ ہے کہ ابن وہب کے بارے میں تاریخ میں ہے کہ اس کے پاس ایک لاکھ ۲۰ ہزار حدیثیں تھیں جنھیں حرملہ نے محفوظ کیا تھا، صرف دو کو چھوڑ دیا تھا۔ امام احمد بن حنبل سے اس کی روایات کے بارے میں سوال کیا گیا تو آپ نے فرمایا کہ ان کا قبول کرنا مناسب نہیں ہے۔[5]

---

[1] المیزان ج ۳ ص ۱۲۶
[2] شرح النہج ج ۱ ص ۳۵۸
[3] شرح النہج ج ۱ ص ۳۷۱
[4] المیزان ج ص ۲۱۹
[5] المیزان جلد ۲ ص ۸۶۰

کیا نا قابلِ قبول ہونا اور سوا لاکھ روایات کا تنہا راوی ہونا اس کی کمزوری کے لئے کافی نہیں ہے۔ آخر اتنی وافر مقدار کہاں سے آئی؟ اب تو ضرورت اس بات کی ہے کہ مسلسل روایتیں گڑھتا رہے تاکہ یہ مقدار پوری ہو جائے اور اپنے دعوے کا بھرم رہ جائے۔

ج: یونس کا بھی پتہ نہیں ہے کہ یہ کون ہے! اس نام کے سب ہی کاذب، بدبخت منکر الحدیث بلکہ کذوب لقب کے مالک ہیں۔[1]

د: ابن شہاب کی تو رجال میں خبر ہی نہیں ہے کہ یہ کیا چیز ہے اور کہاں ملتی ہے۔؟

(۵)

ان تینوں حدیثوں کا سلسلہ سعید ابن مسیب اور اس کے باپ پر آکر مل جاتا ہے۔

الف ہم اس روایت کو اس لئے قبول نہیں کر سکتے کہ اس سعید کے بارے میں بے حد اختلاف ہے کسی نے اس کی تعریف کی ہے اور کسی نے مذمت۔ ابن ابی الحدید نے اِسے دشمنانِ علیؑ میں شمار کیا ہے! اور مشکوک فیہ قرار دیا ہے۔

ظاہر ہے کہ دشمن علیؑ بنص رسول اکرمؐ منافق ہوتا ہے۔ اس لئے اس کی روایت قابل قبول نہیں ہو سکتی۔ چہ جائیکہ اگر روایت بھی حضرت علیؑ ہی کے والد ماجد کے بارے میں ہو ہم اس مقام پر سعید کی اس گفتگو کو نقل کرنا چاہتے ہیں جو اس سے عمر بن علیؑ سے ہوئی ہے۔

ابن ابی الحدید نے اس واقعہ کو مفصل تحریر کیا ہے

"عبدالرحمٰن ابن الاسود نے ابوداؤد ہمدانی سے نقل کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ میں سعید ابن مسیب کے پاس بیٹھا تھا کہ عمر ابن علی آگئے، سعید نے ان سے کہا کہ آپ اپنے بھائیوں کی طرح مسجد میں کیوں نہیں آتے اُن لوگوں کی تو آمد و رفت زیادہ ہے حضرت عمر نے جواب دیا کہ کیا یہ بھی ضروری ہے کہ میں مسجد میں آؤں تو تم کو گواہ بناؤں۔ اس نے کہا کہ نہیں، غصہ کی کوئی بات نہیں ہے۔ میں نے تمہارے باپ کو کہتے سنا ہے کہ میرے لئے ایک ایسا مرتبہ ہے جو اولاد عبدالمطلب کے لئے پوری کائنات سے بہتر ہے حضرت عمر نے جواب دیا کہ میرے باپ نے یہ بھی فرمایا ہے کہ اگر کوئی کلمۂ حکمت کسی منافق کے دل تک پہنچ گیا ہے تو وہ مرنے

---

[1] المیزان ج ۳ ص ۳۳۶ - ۳۴۰

سے پہلے ہی اس کو ظاہر کر دے گا۔ سعید نے کہا کہ آپ نے مجھے منافق بنا دیا۔ انھوں نے فرمایا کہ جو کچھ کہنا تھا کہہ دیا اور یہ کہہ کر چل دیئے۔" [۱]

مقصد یہ تھا کہ ابن مسیّب نے مرنے سے پہلے ہی امیر المومنینؑ کی فضیلت کا اظہار کر دیا۔

حضرت عمر بن علی کی یہ تند و تیز گفتگو اور آپ کا یہ سخت لہجہ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ آپ کی نظر میں ابن مسیب دشمنِ اہلبیتؑ اور حق سے منحرف انسان تھا، بلکہ تاریخ میں اس انحراف کا شاہد ایک واقعہ بھی ملتا ہے کہ جب سید الساجدینؑ کا انتقال ہوا تو اس شخص نے آپ کے جنازہ پر نماز نہیں پڑھی۔ کسی شخص نے اعتراض کیا تو جواب دیا کہ دو رکعت نماز پڑھ لینا ایسے رجل عظیم کی نماز جنازہ پڑھنے سے بہتر ہے۔ ظاہر ہے کہ اب ایسے افراد کی روایت کا کیا بھروسہ ہے۔ انھیں ابن مسیب کی ایک روایت اور بھی نظر آتی ہے جس میں فرماتے ہیں کہ اگر کوئی شخص ابوبکر و عمر عثمان اور علیؑ کی محبت میں عشرہ مبشرہ پر ایمان لا کر اور معاویہ کے لئے دعائے رحمت کر کے مر جائے تو اللہ پر یہ فرض ہو جاتا ہے کہ اس سے حساب کتاب نہ کرے [۲]

ابن مسیب نے تو معاویہ کے بارے میں یہ تک کہہ دیا ہے کہ: "معاویہ کی تمام تر رغبت ذاتِ احدیث کی طرف تھی، اس لئے مجھے امید ہے کہ اللہ اس پر عذاب نہیں کرے گا" [۳]

ذرا غور تو کریں، اس شخص نے کس طرح ہزار ہا ناحق خون، بے شمار پامال شدہ حقوق اور بے حد و انتہا خیانتوں اور برائیوں کو طاق نسیاں کی نذر کر دیا اور معاویہ کے اس قول سے استدلال شروع کر دیا۔ جو اس نے اس وقت کہا تھا۔ جب موت اس کے سر پر منڈلا رہی تھی اور حیات کے قطع ہو رہے تھے۔

"خدایا لغزشوں کو معاف کر دے، غلطیوں کو بخش دے۔ صرف تجھی سے امید رکھنے والے سے حلم کا سلوک کر، تو بڑا مغفرت والا اور گنہگاروں کا ملجا و ماویٰ ہے۔" [۴]

---

[۱] شرح النہج ج ۱ ص ۳۷۰، الغدیر ج ۸ ص ۹، اعیان الشیعہ ج ۳۵ ص ۷۸

[۲] الغدیر ج ۱ ص ۱۳۸، تاریخ ابن کثیر ج ۸ ص ۱۳۹ ـ ۱۴۰

[۳] اعیان الشیعہ ج ۳۵ ص ۸۰

[۴] اعیان الشیعہ ج ۳۵ ص ۸۰

بہ ظاہر معاویہ کا یہی مقولہ اس فرقہ کی جان ہے جو ہر گناہ کو آخر وقت کی توبہ کے لئے جائز جانتے ہیں اور شاید اسی لئے اسے فرقہ کا رئیس تسلیم کیا گیا ہے۔

درحقیقت اس فرقہ نے ان بنیادوں کو مستحکم کر کے انسان کو برے اعمال کی جراءت دلائی ہے اور ایک ایسا راستہ کھول دیا ہے کہ انسان زندگی بھر گناہ و جرم کر کے آخر وقت میں چند ایسے فقرات زبان پر جاری کر دے جن کو دل کی گہرائیوں سے معاویہ کی طرح کوئی تعلق نہ ہو فائدہ یہ ہوگا کہ بعد کے آنے والے ایسے برے شخص کے لئے رحمتِ خدا کی امید رکھیں گے اور یہ خیال کریں گے کہ ان کی طرح اللہ نے بھی ان کی تمام برائیوں کو فراموش کر دیا ہے استغفر اللہ!

اس موقع پر بہتر ہے کہ ہم سعید بن مسیّب کی معاویہ پرستی اور بنی امیہ دوستی کو بھی واضح کر دیں۔ تاریخوں میں ہے کہ اس شخص سے سوال کیا گیا کہ سب سے زیادہ بلیغ انسان کون ہے؟ تو اس نے کہا۔ "رسول اللہؐ"

سائل نے کہا کہ میرا سوال ان کے بارے میں نہیں ہے۔ کہنے لگا "پھر معاویہ اس کے بعد یزید، سعید بن العاص اور اس کا بیٹا عمرو" [۱]

اس حدیث سے بڑے واضح طریقے پر ابن المسیب کے اس انحراف کا پتہ چلتا ہے جو اسے اہلبیتِ رسولؐ سے حاصل تھا۔ ممکن ہے کہ کوئی شخص اس مقام پر یہ تاویل کرے کہ چونکہ راوی نے رسول اکرمؐ کو مستثنیٰ کر دیا تھا۔ اس لئے اس نے جواب میں حضرت علیؑ کا نام نہیں لیا اس لئے کہ وہ انہی کے نفس و روح تھے۔ لیکن میری نظر میں یہ تاویل بھی اسی وقت صحیح ہو سکتی ہے جب اس شخص کے اس شدید انحراف کا سراغ نہ مل سکتا ہو۔

بعض لوگوں نے اس شخص کو شیعہ قرار دیتے ہوئے حضرت امام زین العابدینؑ کے خاص احباب میں شمار کیا ہے۔ حالانکہ یہ بات کسی طرح بھی قرین قیاس نہیں ہے۔

بھلا جو شخص اہلبیتؑ کی توہین کرے۔ حضرت ابوطالبؑ کو کافر بنائے، امام سجادؑ کے قول کی مخالفت کرے۔ کیا وہ انھیں کے خاص اصحاب میں شمار ہو سکتا ہے۔؟

---

[۱] البیان والتبیین ج ۱ ص ۳۰۲

[۲] اعیان الشیعہ ج ۳۵ ص ۸۰

یہی وجہ ہے کہ شیخ مفید نے فرمایا ہے کہ اس کا ناصبی ہونا قابلِ تردید نہیں ہے بلکہ امام مالک نے تو اسے خوارج میں شمار کیا ہے [1]

بہرحال اگر کسی صورت سے اس شخص کی وثاقت ثابت بھی ہو جائے تو پھر اس کا کھلا ہوا مطلب یہ ہوگا کہ یہ روایت اس کی نہیں ہے اور اس کے شاہد قوی وہ دوسرے افراد بن جائیں گے جنھوں نے سعید کی طرف اس روایت کو منسوب کیا ہے۔

ب ۔ سعید کے باپ جناب مسیب بن حزن تھے جن کو اپنے باپ سے میراث میں بد اخلاقی ملی تھی [2] اور یہ فتح مکہ کے مسلمانوں میں سے تھے۔[3]

ظاہر ہے کہ ایسے شخص کا حضرت ابوطالبؑ کے احتضار کے وقت موجود ہونا غیر ممکن ہے شاید اس کا مقصد یہ تھا کہ اس طرح کی روایت وضع کر کے مشرکوں کی جماعت میں کچھ اضافہ کر دیا جائے۔

بہرحال ہمیں اس سلسلے میں کوئی وثاقت کی سند نہیں ملی۔ اس لیے ہم یہ بات بہ آسانی کہہ سکتے ہیں کہ یہ روایت سند کے اعتبار سے انتہائی مہمل اور واہیات ہے۔

اس کے بعد ہم چوتھی اور پانچویں روایت پر تبصرہ شروع کرتے ہیں۔

آخری ۲ دو حدیثوں کے رواۃ

(۱)

پہلے حدیث نمبر ۴ کے رواۃ پر نظر ڈالتے ہیں تاکہ ان کے بارے میں علماء کے اقوال کا جائزہ لے سکیں۔

ا ۔ محمد بن عباد ۔ اس نام کے جتنے بھی اشخاص ہیں ان میں کوئی مجہول النسب کوئی حدیث سے جاہل، کوئی مذموم، کوئی مشتبہ اور دارقطنی کی نظر میں ضعیف ہے [4]

---

[1] اعیان الشیعہ ج ۳۵ ص ۸۰

[2] نسب قریش ص ۳۲۵

[3] اصابہ ج ۳ ص ۳۰۱

[4] المیزان جلد ۳ ص ۷۷

ب ابن ابی عمر ۔ اس کا کچھ حال ہی معلوم نہیں تو تذکرہ بیکار ہے

ج مروان ۔ اس نام سے تو ایک ٹوکری بھر سکتی ہے جس میں کچھ کاذب، کچھ مجہول، کچھ ضعیف و منکر الحدیث، کچھ لاپروا، کچھ غیر معتبر اور کچھ ناقابلِ استدلال ہوں گے [1]

(۲)

حدیث نمبر ۵ کے رواۃ حسبِ ذیل ہیں:۔

ا محمد بن حاتم میمون القطیعی المعروف بالسمین۔ ابن معین و ابن مدینی نے اسے کذاب اور فلاس نے لاشیٔ قرار دیا ہے [2]

ب یحیٰی بن سعید ۔ بخاری و ابوحاتم نے منکر الحدیث، نسائیؒ نے راویٔ احادیثِ مجہولہ ابن عدی وغیرہ نے راویٔ اباطیل، ابن حبان نے خطا کار [3] یحیٰی بن سعید قطان نے جعل ساز اور وحیاطی نے مشہور جعل ساز قرار دیا ہے [4] یاد رہے یہ وہی یحیٰی بن سعید ہے جس نے کہا تھا کہ "مجھے جعفر صادقؑ کی طرف سے کچھ شک و شبہ ہے" [5]

(۳)

دونوں حدیثوں کا سلسلہ یزید بن کیسان ۔ ابی حازم ۔ ابو ہریرہ پر آکر مل جاتا ہے۔

ا یزید ابن کیسان ۔ ذہبی نے اس نام کے دو آدمیوں کا ذکر کیا ہے، ایک وہ ہے جو حازم سے روایت کرتا ہے اور یہی وہ یزید ہے جس سے ہماری بحث و گفتگو ہو رہی ہے۔ اس کو ابوحاتم نے ناقابلِ استدلال، یحیٰی بن سعید قطان نے ناقابلِ اعتماد قرار دیا ہے [6] ذہبی کا کہنا ہے کہ یزید کی روایتیں یحیٰی قطان نے بیان کی ہیں۔ خدا جانے یہی قطان ہے جس

---

[1] المیزان ج ۳ ص ۱۵۹-۱۶۱

[2] المیزان ج ۳ ص ۳۷، دلائل الصدق ج ۳ ص ۵۹

[3] المیزان ج ۳ ص ۲۸۹

[4] دلائل الصدق ج ۱ ص ۶۸

[5] الغدیر ج ۵ ص ۳۵۲

[6] المیزان ج ۳ ص ۳۱۸

نے اِسے ناقابلِ اعتماد قرار دیا ہے یا کوئی اور ہے؟

ب ۔ ابوحاتم اشجعی ۔ اس نام کا اب تک سُراغ نہیں مِل سکا ہے۔

ج ۔ **ابوھریرہ** ۔ یہ وہ بزرگ ہیں جن کے نام، نسب سبھی میں اختلاف ہے، بلکہ یہ لقب متعدد حضرات کو دیا گیا ہے[1] بہرحال آپ وہی حضرت ہیں جن کی روایات کا مقابلہ غیر ممکن ہے[2] چنانچہ صرف تقی بن مخلد کی مسند میں آپ کی پانچ ہزار تین سو کے قریب روایتیں موجود ہیں[3]

یہی وہ حضرت ہیں جو بقول خود چادر بچھا کر روایتیں اکٹھا کیا کرتے تھے[4]۔ خدا جانے اس چادر میں کیا جمع کرتے تھے؟ اور وہی جانے کہ اس چادر والے جسدِ مبارک میں کیا تھا۔؟

میرا خیال ہے کہ یہ عبارت بھی اسی چادر میں کہیں سے چپک گئی تھی اور آپ نے جھاڑتے وقت اِسے حدیث خیال کرکے بیان کر دیا ہے حالانکہ وہ واقعی حدیث نہیں تھی جس کے اسباب حسبِ ذیل ہیں

ابوہریرہ ان لوگوں میں سے تھے جن کا بیوپار معاویہ کے چور بازار میں ہوتا تھا۔ جو حضرت علیؑ کے خلاف روایتیں وضع کرکے معاویہ کے ہاتھ بیچا کرتے تھے۔ جیسا کہ ابن ابی الحدید نے ابوجعفر اسکافی سے نقل کیا ہے۔

"معاویہ نے صحابہ اور تابعین کی ایک جماعت کو حضرت علیؑ کی مذمت میں روایتیں وضع کرنے کے لئے متعین کیا اور پھر ہر ایک کے لئے کافی انعام بھی مقرر کئے۔ چنانچہ ان لوگوں نے بھی خوب خوب حدیثیں گڑھیں۔ انہی کرایہ کے راویوں میں ابوہریرہ، عمرو بن العاص، مغیرہ بن شعبہ اور عروہ بن زبیر تھے"[5]

ابوہریرہ امیر المومنینؑ کے خلاف روایتیں وضع کرنے کے لئے کرایہ پر چلا کرتے تھے، جیسا کہ ہماری مقدمہ والی روایت سے واضح ہے کہ آپ نے حضرت علیؑ کو فتنہ گر ثابت کرکے خدا و رسول و ملائکہ اور انسانوں کی لعنت کا مستحق بنا دیا تھا[6] استغفر اللہ!

---

[1] اصابہ و استیعاب ج ۴ ص ۲۰۰، اعلام النبلاء ج ۲ ص ۴۱۷

[2] اصابہ جلد ۴ ص ۳۰۳

[3] اصابہ، الغدیر ج ۷ ص ۱۱۵

[4] اعلام النبلاء ج ۲ ص ۴۵۳

[5] شرح النہج ج ۱ ص ۳۵۸

[6] شرح النہج ج ۱ ص ۲۴۲

آپ کا سلوک معاویہ کے ساتھ بھی فقط طمع دنیا کی وجہ سے رہا ہے۔ جب اس نے کچھ دے دیا چپ ہو گئے، جب ہاتھ روک لیا شروع ہو گئے[1]

ہم آپ کے بارے میں علماء اُمّت کے اقوال پیش کرنے سے پہلے آپ ہی کی زبانی آپ بیتی سُن لینا چاہتے ہیں۔

مجھ سے رسولِ اکرمؐ نے پوچھا کہ تم کون ہو۔! میں نے عرض کی میں دوس کا رہنے والا ہوں۔ فرمایا کہ دوس میں تو کوئی خیر والا سمجھا ہی نہ تھا۔"[2]

ظاہر ہے کہ اس کلام میں حضرتؐ نے کسی ایک کو بھی مستثنیٰ نہیں کیا لہٰذا آنجناب کو بھی شامل ہونا چاہیئے۔

ابوجعفر اسکافی کہتے ہیں :۔

"ابوہریرہ ہمارے بزرگوں کی نظر میں مشکوک ہے۔ اس کی روایتیں ناپسندیدہ ہیں۔ حضرت عمر نے اس کو تازیانہ سے یہ کہہ کر مارا تھا کہ اتنی زیادہ روایتیں خود ہی جھوٹ کی دلیل ہیں[3] دوسرے موقع پر فرمایا تھا کہ "ان حدیثوں کو چھوڑ دو ورنہ پھر تمہیں دوس یعنی یمن کی طرف واپس کر دوں گا۔[4]

کیا آپ کا خیال ہے کہ حضرت عمر نے اس مارپیٹ میں ظلم کیا ہوگا اور ایک غیر مستحق کو شہر بدر کر دینے کی دھمکی دی ہوگی۔؟

میں تو خلیفہ کے بارے میں یہی فیصلہ کروں گا کہ آپ کے ضمیر نے یہ گوارا نہیں کیا کہ آپ اس قسم کی جعلی روایتیں رسول اکرمؐ کی طرف منسوب ہوتے ہوئے دیکھیں اور اقدام نہ کریں اسی لئے آپ نے مرمّت کرکے شہر بدر کرنے کی دھمکی دیدی۔

اتفاق سے یہ مرمّت کا واقعہ صرف ایک ہی دفعہ کا نہیں ہے بلکہ خود ابوہریرہ کا بیان ہے کہ جب وہ بحرین میں حضرت عمر کے عامل تھے تو انھوں نے ان سے کہا تھا کہ اے دشمنِ خدا و

---

[1] سیر اعلام النبلاء ج ۲ ص ۳۴۲

[2] سیر اعلام النبلاء ج ۲ ص ۳۶۰

[3] شرح النہج ج ۲ ص ۳۶۰

[4] اعلام النبلاء ج ۲ ص ۴۳۴، الغدیر ج ۲ ص ۳۹۵

کتابِ خدا تو نے مالِ خدا سے چوری کی ہے [1]

بھلا وہ انسان جو عمر جیسے سخت گیر اور تندمزاج انسان کے عہدِ خلافت میں ایسی جرأت کر سکتا ہے۔ ان کے بعد اس کا کیا عالم رہا ہوگا؟ یہی تو وجہ تھی کہ جب عہدِ عمر کے بعد ابوسلمٰی نے اس سے سوال کیا کہ کیا یہی عالم عمر کے دور میں بھی تھا تو جواب میں فرمادیا کہ اگر عمر کے عہد میں اس طرح بیان کرتا تو وہ تازیانہ سے اصلاح کر دیتے" [2]

دوسری مرتبہ فرمایا کہ: "اگر ان احادیث کو عمر بن الخطاب کے زمانہ میں بیان کرتا تو وہ دُرّے سے مرمّت کرتے" [3]

لیکن افسوس کہ یہ تصور بھی ان کو اس حرکت سے باز نہ رکھ سکا۔ یہاں تک کہ حضرت عمر کو تازیانہ اٹھانے کی ضرورت پڑ گئی اور کچھ تھوڑا سا خون بھی بہہ گیا۔ ظاہر ہے کہ جب عمر کے دور میں یہ حال ہے تو معاویہ کے دور میں کیا رنگ ہوگا؟ جب کہ بجائے تازیانہ کے کافی مقدار میں انعامات مل رہے ہوں اور ایک ایک جھوٹی روایت پر دولت لٹ رہی ہو۔

ابراہیم تیمی کا کہنا ہے کہ ہمارے بزرگ حضرات' ابوہریرہ کی صرف انہی روایتوں پر اعتماد کرتے تھے جن میں جنت و جہنم کا تذکرہ ہو۔ [4]

الحمد للہ کہ مذکورہ روایت، دونوں سے خارج ہے علاوہ اس کے کہ جب ان تمام روایتوں کو صرف بے اعتباری کی وجہ سے ترک کیا گیا تھا تو پھر دیگر مسائل میں اس پر اعتماد کیسے ہو سکتا ہے؟ شعبہ کی رائے ہے کہ یہ جعل ساز تھا [5]۔ مگر افسوس کہ ذہبی نے صحابہ کی عدالت کو برقرار رکھنے کے اس کا بھرم رکھنے کی کوشش کی ہے۔

اعمش کہتے ہیں کہ ابراہیم ایک صحیح الحدیث بزرگ تھے' میں تمام روایتیں انھیں سناکر

---

[1] شرح النہج ج ۲ ص ۱۰۴، فتوح البلدان ص ۱۱۲' اعلام النبلاء ج ۲ ص ۴۴۰' الغدیر ج ۶ ص ۱۷۱

[2] الغدیر ج ۶ ص ۲۱۵' اعلام النبلاء ج ۲ ص ۴۳۳

[3] " " " " " " " " ص ۴۳۳ - ۴۳۴

[4] شرح نہج ص ۳۶۰' اعلام النبلاء ج ۲ ص ۴۳۸

[5] اعلام النبلاء ج ۲ ص ۴۳۷

ان سے تصدیق کرایا کرتا تھا۔ ایک دن میں نے ابوصالح کی وہ روایات بیان کیں جو ابوہریرہ سے مروی تھیں تو انھوں نے فرمایا کہ ابوہریرہ کا ذکر مت کرو۔ علماء نے اس کی اکثر حدیثوں کو ترک کر دیا ہے [1]

حضرت امیرالمومنینؑ سے روایت کی گئی ہے کہ رسولِ اکرمؐ پر سب سے زیادہ بہتان باندھنے والا ابوہریرہ تھا [2]

ظاہر ہے کہ امامؑ کے اس ارشاد کے بعد ابوہریرہ کی افترا پردازیوں کی کوئی وقعت نہیں رہ جاتی اب ہمارے سامنے دو ہی راستے رہ جاتے ہیں' یا ابوہریرہ کی خاطر امامؑ کی تکذیب کریں یا امامؑ کے قول پر اعتماد کرتے ہوئے ابوہریرہ کی روایات کو ترک کر دیں۔

امام ابویوسف کہتے ہیں کہ میں نے ابوحنیفہ سے سوال کیا کہ اگر کوئی روایت ہمارے قیاس کے خلاف ہو تو کیا کریں؟ انھوں نے فرمایا کہ اگر راوی معتبر ہے تو روایت پر عمل کرو ورنہ قیاس پر عمل ہوگا آخر کلام میں آپ نے فرمایا کہ تمام صحابہ عادل ہیں علاوہ بعض کے اور ان میں سے ایک ابوہریرہ بھی ہے [3]

کہا جاتا ہے کہ جب ابوہریرہ معاویہ کے ساتھ کوفہ آیا تو اس کا دستور تھا کہ شام کے وقت باب کندہ کے پاس نشست کیا کرتا تھا۔ اتفاقاً ایک دن ایک جوان بھی آکر بیٹھ گیا (یہ غالباً اصبغ بن نباتہ تھے) اور کہنے لگا:

"اے ابوہریرہ! خدا کو حاضر و ناظر جان کر بتا کیا تم نے رسولِ اکرمؐ سے یہ حدیث سنی ہے کہ "خدایا علیؑ کے دوست کو دوست اور علیؑ کے دشمن کو دشمن قرار دے" اس نے کہا ہاں! جوان نے برجستہ کہا۔ "خدا شاہد ہے کہ تو نے دشمنِ علیؑ سے دوستی اور دوستِ علی سے دشمنی کی ہے" اور یہ کہہ کر روانہ ہو گیا۔ [4]

ابوالاصبغ بن نباتہ امیرالمومنینؑ کا خط لے کر معاویہ کے پاس پہنچے۔ کیا دیکھا کہ بے ایمانوں کا ایک ہجوم ہے۔ عمرو بن عاص' ذوالکلاع' حوشب ابن عمر' ولید بن عقبہ' شرجیل' ابوہریرہ' ابودردا

---

[1] شرح النہج ج ۱ ص ۳۶۰' اعلام النبلاء ج ۲ ص ۴۸

[2] " " ج ۱ ص ۳۶۰

[3] " " ج ۱ ص ۳۶۰

[4] شرح النہج ج ۱ ص ۳۶۰' ابوہریرہ ص ۳۹' الغدیر ج ۱ ص ۲۶۰

سب ہی بیٹھے تھے۔

ابو الاصبغ نے معاویہ سے سخت لہجے میں گفتگو کی اور آخر میں عمرو عاص کی طرف مخاطب ہوئے اے صحابیؓ رسولؐ! خدائے وحدہٗ لاشریک اور رسول اکرمؐ کی قسم، یہ بتاؤ کہ غدیر خم میں رسولِ اکرمؐ سے یہ سنا ہے یا نہیں "مَنْ كُنْتُ مَوْلَاهُ فَهٰذَا عَلِيٌّ مَوْلَاهُ" ابوہریرہ نے کہا سنا تو ہے۔

ابو الاصبغ نے جواب دیا۔ تو پھر تو دشمنِ علیؑ کا دوست اور محبِ علیؑ کا دشمن ہے۔

ابوہریرہ نے ایک سرد آہ کھینچی اور کہنے لگا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ[1]

بسر بن ارطاۃ کے مظالم کے بعد جاریہ بن قدامہ السعدی مدینہ آئے۔ ابوہریرہ نماز جماعت کے لئے کھڑے ہو چکے تھے۔ جیسے ہی انھیں یہ خبر ملی فوراً فرار کر گئے۔

جاریہ نے کہا کہ "خدا کی قسم اگر یہ بلّی والا مل جاتا تو فوراً اس کی گردن اُڑا دیتا[2]

کہا جاتا ہے کہ ابوہریرہ روزانہ بارہ ہزار تسبیح پڑھتے تھے اور کہتے تھے بقدرِ گناہ تسبیح کرتا ہوں[3]

ہمیں اِس روایت پر کوئی اعتراض نہیں ہے نہ ہم یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ اتنی کثیر عبادات کے بعد اتنی بے انتہا روایتوں کے لئے وقت کہاں سے نکال لیتے تھے، جب کہ فکر معاش بھی دامن گیر تھی اور معاویہ کی مصاحبت بھی ضروری تھی۔

ہم تو صرف یہ کہنا چاہتے ہیں کہ جس مقدار میں آپ نے اپنے گناہوں کا اعتراف کیا ہے وہ بڑی ہولناک مقدار ہے اور میرے خیال میں گناہ نہ کرنا اس استغفار سے بہتر تھا۔ افسوس یہ ہے کہ بعض ایسے اشخاص بھی پیدا ہو گئے ہیں جو گناہوں کی دعوت یہ کہہ کر دینے لگے کہ:- "رسولِ اکرمؐ کا ارشاد ہے کہ اگر تم لوگ گناہ نہیں کروگے تو اللہ تمہیں ختم کر کے ایک ایسی قوم پیدا کرے گا جو گناہ کرے تاکہ یہ لوگ استغفار کریں اور اللہ بخشے" ـــــــ اس حدیث کی

---

[1] تذکرۃ الخواص ص ۹۱-۹۳، الغدیر ج ۱ ص ۲۰۲

[2] طبری ج ۴ ص ۱۰۷، کامل ج ۳ ص ۱۹۳

[3] سیر اعلام النبلاء ج ۲ ص ۴۳۹

پوری پوری حمایت استاد محمد خالد نے کی ہے۔ ہمیں کچھ کہنا نہیں ہے صرف اشارہ کافی ہے۔

ابوہریرہ فکری اعتبار سے کمزور اور عقلی لحاظ سے بڑا ضعیف تھا۔ ابتدائے عمر میں یہ ایک بے ارزش انسان تھا اس لئے معاویہ کے تقرب کے بعد اس کے حواس جاتے رہے، کبھی بچوں کے ساتھ کھیلتا تھا[1] اور شاید اس کے جواز کے لئے رسولِ اکرمؐ سے حدیثیں بھی بیان کرتا رہا ہو خصوصاً ایسے ماحول میں جب حدیثوں کی تجارت کا بازار اپنے پورے شباب پر تھا۔ اور ایسی ایسی حدیثیں وضع ہوتی تھیں مثلاً "جس نے عکّہ کی پیاز کھائی گویا مکّہ کی زیارت کر آیا۔"

کبھی معاویہ کی طرف سے والی بن[2] کر مدینہ میں علیؑ کی مخالفت میں بیان دیتا تھا اور انھیں خدا و رسولؐ و ملائکہ اور انسان کی لعنت کا مستحق قرار دیتا تھا۔

استغفرك يارب!

روایات میں یہاں تک ہے کہ یہ شخص مدینہ میں خطبہ پڑھتا تھا "شکر ہے اس خدا کا جس نے دین کو استحکام اور ابوہریرہ کو امام بنایا ہے" اور تمام حضار بزم ہنستے تھے[3] یعنی خطبہ تبلیغ، دعوت نشر و اشاعت اور تہذیب و اخلاق سے گزر کر مضحکہ خیزی اور تماشہ کا موضوع بن گیا تھا۔

کبھی بازار میں چلتے چلتے لوگوں کو لات مار کر گرا دیتا تھا اور کہتا تھا "دیکھتے نہیں امیر آرہا ہے[4]

ابن ابی الحدید نے ان تمام حالات کو نقل کرنے کے بعد تحریر کیا ہے کہ ان تمام بیانات کا ماخذ ابن قتیبہ کی کتاب المعارف ہے اور ابن قتیبہ کا قول اس مسئلے میں حجت ہے کہ وہ ایک بے غرض انسان تھا[5]

---

[1] شرح النہج ج ۱ ص ۳۶۰

[2] ابوہریرہ کی حکومتِ مدینہ معاویہ کی طرف سے کوئی جدید اقدام نہ تھا۔ بلکہ اس سے پہلے یہ عہدہ بسر ابن ارطاۃ کے حوالہ ہو چکا تھا جس کا انجام اہلِ تاریخ سے پوشیدہ نہیں ہے یہی وہ حکومتیں تھیں جنھوں نے یزید کو واقعۂ حرہ کا موقع دیا تھا۔ معاویہ نے جب ابوہریرہ کو والی بنایا تو اعلان کردیا کہ بسر کے بعد ابوہریرہ حاکم ہوا ہے لہٰذا اس کی مخالفت نہ کرنا۔ (شرح النہج ج ۱ ص ۱۱۸، ابوہریرہ ص ۲۵، الغدیر ج ۱۱ ص ۲۴، طبری ج ۴، ص ۱۰۷، کامل جلد ۳ ص ۱۹۳)۔

[3] شرح النہج ج ۱ ص ۳۶۰۔ سیر اعلام النبلاء ج ۲، ص ۴۳۴

[4] و [5] شرح النہج ج ۱ ص ۳۶۰

ابوہریرہ نے جب سے یہ دیکھ لیا تھا کہ میری خواہشات کا علاج صرف معاویہ کے پاس ہو سکتا ہے، اُس وقت سے برابر اسی کے پاس رہا کرتا تھا۔ اُٹھنا بیٹھنا، چلنا پھرنا سب اسی کے ساتھ۔ یہاں تک کہ ایک مرتبہ معاویہ نے اسے[1] اور نعمان بشیر کو یہ پیغام دیکر بھیجا کہ علیؑ سے قاتلانِ عثمان کا مطالبہ کریں۔ معاویہ کا مقصد صرف یہ تھا کہ علیؑ کا انکار ایک بہانہ بن جائے اور یہ جانے والے لوگوں کے سامنے ان کی مذمت کرے، ورنہ اسے حضرت علیؑ کے موقف سے پوری پوری واقفیت تھی۔

جب دونوں نمائندے حضرت علیؑ کے پاس پہنچے تو ابوہریرہ نے اپنی درخواست پیش کی۔ نعمان نے اس کی تائید کی۔ حضرت نے ابوہریرہ سے رُخ موڑ کر نعمان کو سمجھانا شروع کیا۔ تھوڑی دیر بعد نعمان نے رضامندی کا اظہار کر دیا تو حضرت نے سکوت فرمالیا۔ لیکن ابوہریرہ نے صاف صاف کہہ دیا کہ ہمیں معاویہ کا ساتھ دینا ہے[2] اس لئے کہ اس کی خاطر خواہ رقم تو وہیں مل سکتی تھی۔ بلکہ اگر کچھ بھی کمی پڑ جاتی تو بے شمار حدیثیں ہی کافی تھیں۔

یاد رہے کہ یہ پانچ ٹوکریوں کی روایت ہماری طرف سے نہیں ہے بلکہ یہ خود حضرت ابوہریرہ کا بیان ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ میرے پاس پانچ ٹوکری احادیث ہیں جن میں سے میں نے دو ٹوکریوں کو ظاہر کیا ہے۔ اگر کہیں تیسری کو ظاہر کرتا تو لوگ مجھے پتھروں سے مارتے[3]

---

[1] بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ ابوہریرہ کا ہمسفر ابو درداء تھا۔ بنابریں ممکن ہے کہ یہ واقعہ دو مرتبہ پیش آیا ہو بلکہ بعض روایات میں یہاں تک ہے کہ جب ابوہریرہ پلٹ کر آیا تو عبدالرحمٰن بن غنم نے اس پر عتاب کیا۔ عجیب بات یہ ہے کہ تم دونوں نے یہ اقدام کیونکر کیا؟ تم نے خلافت کو شوریٰ کے حوالے کیا اور جب انصار و مہاجرین اہلِ حجاز و عراق بلکہ مخالفین جیسے بہترین افراد نے بیعت کر لی تو تم نے انحراف شروع کر دیا بھلا طلقاء کو خلافت سے کیا تعلق ہے یہ سب تو حزب مخالف کے رئیس تھے۔ یہ سن کر دونوں نے اظہارِ ندامت کیا اور توبہ کر لی (استیعاب ج ۲ ص ۱۷۲، الغدیر ج ۱۰ ص ۱۳۱ ـ ۳۳۱، اسدالغابہ ج ۳ ص ۳۱۸)۔
ہمیں اس توبہ سے بحث نہیں ہے کہ آیا یہ صحیح ہے یا غلط۔ ہمارا سوال تو صرف یہ ہے کہ کیا اس توبہ کے بعد بھی معاویہ کا جلیس ہونا جائز تھا۔ کیا خونِ عثمان کا ناحق مطالبہ اس توبہ سے ساز گار تھا۔ کیا امیرالمومنینؑ اور ان کے والد بزرگوار کی توہین و تنقیص یہ سب توبہ کے ارکان میں داخل تھے۔ ابو درداء کا تو صریحی قول ہے کہ میں اپنے دل کو باطل کا عادی بنا رہا ہوں تاکہ باطل اس کی نظر میں حق سے زیادہ قوت پیدا کر لے۔ (کامل مبرد ج ۲ ص ۶۶۸)

[2] شرح النہج ج ۱ ص ۲۱۳، ابوہریرہ ص ۲۲-۲۳

[3] ابوہریرہ ص ۴۸، حلیۃ ابی نعیم ص ۳۸۱، اعلام النبلاء ج ۲ ص ۴۲۹-۴۴۲

شاید آپ نے انہی دو کو ظاہر کیا تھا۔ جس پر فرماتے تھے کہ "میری اتنی تکذیب کی گئی کہ لوگ مجھے کنکریاں مارنے لگے اور مجھ پر کوڑا پھینکنے لگے"[1] اور اگر کہیں تیسری کو ظاہر کر دیتے تو لوگ مینگنیوں سے مرمت کرتے[2] پھر آپ تصور کریں کہ اگر چوتھی اور پانچویں کو ظاہر کرتے تو کیا حشر ہوتا؟

شاید اسی کی طرف ایک مقام پر اشارہ فرماتے ہیں۔

"میں نے رسول اکرمؐ سے دو ظرف بھر روایتیں جمع کی ہیں۔ ایک کو منتشر کر دیا ہے اور ایک محفوظ ہے۔ اگر اس کو بھی ظاہر کر دوں تو میری گردن اڑا دی جائے۔"[3]

ابوہریرہ نے اس مقام پر اپنے بیان میں بڑی ہنرمندی سے کام لیا ہے آپ نے اپنے طرز بیان سے احادیث کو ایک مادی شئے ثابت کیا ہے جیسے ظرف و برتن، چادر یا رومال میں باندھ لیا جائے جس پر ایک طرف احادیث کا انبار ہو اور دوسری طرف جوں کی رفتار[4]!

حضرت علامہ شرف الدین موسوی طاب ثراہ نے اپنی کتاب "ابو هريرہ" میں ان تمام مطالب کو اس انداز سے بیان کر دیا ہے کہ اب مزید کسی گفتگو کی گنجائش نہیں ہے آپ نے تمام پہلوؤں پر سیر حاصل تبصرہ کرتے ہوئے ان چالیس حدیثوں پر تنقید کی ہے۔ جو ابوہریرہ نے خالق عالم، پیغمبرانِ کرام اور اولیائے خدا کی توہین کے لئے جعل کی تھیں۔ چنانچہ انہیں چالیس میں سے ایک روایت یہ بھی ہے جس سے ہم بحث کر رہے ہیں۔

ہم ابوہریرہ کی روایت کو قبول کرنے سے معذور ہیں۔ ہمارے سامنے علماء رجال کے اقوال ہیں ہمارے سامنے اس کی انحرافی سیرت ہے اور ہمارے علم میں اس کے وہ بیانات ہیں جن میں حضرت امیرالمومنین علی علیہ السلام کو مستحق لعنت قرار دیا ہے۔ استغفراللہ!

حدیثِ مذکور کے انداز بیان کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابوطالبؑ کے سامنے ابوہریرہ کھڑا دیکھ رہا تھا کہ رسول اکرمؐ کلمہ کی تلقین کرتے ہیں اور وہ انکار کر رہے ہیں اور اس پر آیت نازل ہو

---

[1] کامل مبرد ج ۳ ص ۱۲۴۱

[2] اعلام النبلاء ج ۲ ص ۴۴۲

[3] اعلام النبلاء ج ۲ ص ۴۳۰

[4] سیر اعلام النبلاء ج ۲ ص ۴۲۹

رہی ہے۔ اس لئے کہ ابوہریرہ کا بیان اس طریقے سے ہے کہ آنحضرتؐ نے اپنے چچا سے وقتِ آخر اس طرح ارشاد فرمایا۔ ظاہر ہے کہ یہ بیان وہی دے سکتا ہے جو روایت کا شاہدِ عینی ہو۔

حالانکہ کھلی ہوئی بات ہے کہ جس دن حضرت ابوطالبؑ کا انتقال ہوا ہے، اُس دن ابوہریرہ یمن میں تھا، بلکہ اس وقت تک اس نے نہ رسول اکرمؐ کی صورت دیکھی تھی نہ آپ کے جمالِ مبارک پر اس کی نظر پڑی تھی۔ اس لئے کہ حضرت ابوطالبؑ کا انتقال ہجرت کے تقریباً ۳ سال پہلے ہوا ہے، اور ابوہریرہ نے ارضِ اسلام پر اس وقت قدم رکھا ہے جب آنحضرت خیبر میں تشریف لے گئے تھے۔ یعنی سنہ ۷ھ میں![1]

اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ واقعہ ابوہریرہ کے مکہ آنے سے دس سال پہلے کا ہے اور ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں اس قسم کے بیانات کی کیا قیمت رہ جاتی ہے؟ البتہ یہ ہو سکتا ہے کہ اس وقت ابوہریرہ نے خواب دیکھا ہو اس لئے کہ خواب کے حدود غیر معین اور اس کی وسعت غیر محدود ہے۔

آیت مَاکَانَ لِلنَّبِیِّ پر ایک نظر

جب ہم اس حدیث کے اسناد کا صحیح مواخذہ کر کے اس کے تار و پود بکھیر چکے تو اب مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مزید وضاحت کے لئے آیت مبارکہ پر بھی ایک نظر ڈال لی جائے تاکہ آیت کی روشنی میں بھی حدیث کی موضوعیت اور مجہولیت ظاہر کی جا سکے۔

(۱)

بخاری کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دونوں مذکورہ بالا آیتیں حضرت ابوطالبؑ کے بارے میں نازل ہوئی ہیں۔ حالانکہ جب ہم تاریخ پر ایک نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ پہلی آیت مدینہ میں نازل ہوئی ہے اس لئے کہ سورۂ برآت مدنی ہے اور تبلیغ برأت کا قصہ شہرۂ آفاق حیثیت رکھتا ہے۔ بلکہ بعض اقوال کی بنا پر یہ قرآن کا آخری سورہ ہے[2]

---

[1] اصابہ ج ۴ ص ۲۰۳، سیر اعلام النبلاء ج ۲ ص ۶۴–۴۲۳ — ۴۲۵–۴۳۶

[2] صحیح بخاری ج ۳ ص ۷۷، کشاف ج ۱ ص ۷۰۰، ۵، حاشیہ کشاف ج ۲ ص ۱۸۸، بیضاوی ج ۲ ص ۲۷۴، مجمع البیان ج ۱۰ ص ۵، تفسیر ابن کثیر ج ۲ ص ۳۳۱، اتقان ج ۱ ص ۲۷، ۲۶، ۱۵۔ الغدیر ج ۸ ص ۱۰ بحوالہ ابن ابی شیبہ، بخاری، نسائی، ابن ضریس، ابن منذر، نحاس، ابوالشیخ، ابن مردویہ۔

جس کا مطلب یہ ہے کہ دونوں آیتوں میں تقریباً دس سال کا فاصلہ ہے

(۲)

یہیں سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ مذکورہ بالا آیت فتح مکہ کے بعد مدینہ میں نازل ہوئی ہے جیسا کہ سورۂ برأت کے نزول کے بارے میں معلوم ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ آیت میں اور حضرت ابوطالبؑ کی وفات میں کم از کم ۸ سال کا فاصلہ ہے۔

یعنی حضرت رسولِ اکرمؐ حضرت ابوطالبؑ کی وفات کے بعد ۸ سال تک ان کے لئے حسبِ وعدہ استغفار کرتے رہے اس کے بعد آیت مذکورہ نے آ کر ممانعت کی کہ اب اس کے بعد نبی کو مشرکین کے لئے استغفار کرنے کا حق نہیں ہے۔

ہمارا سوال یہ ہے کہ وفاتِ ابوطالبؑ سے لے کر نزولِ آیت تک رسولِ اکرمؐ ان کے لئے کیونکر استغفار کرتے رہے جبکہ رسول پر متعدد آیتیں کفار سے ترکِ موالات اور ان کے لئے ترکِ استغفار کے سلسلے میں نازل ہو چکی تھیں جیسا کہ ہم بعض کی طرف اشارہ کر چکے ہیں اور بعض یہ ہیں:

۱ — لاتجد قوماً یومنون باللّٰہ والیوم الاٰخر یوادون من حاد اللّٰہ و رسولہ ولو کانوا اٰبائهم

"ایمان والے دشمنانِ خدا و رسول سے دوستی نہیں کر سکتے۔ چاہے وہ ان کے باپ ہی کیوں نہ ہوں۔"

یہ آیہ مبارکہ مدینہ میں سورۂ برأت سے سات سورہ پہلے[1] بلکہ بقول بعض جنگِ بدر کے موقع پر سنہ ۲ھ[2] میں نازل ہوئی ہے بعض کا خیال ہے کہ جنگِ احد کے موقع پر سنہ ۳ھ[3] میں نازل ہوئی ہے۔ بعض نے اسے مکی بھی شمار کیا ہے[4]

بہرحال ان تمام اقوال کا خلاصہ یہ ہے کہ آیت مذکورہ سے پہلے رسول اکرمؐ کو ممانعت کی جا چکی تھی لیکن وہ اپنی دھن میں لگے ہوئے تھے اور برابر استغفار کرتے چلے آ رہے تھے۔ استغفر اللّٰہ!

---

[1] الغدیر ج ۸ ص ۱۰، اتقان ج ۱ ص ۱۷ (ص ۲۶ فاصلہ چھ سورہ کا)

[2] الغدیر ج ۸ ص ۱۰ بحوالہ ابوحاتم، ابوحاکم، ابونعیم، بیہقی، ابن کثیر ج ۴ ص ۳۲۹ تفسیر شوکانی ج ۵ ص ۱۸۹۔

[3] الغدیر

[4] اکثر مفسرین

۲ ـ یاایھا الذین اٰمنوا لاتتخذوا الکافرین اولیاء من دون المومنین أتریدون ان تجعلوا للہ علیکم سلطاناً مبیناً ۝

• "اے اہلِ ایمان کفار کو اپنا دوست مت بناؤ"

نحاس کے قول کے مطابق یہ آیت مکی ہے۔ اور بعض اقوال کی بناء پر وقت ہجرت نازل ہوئی ہے[۱] بعض کے قول کی بنا پر مدنی ہے اس لئے کہ حضرت عائشہ کا ارشاد ہے کہ سورۂ نساء میری حاضری کے بعد رسولؐ پر نازل ہوا ہے[۲] یعنی ہجرت کے کچھ بعد[۳] اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ آیت سورۂ برأت سے ۲۱ سورہ[۴] پہلے نازل ہو چکی تھی۔ اور رسول اکرمؐ مسلسل استغفار میں مشغول تھے

۳ ـــ لایتخذ المؤمنون الکافرین اولیاء من دون المومنین أیبتغون عندھم العزۃ ۝

"یہ لوگ جو کافروں سے دوستی کرتے ہیں کیا انھیں ان سے کچھ عزت مل جائے گی۔!"

یہ سورۂ نساء کی آیت ہے اور وہ بھی برأت سے پہلے نازل ہوا ہے۔

۴ ـــ لایتخذ المومنون الکافرین اولیاء من دون المومنین ومن یفعل ذالک فلیس من اللہ فی شیٔ الا ان تتقوا منھم تقاۃ ۝

"اہلِ ایمان کو چاہیئے کہ کافروں سے دوستی نہ کریں۔ اگر ایسا کریں گے تو اللہ سے کچھ نہ ملے گا

یہ اور بات ہے کہ تقیہ میں یہ جائز ہے۔"

یہ آیت ابتدائے آل عمران میں ہے اور یہ سورہ (۸۰) سے زیادہ آیتوں تک نجران کے وفد کی آمد پر نازل ہوا ہے[۵] جو ہجرت کے بعد کا واقعہ ہے[۶] بلکہ بعض کا خیال ہے کہ روز احزاب[۵] میں عبادہ بن صامت کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی ہے۔[۷]

بہرحال ان دونوں اقوال کی بناء پر یہ سورۂ برأت سے تقریباً ۲۴ سورہ پہلے ہے[۸]

---

[۱] اتقان ج ۱ ص ۱۲ — [۲] اتقان ج ۱ ص ۱۲

[۳] بخاری ج ۳ ص ۱۴۱ الغدیر ج ۸ ص ۱۱، [۴] اتقان ج ۱ ص ۲۶

[۵] السیرۃ الہشامیہ ج ۱ ص ۲۲۵، اسباب النزول ص ۴۳، تفسیر ابن کثیر ج ۱ ص ۳۴۲

[۶،۷] الغدیر ج ۸ ص ۱۱

[۸] الغدیر ج ۸ ص ۱۱، اتقان ج ۱ ص ۱۷ (پر پندرہ سورتوں کا فاصلہ مذکور ہے اور منظور برہان جعبری میں ۲۵ سورتوں کا)

۵ ـــ سواءٌ علیھم استغفرت لھم ام لم تستغفر لھم

"اے رسول آپ استغفار کریں یا نہ کریں اللہ انھیں نہ بخشے گا"

اس آیت کا نزول غزوہ بنی مصطلق کے سال ہوا ہے جو نزول برأت سے پہلے کا واقعہ ہے[۱]

بہرحال اس قسم کی نہ جانے کتنی آیتیں ہیں جن میں سورۂ برائت سے پہلے بھی رسول اکرمؐ کو استغفار سے روک دیا گیا تھا۔ لیکن اس کے بعد بھی آپ سورۂ برأت کے نزول تک برابر استغفار کرتے رہے۔

حدیثِ مذکورہ میں صراحت کے ساتھ ذکر ہوا ہے کہ رسول اکرمؐ آیت مذکور کے نزول تک برابر استغفار کرتے رہے۔ حالانکہ اس اقدار اہتمام، انتہائی مودت و محبت کی علامت ہے جس سے قرآن کریم نے صریحی طور پر منع کیا ہے۔ کیا کوئی مسلمان رسول اکرمؐ کو بھی مخالفِ قرآن کہہ سکتا ہے؟ کیا اس آیت کے نزول سے پہلے حضرتؐ کی نظر میں آیات الٰہیہ کی کوئی قدر و قیمت نہ تھی؟ کیا اسی سورۂ مبارکہ کی باقی آیتیں حضرتؐ کو نہ روک سکی تھیں کہ اس آیت کی نوبت آگئی! خدا معلوم ان تمام مشکلات کو کس طرح حل کیا جائے گا اور رسول اکرمؐ کی اس کھلی ہوئی توہین کو کس انداز سے سراہا جائے گا۔

خدایا ہمیں اس بات سے محفوظ رکھنا کہ ہم تیرے رسولؐ کو اذیت دے کر تیرے عذاب کے مستحق بنیں۔!

(۳)

جب ہم ان آیات اور اقوال پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ متعدد اقوال تو نزول آیت کے بارے میں ایسے ہیں جو اس روایت سے صریحی طور پر معارض ہیں اس کی حقیقت کو بے نقاب کر رہے ہیں جن میں سے ہم صرف بعض کا تذکرہ کر رہے ہیں۔

۱ ـــ جناب امیرؑ سے منقول ہے کہ آپ نے ایک شخص کو اپنے مشرک باپ کے لئے استغفار کرتے ہوئے دیکھ کر ٹوک دیا تو اس نے کہا کہ آخر حضرت ابراہیمؑ نے بھی تو استغفار کیا تھا! آخر مسئلہ رسالتمآبؐ کی خدمت میں پہنچا تو آیۂ مذکور نازل ہوئی[۲]

---

[۱] ـــ الغدیر ج ۸ ص ۱۱، اتقان ج ۱ ص ۱۱

[۲] ـــ الغدیر ج ۸ ص ۱۲ بحوالہ طیالسی ابن ابی شیبہ، احمد ترمذی، نسائی، ابو یعلیٰ، ابن جریر، ابن منذر، ابن ابی حاتم ابو الشیخ، حاکم، ابن مردویہ، بیہقی در شعب الایمان، ضیا، شیخ الابطح ص ۲۶، اتقان ج ۱ ص ۳۴، اعیان الشیعہ ج ۲۹ ص ۱۵۸، اسباب النزول ص ۱۳۷، تفسیر ابن کثیر ج ۲ ص ۳۹۳، کشاف ج ۲ ص ۴۷ ۲۔

اس حدیث سے صاف طور پر واضح ہوتا ہے کہ مشرکین کے لئے استغفار کی حرمت بالکل واضح تھی ورنہ آیت کے نازل ہونے سے پہلے جناب امیرؑ اس شخص کو ہرگز نہ ٹوکتے اور اگر ٹوکتے بھی تو اس کا یہ جواب ہرگز نہ ہوتا بلکہ کوئی اور انداز ہوتا! وہ رسولِ اکرمؐ کے استغفار سے استدلال کرتا نہ کہ حضرت ابراہیمؑ کے استغفار سے۔ جب کہ حضرت ابراہیمؑ کے استغفار کی یہ توجیہ ہو سکتی تھی کہ وہ اس طرح اپنے چچا کو دین سے قریب کرنا چاہتے تھے اور رسولِ اکرمؐ کے استغفار میں یہ فائدہ بھی مقصود نہ تھا۔

مورخ زینی دحلان اس روایت کے بارے میں رقم طراز ہیں کہ یہ روایت صحیح ہے اور اس کا شاہد بھی ایک روایت صحیحہ ہی میں ذکر ہوا ہے اور وہ ابنِ عباس کا یہ قول ہے کہ لوگ اپنے آباد اجداد کے لئے استغفار کرتے تھے۔ اس لئے یہ آیت نازل ہوئی۔ جب آیت آگئی تو اب مُردوں کو چھوڑ کر زندہ بزرگوں کے لئے استغفار کرنے لگے۔ اللہ نے حضرت ابراہیمؑ کے استغفار کی علت بیان کر کے اس سے بھی روک دیا۔ اور چونکہ یہ شاہد صحیح ہے لہٰذا اسی پر عمل کرنا چاہیئے۔ اور یہ تسلیم کرنا چاہیئے کہ یہ آیت عام لوگوں کے بارے میں ہے نہ کہ حضرت ابوطالبؑ کے بارے میں![1]

ب ـــ مسلمانوں نے رسولِ اکرمؐ سے عرض کی کیا ہم لوگ اپنے جاہلیت کے بزرگوں کے لئے استغفار نہ کریں۔ آیت نازل ہوئی کہ ہرگز نہیں، یہ مومن کا شعار نہیں ہے[2]

ج ـــ مومنین کہتے تھے کہ جب حضرت ابراہیمؑ نے استغفار کیا ہے تو ہم بھی استغفار کریں گے۔ آیت نازل ہوئی کہ اس کی مصلحت اور تھی، اب تمہارے لئے استغفار حرام ہے[3]

د ـــ رسولِ اکرمؐ غزوۂ تبوک سے پلٹ کر اپنی والدہ کی قبر پر گئے اور اللہ سے اجازت چاہی کہ وہ استغفار و شفاعت کی اجازت دے دے۔ آیت نازل ہو گئی کہ یہ حق نہیں ہے[4]

ھ ـــ رسولِ اکرمؐ مکہ آئے تو تمازت آفتاب میں ماں کی قبر پر کھڑے ہو کر استغفار کی اجازت چاہی اللہ نے اس آیت کے ذریعہ منع کر دیا[5]

---

[1] الغدیر ج ۸ ص ۱۳، اسنی المطالب ص ۱۷، شیخ الابطح ص ۶۷
[2] اعیان الشیعہ ج ۳۹ ص ۱۵۸، مجمع البیان ج ۱، ص ۱۵۰۔
[3] تفسیر ابن کثیر ج ۲ ص ۳۹۴، کشاف ج ۱ ص ۵۷۰
[4] الغدیر ج ۸ ص ۱۳۔ حاکم، ابن حاتم، بیہقی، طبرانی، ابن مردویہ
[5] الغدیر ج ۸ ص ۱۳۔ تفسیر طبری ج ۱ ص ۳۱

و ـــ رسولِ اکرمؐ والدہ کی قبر پر گئے۔ خود بھی روئے اور ساتھیوں کو بھی رُلایا اور فرمایا کہ میں نے استغفار کی اجازت چاہی تھی لیکن یہ آیت آگئی، اب صرف زیارتِ قبر کرنے کی اجازت ہے لہٰذا تم لوگ بھی زیارتِ قبور کر لیا کرو، اس لئے کہ اس سے آخرت کی یاد آتی ہے[1]

اتفاق سے یہ روایت بھی حضرت ابوہریرہ ہی کی ہے اور تعجب خیز بات یہ ہے کہ حضرتؐ نے زیارتِ قبور کی اجازت دے دی ہے اور بعض ابوہریرہ پرست لوگ اِسے بھی ناجائز خیال کرتے ہیں۔

ز ـــ سال حدیبیہ میں حضرتؐ اپنی والدہ کی قبر کے پاس سے گزرے۔ اللہ سے زیارت کی اجازت مانگی، اجازت مل گئی۔ زیارت کر لی۔ پھر استغفار کی اجازت مانگی، اجازت نہ ملی تو روتے ہوئے گھر چلے آئے، پھر تمام مسلمانوں کو بھی رُلایا[2]

ح ـــ ابن مسعود کہتے ہیں کہ ایک دن رسولِ اکرمؐ قبرستان کی طرف تشریف لے گئے اور ایک قبر پر بیٹھ کر خوب روئے اور فرمایا کہ یہ میری والدہ کی قبر ہے لیکن افسوس کہ اللہ نے استغفار کی اجازت نہیں دی اور یہ آیت نازل کر دی ہے۔[3]

ط ـــ بریدہ کہتے ہیں میں رسولِ اکرمؐ کے ساتھ تھا، آپ نے اپنی والدہ کی قبر دیکھ کر وضو کیا، نماز پڑھی اور رو دیئے۔ پھر فرمایا کہ میں نے استغفار کی اجازت چاہی تھی۔ لیکن نہ مل سکی بلکہ یہ آیت اتر آئی ہے۔[4]

ی ـــ زمخشری ابوطالب کے بارے میں آیت کا نزول نقل کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ فتح مکہ کے وقت آنحضرتؐ نے سوال کیا کہ میرے والدین میں کون زیادہ قریب العہد ہے۔ لوگوں نے عرض کیا آپ کی والدہ آمنہ بنتِ وہب آپ نے مقام ابواء میں ان کی زیارت کی اور پھر قبر سے روتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے۔ فرمایا کہ میں نے اپنے پروردگار سے زیارت کی اجازت چاہی تو مل گئی۔ لیکن جب استغفار کی خواہش کی تو روک دیا گیا۔ یہی قول زیادہ صحیح ہے اس لئے کہ ابوطالب کی وفات ہجرت سے قبل واقع ہوئی ہے اور یہ آیت مدینہ میں نازل ہوئی ہے[5]

---

[1] مسلم ج ۳ ص ۶۵، الغدیر ج ۸ ص ۱۳، تفسیر ابن کثیر ج ۳ ص ۳۹۳، السیرۃ النبویہ ج ۱ ص ۷۱
[2] علی ہامش السیرۃ ج ۱ ص ۱۹۳
[3] اسباب النزول ص ۱۲۷، تفسیر ابن کثیر ج ۲ ص ۳۹۳، السیرۃ النبویہ ج ۱ ص ۴۷، اتقان ج ۱ ص ۲۹
[4] اسباب النزول ص ۱۲۷
[5] کشاف ج ۱ ص ۵۷۰، بیضاوی ج ۲ ص ۲۹۸

ك ــ قسطلانی کہتے ہیں کہ تحقیقی طور پر یہ بات ثابت ہے کہ رسول اکرمؐ اپنی والدہ کی قبر پر آئے اور استغفار کرنا چاہا تو یہ آیت نازل ہو گئی۔[۱] یہی روایت حاکم، ابن ابی حاتم نے ابن مسعود سے اور طبرانی نے ابن عباس سے نقل کی ہے اسی سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ آیت حضرت ابوطالبؑ کے بعد نازل ہوئی ہے اور اصل یہ ہے کہ دو مرتبہ نازل نہیں ہوئی۔

اس مقام پر قسطلانی اور سیوطی کی رائے میں ایک تضاد پایا جاتا ہے۔ سیوطی نے اتقان میں جعلی روایتوں کو ثابت کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ یہ آیت چند مرتبہ نازل ہوئی ہے جب کہ قسطلانی کی نظر میں تکرار نزول خلافِ قانون ہے۔

ل ـــ اصحاب رسولؐ کی ایک جماعت نے حضرت سے عرض کی کہ ہمارے بزرگ بڑے محسن، خوش اخلاق اور وفادار تھے تو کیا ہم ان کے لئے بھی استغفار نہ کریں۔ حضرت نے فرمایا کہ میں بھی اپنے باپ کے لئے استغفار کروں گا جیسے کہ حضرت ابراہیمؑ نے کیا تھا! لیکن آیت آگئی کہ تمہیں حق نہیں ہے وہ ابراہیمؑ کا معاملہ ایک خاص نوعیت کا تھا۔[۲]

م ـــ رسول اکرمؐ نے چاہا کہ اپنے باپ کے لئے استغفار کریں تو یہ آیت نازل ہو گئی۔ آپ نے عرض کی خدایا پھر ابراہیمؑ نے کیوں استغفار کیا تھا۔ جواب ملا کہ وہ خاص معاملہ تھا![۳]

ن ـــ فتح مکّہ کے موقع پر رسول اکرمؐ مکّہ میں داخل ہوئے، ایک مقام پر آپؐ کو ایک قبر نظر آئی آپؐ نے وہاں ٹھہر کر اللہ سے استغفار کرنے کی اجازت مانگی ادھر سے اذن نہیں ملا تو روتے پیٹتے چلے آئے لوگوں نے بھی رونا شروع کر دیا، بلکہ اس دن سے زیادہ گریہ کبھی نہیں ہوا۔[۴]

ڈاکٹر طٰہٰ حسین نے اس حدیث پر تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ اس قبر کے بارے میں اختلاف ہے۔ بعض کا خیال ہے کہ یہ ماں، باپ کی قبر تھی۔ حالانکہ یہ بعید ہے اس لئے کہ ان کی قبر ابواء میں ہے بنابریں ممکن ہے کہ یہ آپ کے جدّ بزرگوار حضرت عبدالمطلب کی قبر ہی ہو۔[۵] ہماری سمجھ میں

---

[۱] الغدیر ج ۸ ص ۱۲، ارشاد الساری ج ۷ ص ۲۷۰، السیرۃ الحلبیہ ج ۱ ص ۱۲۶

[۲] الغدیر ج ۸ ص ۱۲، تفسیر طبری ج ۱ ص ۳۱، تفسیر ابن کثیر ج ۲ ص ۳۹۴

[۳] الغدیر ج ۸ ص ۱۴، درمنثور ج ۳ ص ۲۸۳۔

[۴] علیٰ ہامش السیرۃ ج ۱ ص ۱۹۳۔ تفسیر ابن کثیر ج ۲ ص ۳۹۳

[۵] علیٰ ہامش السیرۃ ج ۱ ص ۱۹۳۔

نہیں آتا کہ ایسی عظیم شخصیت کی توہین کے لئے یہ لفظ ممکن و شاید کیونکر کافی ہو گیا۔ کیا تاریخی محاسبات اسی انداز سے کئے جاتے ہیں؟ اور کیا شخصیت نوازی کا معیار یہی ہے؟

ڈاکٹر طٰہٰ حسین کے متعلق ہمیں یہ معلوم ہے کہ ان کا موقف بڑا تشکیک آمیز ہوا کرتا ہے وہ چمکتے ہوئے سورج کو یہ کہہ کر پوشیدہ کر دیتے ہیں کہ شاید ابھی طالع نہ ہوا ہو لیکن اس کی تشکیک پسندی کا تقاضا کسی وقت بھی یہ نہ تھا کہ موصوف ایک محترم شخصیت کی توہین کرتے اور ایک بے عیب ذات کو معیوب بناتے؟ کیا ڈاکٹر صاحب کے لئے یہ ممکن نہ تھا کہ اپنی تشکیک پسندی پر اعتماد کرتے ہوئے یہ لکھ دیتے کہ شاید یہ واقعہ ہی غلط اور خلافِ حقیقت ہو، مگر افسوس کہ ایسا نہ ہوا بلکہ موصوف ایک قدم اور آگے بڑھے، فرمایا کہ رسول اکرمؐ نے اپنے چچا پر اسلام کو انتہائی تاکید اور اصرار کے ساتھ پیش کیا اور قریب تھا کہ وہ قبول کر لیتے، لیکن جاہلیت کی غیرت آڑے آگئی اور وہ قبول نہ کر سکے۔ مرنے کے بعد آنحضرت نے چاہا کہ استغفار کریں لیکن قرآن کریم نے نازل ہو کر سخت تنبیہ اور ملامت کر دی۔[۱]

ہماری نظر میں اس بات کی زیادہ اہمیت نہیں ہے کہ طٰہٰ حسین نے ابوطالبؑ کی مذمت کی ہے۔ جنھیں دوسرے مقام پر اسلام کا حامی اور محافظ تسلیم کر چکے ہیں بلکہ اہمیت اس بات کی ہے کہ موصوف کا ایمان قرآن کے بارے میں کیا ہے اور وہ رسولؐ کو کیا سمجھتے ہیں؟ ویسے اتنا تو معلوم ہے کہ موصوف نے قرآن کو اس وقت تسلیم کر لیا تھا جب ان کی کتاب الشعر الجاھلی پر انکی کان لے دے کی گئی تھی۔[۲]

یہ بھی قابلِ غور بات ہے کہ اگر رسول مقبولؐ نے ابوطالبؑ کے سامنے اسلام کو پیش ہی کر دیا تو اس میں اتنی سخت ملامت و تنبیہ کی کون سی بات تھی! کیا رسولؐ کا فریضہ یہ نہیں تھا کہ وہ اسلام کو تمام نوعِ بشر کے سامنے پیش کرتے۔ بالخصوص اپنے قرابتداروں کے سامنے جس کا امر پہلے ہی روز آ چکا تھا۔ کیا اوامر کی اطاعت بھی باعثِ ملامت بن جاتی ہے۔ کیا قرآن کو بھی نبی کی حیثیت سمجھنے میں اسی طرح دھوکا ہو گیا۔ جس طرح طٰہٰ حسین کو قبر کی صحیح نوعیت معلوم کرنے میں ہو گیا تھا۔

افسوس کہ مصیبت اسی حد پر تمام نہیں ہوئی اور جسارت کے یہی حدود متعین نہیں ہوتے بلکہ موصوف رسولِ اکرمؐ کو اُن مسلمانوں کی صف میں لا کر کھڑا کر دیتے ہیں جن پر آیتِ کریمہ نے اس وقت عتاب کیا تھا جب یہ لوگ اپنے مردوں کے لئے استغفار کر رہے تھے چنانچہ فرماتے ہیں کہ قرآن کا یہ واضح انصاف اور بے باک لہجہ ہے کہ اس نے نہایت ہی واضح طور پر بلا کسی رو رعایت کے رسولؐ اور

---

[۱] علیٰ ہامش السیرۃ ج ۱ ص ۱۹۳ [۲] الفتنۃ الکبریٰ عثمان ص ۱۵۱

مسلمانوں کو استغفار کرنے پر ٹوک دیا۔[1]

معلوم ہوتا ہے کہ طٰہٰ حسین بھی دیگر مورخین کی طرح شک و وہم کی بھول بھلیاں میں چکر کاٹ رہے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ وہ اپنی تحقیقات سے علم و یقین کی دنیا میں سرگرم سفر ہیں۔ حالانکہ واقعاً ان کا عالم پرواز شک در شک اور وہم در وہم ہے ورنہ شاید و باید سے تحقیقات نہیں ہوا کرتیں۔

ہماری نظر میں طٰہٰ حسین کے ان بیانات اور بے بنیاد دعووں کی اہمیت اس لئے بھی نہیں ہے کہ ہم نے یہ کتاب بھی اسی لئے لکھی ہے کہ اس قسم کے بے بنیاد اور واہیات دعووں کی تردید کر کے یہ ثابت کریں کہ ابوتراب کے باپ کی مخالفت کے لئے یہ ریت کی دیواریں کارآمد نہیں ہو سکتیں

س — طبری وغیرہ کا خیال ہے کہ اس آیت میں استغفار سے مراد نماز ہے جیسا کہ عطا بن ابی رباح سے منقول ہے کہ ہم لوگ ہر مسلمان کی میت پر نماز ادا کیا کرتے تھے حتیٰ کہ وہ زنِ فاحشہ جو زنا سے حاملہ ہو گئی ہو، اس لئے کہ آیتِ شریفہ نے فقط مشرکین کی نمازِ میت سے ممانعت کی ہے۔[2]

اس بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ آیت میں استغفار سے مراد نمازِ میت ہے اور ظاہر ہے کہ حضرت ابوطالبؑ اور حضرت خدیجہؑ کا انتقال نمازِ میت کا حکم وضع ہونے سے پہلے ہی ہو چکا تھا۔ لہٰذا ان سے اس آیت کا تعلق ہو ہی نہیں سکتا علاوہ اس کے کہ نمازِ میت مرنے پر پڑھی جاتی ہے نہ کہ چند سال کے بعد! تو پھر حضرت ابوطالبؑ کے بارے میں آیت اُترنے کا کیا مطلب ہے؟

ع — حضرت علیؑ سے منقول ہے کہ جب آپ نے رسول اکرمؐ کو ابوطالبؑ کے انتقال کی خبر دی تو آپؐ نے فرمایا کہ جاؤ غسل و کفن دے کر دفن کر دو۔ خدا ان پر رحمت نازل کرے اور بخش دے اس کے بعد چند دنوں تک برابر استغفار کرتے رہے۔ یہاں تک کہ آیت نے نازل ہو کر مشرکین کے لئے استغفار کرنے سے روک دیا۔[3]

اس مضحکہ خیز اور حیرت انگیز روایت سے صاف طور پر ظاہر ہوتا ہے کہ یہ آیت حضرت ابوطالبؑ کے انتقال کے سال ہی نازل ہوئی ہے بلکہ اسی ہفتہ یا مہینے میں۔ اس لئے کہ اس میں چند

---

[1] علی ہامش السیرۃ ج ۱ ص ۱۹۴

[2] الغدیر ج ۸ ص ۱۴ – ۱۵، تفسیر طبری ج ۱۱ ص ۳۳

[3] الغدیر ج ۸ ص ۱۵، طبقات ابن سعد ج ۱ ص ۱۰۵، درمنثور ج ۳ ص ۲۸۲

دن تک استغفار کرنے کا ذکر ہے حالانکہ یہ آیت آخری سورہ کی آیت ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ حضرت ابوطالبؑ کے انتقال کے کم از کم دس سال بعد نازل ہوئی ہے۔ ببیں تفاوت رہ ......!

ف — جس وقت ابوطالبؑ کا انتقال ہوا تو رسول اکرمؐ نے کہا کہ جس طرح ابراہیمؑ نے اپنے مشرک چچا کے لئے استغفار کیا ہے اسی طرح میں بھی اپنے چچا کے لئے استغفار کروں گا جس پر آیت نازل ہو گئی کہ نبیؐ کو یہ اختیار نہیں ہے حضرت کو یہ حکم بڑا شاق گزرا تو آیت نے حضرت ابراہیمؑ کے استغفار کی وجہ بیان کر دی اور اس طرح رسولؐ کو تسکین ہو گئی۔[1]

اس حدیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ آیت حضرت ابوطالبؑ کے انتقال کے موقع پر نازل ہوئی ہے۔

ص — جس وقت ابوطالبؑ کا انتقال ہوا رسول اکرمؐ نے کہا۔ "اللہ آپ پر رحمت نازل کرے اور آپ کو بخش دے۔ میں تو اس وقت تک استغفار کروں گا جب تک قرآن منع نہ کر دے یہ دیکھ کر تمام مسلمانوں نے جاہلیت زدہ مردوں کے لئے استغفار شروع کر دیا اور اللہ نے فوراً آیت نازل کر دی، خبردار استغفار نہ کرنا۔[2]

یہ اٹھارہ عدد نزولِ آیت کی داستانیں ہیں جن کو احادیث و روایات سے تعبیر کیا جاتا ہے ہمیں نہ ان پر تنقید و تبصرہ کرنا ہے اور نہ ان کے متعلق کوئی فیصلہ دینا ہے یہ بات ہمارے موضوع سے خارج ہے ہماری نظر میں یہ سب ہی بے ربط و بے بنیاد ہیں۔ ہمارا مقصد تو صرف یہ واضح کر دینا ہے کہ آیت کے نزول کے بارے میں کتنا شدید اختلاف اور کتنا عظیم تعارض ہے یا یوں کہا جائے کہ آیت کو اس کے مرکز سے ہٹانے کے لئے کتنے خواہشات کس کس طرح روڑے کار لائے گئے ہیں اور قرآن کو کس کس انداز سے برباد کیا گیا ہے!

لطف کی بات یہ ہے کہ ان غرض کے بندوں نے حضرت علیؑ اور عباسؓ ہی کی طرف دو متضاد اقوال کی نسبت دی ہے۔ اب سمجھ میں نہیں آتا کہ کس قول کو اختیار کریں اور کیسے ترک کر دیں۔ ایک ہی آیت ہے کبھی رسول اکرمؐ کے جدِ امجد کی شان میں اتاری جا رہی ہے کبھی مادرِ گرامی

---

[1] الغدیر ج ۸ ص ۱۸، درمنثور ج ۳ ص ۳۲۳

[2] الغدیر ج ۸ ص ۱۵

کی شان میں اور کبھی عم محترم کی شان میں !

حقیقت یہ ہے کہ حضرت عبدالمطلب اور حضرت آمنہ پر یہ مصیبت صرف ابوطالبؑ کی وجہ سے نازل ہوئی ہے۔ ورنہ اگر آیت کو ابوطالبؑ کی شان میں نازل کرنے کی فکر نہ کی جاتی تو کسی اور کا تذکرہ بھی نہ ہوتا۔

بہرحال ان تمام روایات سے اتنی بات تو واضح ہو ہی جاتی ہے کہ رسولؐ ان تمام احکام اور نواہی کے باوجود مشرکین کے لئے استغفار کیا کرتے تھے نہ نہ محبت سے ممانعت کی آیتیں انھیں سمجھا سکیں اور نہ ترکِ موالات کے اوامر نہ پہلے سورے سے بات سمجھ میں آسکی نہ قبل برأت کے سورے سے۔

ان حضرات کا مقصد صرف یہ ہے کہ آنحضرتؐ کی ہر ممکن توہین کی جائے، ان کو اذیت پہنچائی جائے۔ چاہے اس کا تعلق براہ راست انہی کی اہانت سے ہو، یا ماں، چچا اور دادا کی توہین سے۔ ظاہر ہے کہ یہ وہ خبیث مقصد اور ناپاک ارادہ ہے جو اسلامی تقاضوں سے بالکل متضاد ہے اسی لئے تو حلبی اس مقام پر آکر متحیر ہو گئے۔ ان کا مقصد تھا کہ ان روایات کی تصحیح کریں لیکن ادھر یہ روایت بھی سامنے آگئی کہ ایک شخص نے آنحضرتؐ سے سوال کرلیا کہ آپ کے باپ کہاں ہیں؟ تو آپؐ نے فرمایا "میرے اور تیرے دونوں کے باپ جہنم میں ہیں"۔ [1]

یہاں پہونچ کر حلبی کے حواس بالکل مختل ہو گئے اور چند بیجا اور مہمل قسم کے بیانات دیتے ہوئے یہ فرما گئے کہ اس حدیث سے مراد ابوطالبؑ ہیں [2]

یہ ہے حلبی کا انداز فکر! گویا کہ جہنم ان ہی کے قبضہ میں ہے، جسے چاہیں نکال لیں اور جسے چاہیں جھونک دیں۔

بہرحال ان روایات کے بارے میں اتنا تو ضرور ہی کہا جا سکتا ہے کہ یہ سب کے سب آپس میں متعارض ہیں۔ لہذا قانونی اعتبار سے درجۂ اعتبار سے ساقط ہیں۔ بلکہ مزید لطیفہ یہ ہے کہ ایک ہی شخص کے بارے میں جتنی روایتیں ہیں، ان میں باہمی تعارض پایا جاتا ہے۔ جیسا کہ ایک دقیق مطالعہ سے واضح ہو سکتا ہے۔

---

[1] السیرۃ الحلبیہ ج ۱ص ۶۰، مسلم ج ۱ص ۱۳۲

[2] السیرۃ الحلبیہ ج ۱ص ۶۰

حضرت ابوطالبؑ کی شان میں یہ تمام روایتیں علاوہ اپنے تعارض کے ایسے ایسے ناطور دلویوں سے نقل ہوئی ہیں جن کی حیثیت سابق میں واضح کی جا چکی ہے۔ اور سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ یہ حدیثیں یا یہ افسانے قرآن کریم کی ان آیتوں سے بھی متعارض ہیں جن میں آباو اجداد رسولؐ و ائمہ اطہارؑ کی طہارت کا اعلان کیا گیا ہے [1] بھلا اس سے بڑی گندگی اور کیا ہوگی کہ انسان کی زندگی کے لمحات رجس و نجاست اور کفر و شرک میں گزر جائیں۔

یہ بھی قابلِ لحاظ بات ہے کہ ان روایات میں رسول اکرمؐ کی احکام الٰہیہ اور تعلیماتِ قرآنیہ کی مخالفت کا بھی ذکر ہے جیسا کہ مفصل طور پر بیان ہو چکا ہے

(۴)

وہ آیۂ مبارکہ جس کی تاویل یا تحریف میں اب تک بحث ہو رہی تھی، اگر اس کے الفاظ پر ایک غائر نظر ڈالی جائے تو یہ معلوم ہوگا کہ آیت میں کسی مقام پر بھی استغفار سے ممانعت نہیں کی گئی ہے۔ بلکہ اس کا انداز بیان یہ ہے کہ نبی اور اس کا اتباع کرنے والے مومنین کی یہ شان نہیں ہے کہ وہ مشرکین کے لئے استغفار کریں۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ نبی سے اس قسم کا استغفار صادر ہو ہی نہیں سکتا نہ یہ کہ نبی اس قسم کا استغفار کرتا رہا ہے اور پھر قرآن کو ممانعت کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔

اب جب آیت کا مطلب یہ ہے تو اس کا فطری نتیجہ یہ ہوگا کہ جس کے لئے نبیؐ کا استغفار ثابت ہو جائے اس کے لئے اس گفتگو کی گنجائش ہی نہ رہ جائے گی کہ کس مذہب و ملت کا آدمی تھا بلکہ خود حضرت کا استغفار کر دینا اس کے ایمان و اسلام کی سند بن جائے گا۔

چونکہ آیت میں ممانعت کا کوئی پہلو نہیں ہے اس لئے آیت کو ایسے مہمل افسانوں پر محمول کرنا حضرت رسولِ اکرمؐ کی توہین اور ان کی احکام الٰہیہ سے سرتابی کا اثبات کرنا ہے اور اس امر کا ارتکاب کسی مسلمان کے لئے جائز نہیں ہے۔

ان تمام روایات کو دیکھتے ہوئے آیت کا مطلب یوں بیان کیا جا سکتا ہے کہ رسولِ اکرمؐ نے حضرت ابوطالبؑ کے ایمان کامل اور عقیدۂ راسخہ کی بناء پر ان کے لئے استغفار شروع کیا اور

---

[1] وتقلبك فی الساجدین .... آیت شریفہ طہارت و اسلام آباء نبیؐ پر دلالت کرتی ہے۔

چونکہ حضرت کا ایمان پوشیدہ تھا اس لئے مسلمانوں نے یہ خیال کیا کہ مشرکین کے لئے استغفار جائز ہے اور انھوں نے بھی اس کا ارادہ کرلیا۔ آیت نے اُتر کر صحیح حیثیت واضح کردی کہ نبی غیر مسلم کے لئے استغفار نہیں کرتا۔ تمہارا یہ توہم غلط ہے۔ ابوطالبؑ مسلمان تھے لہٰذا تمہارے لئے یہ استغفار شایانِ شان نہیں ہے۔ رہ گیا حضرت ابراہیم علیہ السلام کا معاملہ تو اس کی علت آیت میں صراحۃً ذکر ہوگئی ہے۔

علاوہ اس کے کہ زندہ اور مردہ کے استغفار میں ایک فرق یہ بھی ہے کہ زندہ کے لئے استغفار کو تالیفِ قلب پر محمول کرسکتے ہیں۔ لیکن مردہ کے لئے یہ بات بالکل غیر ممکن ہے معلوم ہوا کہ آیت کریمہ نے نازل ہوکر دو اہم باتوں کا فیصلہ کردیا ہے۔ ایک یہ کہ رسولؐ قرآنی احکام اور تعلیماتِ الٰہیہ کی مخالفت کرکے مشرکین کے لئے ہرگز استغفار نہیں کرسکتا۔ وہ معصوم، مقدس اور تمام عیوب سے پاک ہوتا ہے۔ اور دوسرے یہ کہ وہ جس کے لئے بھی استغفار کردیتا ہے۔ اُس کے ایمان سے زیادہ کسی کا ایمان مستند و مستحکم نہیں ہوسکتا۔ اس لئے کہ وہ غیر مسلم کے لئے استغفار کرہی نہیں سکتا۔ یہی وہ نکتہ تھا جو اکثر مسلمانوں کے ذہن میں واضح ہوچکا تھا۔ اور یہی وجہ تھی کہ جب حضرت امیرالمومنینؑ نے ایک شخص کو مشرکین کے لئے استغفار کرنے سے منع کیا تو اُس نے رسول اکرمؐ کی سیرت کے بجائے حضرت ابراہیمؑ کی سیرت پیش کی۔

(۵)

یہی بخاری و مسلم کی روایت جس کے بارے میں ہم اب تک بحث کررہے تھے، بعض روایات کی بناء پر ایک ضمیمہ بھی رکھتی ہے اور وہ یہ کہ جب ابوطالبؑ کا وقتِ آخر آیا تو عباسؓ نے دیکھا کہ ان کے لبوں کو جنبش ہورہی ہے، کان لگا کر سُنا تو کلمہ پڑھ رہے ہیں۔ عرض کی یا رسول اللہ خدا شاہد ہے جس کلمہ کے لئے آپ نے حکم دیا تھا ابوطالبؑ نے اسے پڑھ لیا ہے۔

اگر ہم سابق کی تمام باتوں کو تسلیم بھی کرلیں تب بھی اتنا کہیں گے کہ حضرت عباسؓ کی شہادت کی بناء پر حضرت ابوطالبؑ کے آخری کلمات وہی تھے جن کی رسول اکرمؐ نے خواہش کی تھی۔ اب جو شخص ان احادیث کی صحت کا قائل ہے اُس کا اخلاقی اور انسانی فریضہ ہے کہ پوری حدیث کو قبول کرے ورنہ پھر سرے سے ترک کردے۔ یہ کوئی انسانیت نہیں ہے کہ اپنے مطلب کے حصّے کو الگ کرلیا جائے اور باقی کو بیکار قرار دے دیا جائے۔

(۶)

اگر ہم حضرت ابوطالبؑ کے اعتراف و اقرار، ان کے اعمال و اقوال، ان کی وصیتیں اور نصیحتیں ان سے رسول اکرمؐ کی محبت و مودت، ان کا اخلاص و التفات، ان کا استغفار و طلبِ رحمت کرنا ائمۂ اطہار کی شہادت، صحابۂ کرام ابوذر و ابنِ عباس و ابوبکر کی گواہیاں ان سب کو ترک کردیں اور صرف اِسی حدیث پر ایمان لے آئیں جس سے بحث کی جارہی ہے تب ہی ابوطالبؑ کا یہ قول کہ میں دینِ عبدالمطلب پر ہوں آپ کے ایمان کی کھلی ہوئی دلیل ہے۔

کیا عبدالمطلبؑ کا دین ملّتِ ابراہیمی میں ہے؟ کیا عبدالمطلب دینِ خدا پر نہ تھے کیا انھوں نے رسولؐ کی بعثت کا اقرار نہ کیا تھا، کیا انھوں نے وقتِ بعثت تک زندگی کی تمنّا نہ کی تھی۔ کیا مشاہدۂ جلوۂ نبوت اور مطالعۂ نورِ حق کے جذبات ان کے سینے میں کروٹیں نہ لیتے تھے یقیناً یہ سب کچھ تھا لیکن حضرت ابوطالبؑ کی الوت نے آپ کو بھی محفوظ رہنے نہ دیا۔ اور آخر آپ کے دعوائے اسلام کو بھی ملوث کرنے کی کوشش کی گئی۔

ہمارا موضوع حضرت عبدالمطلب کے ایمان کا ثابت کرنا نہیں ہے، اگر آپ کا ایمان بھی محتاجِ ثبوت ہو اس لئے ہم اس موضوع کو ترک کرتے ہیں اس پر دوسرے حضرات نے مفصل بحثیں کی ہیں۔ یہاں تک کہ سیوطی نے آباواجدادِ رسولِ کریمؐ کی پاکیزگی کے بارے میں چھ کتابیں تالیف کی ہیں۔[1]

دوسری بات یہ ہے کہ حضرت ابوطالبؑ کا یہ جواب تسلیم بھی کرلیا جائے تو بھی آپ کا مقصد صرف یہ تھا کہ آپ اپنے موقف کو مشرکین پر ظاہر نہ ہونے دیں جیسا کہ آپ کی عالمانہ سیاست سے ثابت کیا جاچکا ہے کہ آپ ایک خاص طرزِ فکر کے بانی تھے کہ اگر آپ کا اندازِ نظر ابتدائے امر سے ایسا نہ ہوتا تو آج اسلام ڈھونڈے سے بھی نہ مل سکتا۔

---

[1] الغدیر جلد ۸ ص ۱۷، السیرۃ النبویہ ج ۱ ص ۷۷

آیت اِنَّکَ لَاتَھْدِیْ پر ایک نظر

(۱)

بعض لوگوں نے گزشتہ آیت کے سلسلے کی حدیثوں کے علاوہ اس آیت شریفہ کے ذیل میں بھی کچھ حدیثیں تیار کی ہیں۔ ضرورت ہے کہ ہم ایک عبوری نظر اس کے اسناد پر بھی ڈال لیں اور اس کی حقیقت کو بھی واضح کر دیں۔

اس مقام پر صرف دو[۲] حدیثیں ہیں۔

۱ ـــ ابو سہل سری بن ابی سہل، عبدالقدوس دمشقی اور ابو صالح کے واسطے سے ابن عباس سے نقل کیا گیا ہے کہ یہ آیت حضرت ابو طالبؑ کی شان میں نازل ہوئی ہے رسول اکرمؐ نے بیحد اصرار کیا کہ مسلمان ہو جائیں لیکن نہ ہوئے آیت نے صاف کہہ دیا کہ اے رسول یہ تمہارے بس کی بات نہیں ہے

مواخذات و ملاحظات

الف ـ سری:

ذہبی کے قول کے مطابق ابن عدی کی نظر میں مہمل حدیثوں کا چور اور ابنِ خراش کی نظر میں جھوٹا ہے اس کی حدیثوں کو بلا اور مصیبت سے تعبیر کیا گیا ہے[۱]

علامہ اکبرامینی دام ظلہٗ نے اسے سلسلۂ کذابین میں شمار کیا ہے[۲]

ب ـــ عبدالقدوس دمشقی:

"عبدالرزاق کا قول ہے کہ ابنِ مبارک نے صریحی طور پر جھوٹا صرف اسی کو کہا ہے"۔ فلاس کا کہنا ہے کہ اس کے احادیث کو ترک کرنے پر اجماع قائم ہے۔ یہ نسائیؒ کی نظر میں غیر معتبر اور ابن عدی کی نظر میں عجیب و غریب روایات کا راوی ہے[۳]

اسماعیل بن عیاش کا مقولہ ہے کہ میں صرف عبدالقدوس کے کذب کی شہادت دے سکتا ہوں[۴]

---

[۱] المیزان ج ۱ ص ۳۷۰ [۲] الغدیر ج ۱ ص ۵ ـ ۲۰ ـ ۱۴۳

[۳] المیزان ج ۲ ص ۱۴۲

[۴] الغدیر جلد ۵ ص ۳۰۸، ج ۸ ص ۲۱،

عبداللہ بن مبارک کا قول ہے کہ رہزنی کا کام عبدالقدوس سے روایت کرنے سے زیادہ اچھا کام ہے[۱]

ج ـــ ابو صالح کا حال معلوم نہیں ہے، البتہ خیال یہ ہوتا ہے کہ یہ صالح بلکہ طالح[۲] تھا۔

د ـــ ابن عباس کی طرف روایت کی نسبت اس سازش کو واضح کر دیتی ہے جس کے تحت یہ ساری حدیثیں وضع ہوئی ہیں۔

"ابن عباس شعب ابو طالب میں ہجرت کے تین سال پہلے پیدا ہوئے ہیں[۳] اور اسی سال حضرت ابو طالبؑ کی وفات واقع ہوئی ہے۔ ابنِ عباس کو ان کی وفات کی کیا خبر کہ روایت کرنے بیٹھ گئے ابن عباس کی شان ان افترا پردازیوں سے اجل و ارفع ہے ان کا مسلک و مشرب وہی ہے جو مقدمۂ کتاب میں نقل کیا گیا ہے۔

دوسرے انداز سے یہی روایت سری اور عبدالقدوس جیسے جھوٹے لوگوں نے ابن عمر[۴] کی طرف منسوب کی ہے حالانکہ ابن عمر بعثت کے تیسرے سال پیدا ہوئے ہیں وہ حضرت ابو طالبؑ کے انتقال کے وقت سات برس کے لگ بھگ تھے اور ظاہر ہے کہ اس سن و سال کا بچہ وقت احتضار کی روایت نہیں بیان کر سکتا اور بحمداللہ ان دونوں کذابین کے علاوہ کوئی تیسرا ان خرافات و مہملات کا راوی بھی نہیں ہے۔

(۲)

آیت مذکورہ دو آیتوں کے درمیان واقع ہوئی ہے۔

وَاِذَا سَمِعُوا اللَّغْوَ اَعْرَضُوا عَنْهُ وَقَالُوا لَنَا اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ اَعْمَالُكُم سَلَامٌ عَلَيْكُمْ لَا نَبْتَغِي الْجَاهِلِينَ اِنَّكَ لَا تَهْدِي مَنْ اَحْبَبْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِي مَنْ يَشَاءُ وَهُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِينَ وَقَالُوا اِنْ نَتَّبِعِ الْهُدٰى مَعَكَ نُتَخَطَّفْ مِنْ اَرْضِنَا اَوَلَمْ نُمَكِّنْ لَهُمْ حَرَمًا آمِنًا يُجْبٰى اِلَيْهِ

---

[۱] الغدیر ج ۱۰ ص ۹۰

[۲] بدکردار

[۳] اصابہ ج ۲، ص ۳۲۲

[۴] الغدیر ج ۸ ص ۲۱، درمنثور ج ۵ ص ۱۳۳

ثمرات کل شیٔ رزقا من لدنا ولکن اکثرھم لا یعلمون۔

پہلی آیت میں مومنین کے اعمالِ خیر کا تذکرہ ہے اور آخری آیت میں ان لوگوں کا ذکر ہے جو صرف اس وجہ سے ایمان نہیں لائے کہ ان کی زمینیں چھن جائیں گی اور انھیں نکال دیا جائے گا۔ لہٰذا درمیانی آیت کا صاف صاف مطلب یہ ہوگا کہ "اے رسولؐ یہ لوگ جو ایمان لائے ہیں یہ تمہاری خواہش اور تمہاری دعوت پر نہیں بلکہ حقیقتاً یہ ہماری توفیق و امداد ہے"۔ لہٰذا اگر دوسری جماعت ایمان نہ بھی لائے تو تمہیں کبیدہ خاطر ہونے کی ضرورت نہیں ہے"

یہی وہ بات ہے جو قرآن کریم کی متعدد آیات میں بیان کی گئی ہے ملاحظہ ہو۔

ا ــــ لیس لک ھداھم ولکن اللہ یھدی من یشاء ــــــــ بقرہ۔پ۲

ب ــــ ان تحرص علیٰ ھداھم فان اللہ لا یھدی من یضل ــــــــ النحل۔پ۱۴

ج ــــ اتریدون ان تھدوا من اضل اللہ ــــــــ النساء پ۴

د ــــ أفانت تھدی العمی ولو کانوا لا یبصرون ــــــــ یونس پ ۱۵

ھ ــــ فیضل اللہ من یشاء ویھدی من یشاء ــــــــ ابراہیم پ ۱۴

و ــــ ومن یھدی اللہ فھو المھتدی ومن یضلل فلن تجد لھم ولیاً مرشداً٥

ظاہر ہے کہ ہم ان تمام آیتوں کو بیان نہیں کرسکتے جو اسی ایک مطلب کی شرح کررہی ہیں کہ دنیا کا ایمان اللہ کی مدد و توفیق سے ہوتا ہے یہ اور بات ہے کہ یہ توفیق اور یہ امداد جبر و اکراہ کا باعث نہیں بنتی اور یہی وجہ ہے کہ دیگر مقامات پر ہدایت و ضلالت دونوں کی نسبت خود انسان کی طرف دی گئی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے کہ:۔

فمن اھتدیٰ فانما یھتدی لنفسہٖ ومن ضل فانما یضل علیھا

ــــــــ (الاسراء۔ پ ۱۷)

(۳)

اس مقام پر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ بعض دیگر اسباب و علل کا بھی تذکرہ کردیا جائے جن کی بناء پر آیت مذکورہ کا نزول بیان کیا گیا ہے۔

ا ــــ جب رسولِ اکرمؐ جنگِ احد میں زخمی ہوکر زمین پر گرے تو آپؐ کے دندانِ مبارک شکستہ ہوگئے خون چہرہ سے جاری ہوگیا۔ آپ نے دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے۔ "خدایا! میری قوم جاہل ہے اسے ہدایت کر" اس وقت یہ آیت نازل ہوئی "اے رسولؐ ہدایت تمہارے بس کا کام نہیں ہے" ؎۱

ب ۔ مکہ میں ایک ایسی جماعت بھی تھی جو بظاہر مسلمان تھی لیکن جب رسولِ اکرمؐ ہجرت کرکے مدینہ چلے گئے تو اس نے اپنے نفاق کو ظاہر کردیا اور اسلام کی مخالفت شروع کردی۔ رسولِ اکرمؐ اور مومنینِ مدینہ کو یہ خبر ملی تو ان میں آپس میں بحث شروع ہوگئی کہ آیا یہ لوگ مومن بھی ہیں یا نہیں۔ بعض نے کہا کہ یہ مخالفت صرف تقیہ کی بنا پر ہے بعض نے کہا کہ یہ لوگ واقعاً کافر ہیں ورنہ ہجرت کرکے مدینہ چلے آتے آخرکار سب جمع ہوکر آنحضرتؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور چاہا کہ ان لوگوں کے بارے میں کوئی فیصلہ کریں۔ حضرت نے فیصلے کو ٹالے رکھا۔ یہاں تک کہ ملک نے آکر یہ آیت سنائی جس کا مطلب یہ ہے کہ تم کسی کے ایمان و ہدایت یافتہ ہونے کا فیصلہ نہیں کرسکتے۔ یہ صرف اللہ کا کام ہے ؎۲

ج ــــ یہ آیہ مبارکہ حارث بن نعمان بن نوفل بن عبدمناف کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ آنحضرتؐ کی خواہش تھی کہ یہ مسلمان ہوجائے لیکن نہیں ہوسکا ؎۳ اس کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ اس کے بعد والی آیت حارث ہی کے بارے میں نقل کی گئی ہے ؎۴ بلکہ بعض لوگوں نے تو اس پر اجماع تک کا دعویٰ کیا ہے ؎۵

د ــــ ملک قیصر کا ایک قاصد خط لے کر آنحضرتؐ کی خدمت میں آیا۔ حضرتؐ نے خط لے کر پوچھا کہ اس کا تعلق کس قوم سے ہے لوگوں نے عرض کی تنوخ سے فرمایا۔ اے شخص کیا دین ابراہیمی قبول کرنا چاہتا ہے اس نے کہا میں ایک بادشاہ کا نمائندہ ہوں۔ جب تک واپس نہ چلا جاؤں اس وقت تک دین کے تبدیل کرنے کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔ حضرتؐ نے اصحاب کو دیکھا اور ایک تبسم آمیز لہجے میں فرمایا: انک لا تھدی ؎۶

؎۱ اعیان الشیعہ ج ۳۹ ص ۱۵۹، الحجۃ ص ۲۵ (الحجۃ نے غلطی سے روز حنین لکھ دیا ہے صحیح روزِ احد ہے۔

؎۲ الحجۃ ص ۳۰، اعیان الشیعہ ج ۳۹ ص ۱۵۹ ؎۳ شیخ الابطح ص ۶۹

؎۴ کشاف ج ۲ ص ۴۷، اسباب النزول ص ۱۶۹، مجمع البیان ج ۲۰ ص ۳۰۹، تفسیر ابن کثیر ج ۳ ص ۳۹۵، تفسیر بیضاوی ج ۴ ص ۹

؎۵ شیخ الابطح ص ۶۹ ؎۶ تفسیر ابن کثیر ج ۳ ص ۳۹۵

یہ چار اقوال ہیں جو آیت کے نزول کے بارے میں نقل کئے گئے ہیں در اصل قانون کی بناء پر آیت کے نزول میں تکرار نہیں ہو سکتی۔ لہٰذا سوال یہ پیدا ہو جاتا ہے کہ حضرت ابو طالبؑ کا ذکر خیر کہاں سے آگیا۔ کیا یہ بھی کاذبین اور آخرت فراموش افراد کی ذہنی کاوشوں کا نتیجہ ہے؟

(۴)

ہم اگر یہ تسلیم بھی کرلیں کہ یہ آیت مبارکہ حضرت ابو طالبؑ ہی کی شان میں نازل ہوئی ہے تو یہ بھی ان کے اسلام کا اعتراف کرنے والوں کے ہاتھ میں ایک مضبوط حربہ ہوگا۔ جس کی تردید و تشکیک غیر ممکن ہوگی۔ توضیح مطلب یہ ہے۔

ا — حضرت ابو طالبؑ سے آیت کے متعلق ہونے کا مطلب یہ ہے کہ رسول اکرمؐ انھیں دوست رکھتے تھے۔ جب ہی تو آیت نے بھی کہا کہ تم جس کو دوست رکھتے ہو اُسے ہدایت نہیں کر سکتے۔ اور یہ کھلی ہوئی بات ہے کہ رسول اکرمؐ کا محبوب بن جانا ایمان کی واضح ترین دلیل ہے وہ کسی غیر مومن سے محبت نہیں کر سکتے۔

ب — اس آیت کا مطلب یہ بھی ہوگا کہ حضرت ابو طالبؑ کا ایمان صرف رسولؐ کی دعوت کی بنا پر نہیں ہے بلکہ اس میں خدا کی مشیت بھی شامل ہے اور کیا کہنا اس بندۂ پروردگار کا جس کے اسلام کی فکر خود پروردگار کو ہو اور جس کے اسلام کے لئے حضرت رسولؐ کی دعوت کو ناکافی خیال کیا گیا ہو۔

(۵)

کیا ان تمام بیانات کے بعد یہ دریدہ دہنی اور نافہمی نہ ہوگی کہ فاضل زجاج نہایت آسانی کے ساتھ یہ اعلان کردے کہ یہ آیت باجماع مسلمین ابو طالبؑ کے بارے میں نازل ہوئی ہے[۱] سوال یہ ہے کہ عالم وہم و خیال کے علاوہ یہ اجماع کہاں ہوا ہے؟ اس اجماع کی دلیل اور اس کا ثبوت کیا ہے۔ زجاج کو اس جراءت و جسارت کے انجام کا تصوّر کیوں پیدا نہیں ہوا۔! آخر اس شخص نے ائمۂ اطہارؑ، صحابۂ کبار اور اعلام اخیار کے تمام اقوال کو نظر انداز کر کے انھیں دائرہ اسلام سے کیونکر خارج کر دیا۔ کیا ابو طالبؑ کے اسلام کا اعتراف کر کے اسلام کی یہ تمام ہستیاں اس کے دائرہ سے خارج ہو گئیں۔ یا ان کی جدائی کے باوجود اجماع قائم ہو گیا۔؟

---

[۱] کشاف ج ۳ ص ۳۲

عجیب و غریب بات ہے کہ زجاج نے اپنے اجماع کی سند میں صرف ایک حدیث پیش کی ہے اور اس کی اسناد بھی حذف کر دیئے ہیں۔ شاید اسے اس امر کا خیال رہا ہو کہ اگر رواۃ کا اظہار ہو گیا تو صحیح حیثیت طشت ازبام ہو جائے گی اور اجماع کا بھرم کھل جائے گا۔ لیکن ہمارا خیال ہے کہ اس حدیث کا ماخذ بھی سابق ہی کی حدیثیں ہیں۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہو سکتا ہے کہ اس میں زجاج کی بلند پروازی بھی شامل ہو گئی ہو حدیث یہ ہے کہ حضرت ابو طالبؑ نے رسول اکرمؐ سے کہا۔ "بھتیجے میں جانتا ہوں کہ تم سچے ہو۔ لیکن برا معلوم ہوتا ہے کہ لوگ یہ کہیں کہ موت کے خوف سے حواس بجا نہ تھے۔ بہر حال میں اپنے بزرگ عبد المطلب ہاشم اور عبد مناف کے دین پر مروں گا۔"[۱]

زجاج کے بعد قرطبی نے جب یہ دیکھا کہ اجماع مسلمین کا دعویٰ ضرورت سے زیادہ بڑا ہو گیا ہے۔ تو فوراً اس کی اصلاح کی اور فرمایا کہ اکثر مفسرین کا اجماع ہے کہ آیت ابو طالبؑ کی شان میں نازل ہوئی ہے[۲] حالانکہ یہ دعویٰ بھی زجاج کے کلام کی طرح بے دلیل اور بے مغز ہے۔

اس سے عجیب تر یہ ہے کہ ابن کثیر نے بھی آیت کے ذیل میں یہ ارشاد کیا ہے کہ بخاری و مسلم سے ثابت ہو چکا ہے کہ یہ آیت عم رسولؐ ابو طالبؑ کی شان میں نازل ہوئی ہے وہ رسول کریمؐ کی حفاظت و رعایت و نصرت کرتے تھے ان سے بے حد محبت کرتے تھے لیکن طبعی محبت نہ کہ دینی محبت[۳] اس کے بعد سابقہ روایت سے استدلال بھی کیا ہے۔

سوال یہ ہے کہ اس جسارت اور دریدہ دہنی کا مدرک و ماخذ کیا ہے؟ کیا اس قسم کے اہم فیصلے بھی تجارتی حدیثوں کے بل بوتے پر کئے جا سکتے ہیں۔؟

اس سے زیادہ لطف کی بات یہ ہے کہ ترمذی نے اس سلسلے کی ایک حدیث کے بارے میں یہ فیصلہ کیا ہے کہ حدیث حسن ہے لیکن غریب ہے اسے صرف یزید بن کیسان نے نقل کیا ہے[۴] ہم اس سلسلے کی تمام روایتوں کے شیرازے بکھیر چکے ہیں اور حقیقت بے نقاب ہو چکی ہے اب ہمیں اس کلمہ سے لطف آتا ہے کہ روایت غریب ہے کسی کو اس کی خبر نہیں ہے ابن کیسان تنہا اس

---

[۱] کشاف ج ۳ ص ۳۲۲

[۲] الغدیر ج ۸ ص ۲۲، تفسیر کثیر ج ۳ ص ۲۹۶، تفسیر قرطبی ج ۱۳ ص ۲۹۶۔

[۳] تفسیر کثیر ج ۳ ص ۲۹۴

[۴] ایضاً

کا راوی ہے لیکن پھر بھی حسن اور قابلِ قبول ہے !

ہمارا مقصد ابنِ کثیر سے محاسبہ کرنا نہیں ہے ورنہ ہم ان سے پوچھتے کہ آخر ابوطالبؑ کی اس بے پناہ محبت کو غیر دینی محبت پر محمول کرنے کا منشا کیا تھا۔ آخر یہ محبت دینی کیوں نہیں تھی؟ جب کہ بے شمار ادلّہ و براہین سے روز روشن کی طرح واضح ہو چکا ہے کہ ابوطالبؑ کی محبت محمدؐ رسول اللہ سے تھی نہ کہ محمد بن عبداللہ سے۔

اس قسم کے خرافات میں جن کو کبھی تاریخ اور کبھی حدیث سے تعبیر کیا جاتا ہے ایک یہ مقولہ بھی ہے کہ ابوسعید بن رافع نے ابنِ عمر سے آیت انک لا تھدی کے بارے میں سوال کیا کہ کیا یہ آیت ابوجہل وابوطالبؑ کے بارے میں ہے؟ تو انھوں نے فرمایا "ہاں" [۲]

ہمیں اس روایت کی سند نہیں مل سکی ہے لیکن اس کے باوجود ہماری نظر میں اس کی کوئی قیمت نہیں ہے، اس لئے کہ ابن عمر کی یہ ذاتی رائے ہے، اسے حدیث سے کوئی تعلق نہیں ہے

سوال صرف یہ رہ جاتا ہے کہ وہ کونسی عقل ہے جو ابوجہل اور ابوطالبؑ کو ایک درجہ میں رکھنا چاہتی ہے اور دونوں پر ایک ہی قسم کا اطلاق پسند کرتی ہے ؟!

ابوطالبؑ وہ جس کی زندگی حمایت و رعایت اور کفالت و حفاظتِ رسولؐ میں گزر گئی اور ابوجہل وہ جس کو ان باتوں سے کوئی ربط ہی نہیں تھا [۱] اس کے بعد بھی دونوں کا درجہ ایک؟ اگر یہ ممکن ہے تو ابوجہل کا ادنیٰ ہونا بھی ممکن ہے۔ اس لئے کہ اس قسم کے لوگوں سے کچھ بعید نہیں ہے۔

افسوس صد افسوس اقدار گر گئے۔ معیار و میزان کھوٹے ہو گئے۔ عداوت و محبت کا فرق نہ رہا۔ نصیرِ اسلام اور دشمنِ رسولؐ سب ایک کر دیئے گئے۔

ابتدائے کتاب میں ہم اپنے والد ماجد کا یہ قول اشارۃً نقل کر آئے ہیں کہ حضرت ابوطالبؑ پر ان تمام تہمتوں اور بہتانوں کا ہدف خود ان کی ذات نہیں ہے بلکہ بالواسطہ اس کا تعلق حضرت امیر المومنین علی ابن ابی طالبؑ سے ہے اور حضرت ابوطالبؑ کا قصور صرف یہ ہے کہ آپ حضرت علیؑ کے باپ ہیں۔

اب ہم چاہتے ہیں کہ مرحوم کے اس قول کی تائید تاریخ سے بھی پیش کر دیں۔

---

[۱] تفسیر کثیر ج ۳ ص ۳۹۴

[۲] اسباب النزول ص ۱۲۸ — ۱۲۹

گزشتہ صفحات میں ہم نے نقل کیا ہے کہ معاویہ نے سمرہ بن جندب سے ہم لاکھ پر صرف اتنی سی بات کے لئے معاملہ کیا تھا کہ وہ ایک آیت کو حضرت علیؑ کی مذمت میں اور ایک آیت کو ابن ملجم کی مدح میں اتار دے۔ بعینہ یہی بات حضرت ابوطالبؑ کے لئے نظر آتی ہے جیسا کہ بعض افراد کے اس قول سے ظاہر ہوتا ہے کہ آیت انک لا تھدی حضرت ابوطالبؑ کے بارے میں ہے کہ رسولِ اکرمؐ ان کی ہدایت کے خواہاں تھے اور وہ نہ ہو سکی اور آیت ——

یا عباد الذین اسرفوا علی انفسھم لا تقنطوا من رحمة اللہ

(اے میرے گنہگار بندو ! میری رحمت سے مایوس نہ ہو !)

وحشی قاتل حضرت حمزہؑ کی شان میں نازل ہوئی ہے رسول اکرمؐ اس کے اسلام کو نہ چاہتے تھے لیکن اللہ نے اسے ہدایت کر دی [۱]

لطف یہ ہے کہ اس رائے کی نسبت بھی ابن عباس ہی کی طرف دی گئی ہے تا کہ بات کا کچھ وزن بڑھ جائے۔ اس بیچارے کو کیا خبر تھی کہ ابن عباس کے دیگر اقوال سے تعارض و تضاد اس بات کی قیمت کو ختم کر دے گا۔

علاوہ اس کے اس شخص نے اپنے کلام کے تمام پہلوؤں پر بھی غور نہیں کیا کہ سب سے پہلے رسولؐ اور خدا کی رائے میں اختلاف پیدا کرایا کہ خداوندِ کریم ابوطالبؑ کے ایمان کا مخالف تھا اور رسولؐ موافق! آخر کار خدا کا ارادہ غالب آگیا اور ابوطالبؑ مسلمان نہ ہو سکے خدا جانے اللہ اور ابوطالبؑ میں کونسی مخالفت چل رہی تھی جس کا آخری وقت میں انتقام لیا گیا۔ کیا اس عداوت کا منشاء اور سبب وہ خدمات تھے جو زندگی بھر دینِ اسلام کے لئے انجام دیئے گئے ؟ یا وہ حمایت و حفاظت تھی جس میں وہ آخر دم تک سرشار رہے۔ استغفر اللہ !

بعینہ یہی معاملہ وحشی کے ایمان میں بھی پیش آیا کہ اس نے رسولِ اکرمؐ کے چچا کو قتل کر دیا تو گویا ان کے دل میں کینہ بیٹھ گیا اور انھوں نے چاہا کہ یہ کسی طرح ایمان نہ لا سکے لیکن اللہ کو اپنے بندے کی حالت پر رحم آگیا اور اس نے نہ رسولؐ کے جذبات کا لحاظ کیا اور نہ حمزہؑ کے اس خونِ ناحق کا جو اسی کی راہ میں بہا تھا اور فوراً وحشی پر رحمت نازل کر دی اور اللہ کا ارادہ غالب آگیا۔ کاش یہ لوگ اتنا اور کہہ دیتے کہ وحشی کے ایمان میں کمال بھی پیدا ہو گیا

---

[۱] مجمع البیان ج ۲ ص ۲۰۷ — ۲۰۸

اس لئے کہ وہ آخر لمحہ حیات تک شراب نہایت ہی پابندی سے استعمال کرتا رہا۔ اور کسی وقت بھی اپنے اس فریضہ سے غافل نہیں ہوا۔ [1]

میری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ آیت وحشی کی شان میں کیسے نازل ہو گئی جب کہ آیت میں تمام مسلمانوں سے خطاب ہے۔ اور آیت مکی ہے اور وحشی کی وحشیت کا اظہار مدینہ سے شروع ہوا [2]

حقیقت یہ ہے کہ مسؤلیت اور مواخذہ کا بارِ گراں ہر اس شخص کی گردن پر رکھا جائے گا جو زبان سے بات نکالتے ہوئے مسؤلیت کا لحاظ نہ کرے گا اور تمام قدر و مفاہیم کو پامال کر کے صرف خواہش پرستی اور شکم پروری کی فکر کرے گا۔

میراثِ ابوطالبؑ

بعض تہمتوں میں سے جو شیخ بطحا حضرت ابوطالبؑ کے خلاف تراشی گئی ہیں ایک یہ بھی ہے کہ علیؑ اور جعفر نے ان کی میراث لینے سے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ ہم مسلمان ہیں وہ کافر تھے [3]

ہمارے سامنے اس تہمت کی سند موجود نہیں ہے ورنہ ہم اس رکیک روایت کی حقیقت بھی بے نقاب کرتے۔ لیکن اتنا تو بہرحال کہہ سکتے ہیں کہ اس روایت کا وضع کرنے والا اسلامی قانون توارث سے بھی سراسر ناواقف تھا۔

ہم اس حدیث کو صحیح مانتے ہیں کہ۔ "لا توارث بین ملتین" دو مذہبوں کے درمیان میراث نہیں ہے" لیکن اس کا مطلب یہ ہے کہ کافر مسلم کا وارث نہیں ہوتا نہ کہ مسلم کافر کا وارث نہیں ہوتا۔ مسلم کا مرتبہ بہرحال بلند ہے اس کی وراثت میں کسی شک و شبہ کی گنجائش ہے۔

توارث کے معنی یہ ہیں کہ دو آدمیوں میں دونوں ایک دوسرے کے وارث ہوں۔ لہٰذا روایت کا مطلب صرف یہ ہوگا کہ وراثت طرفین سے نہیں ہوتی ایک طرف سے وراثت ثابت ہو جائے تو اس میں مضائقہ نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام نے کافر کو یہ حق نہیں دیا کہ وہ

---

[1] استیعاب ج ۳ ص ۶۱

[2] مجمع البیان ج ۲۳ ص ۱۶۴

[3] السیرۃ الحلبیہ ج ۱ ص ۴۷، الحجۃ ص ۳۲، شیخ الابطح ص ۷۸۔

وہ مسلمان عورت سے عقد کرے جبکہ مسلمان کو یہ اختیار دیا ہے کہ وہ اہلِ کتاب عورت سے عقد دائمی کر سکے جیسا کہ بعض علماء کا قول ہے، یا عقد منقطع کر سکے جیسا کہ شیعہ علماء کا اجماع ہے۔

مقصد یہ ہے کہ اس روایت کو تسلیم بھی کر لیا جائے تو اس سے حضرت ابوطالبؑ کا کافر ہونا ثابت نہیں ہوتا۔ اس لئے کہ میراث پانے والے وہ نہ تھے بلکہ ان کے مسلم الثبوت مسلمان وارث تھے

حدیثِ ضحضاح

سابق میں اس حدیث کی طرف اشارہ کیا جا چکا ہے جس میں حضرت ابوطالبؑ کو جہنم تک پہنچا دیا گیا ہے۔ اب اس کے صحیح الفاظ نقل کئے جاتے ہیں تاکہ اس کا مفصل تجزیہ کیا جا سکے۔

۱ــــ عبداللہ ابن عمر القواریری، محمد بن ابوبکر المقدمی، محمد بن عبدالملک اموی نے ابوعوانہ، عبدالملک بن عمر، عبداللہ بن حارث بن نوفل کے واسطے سے ابن عباس سے نقل کیا ہے کہ میں نے سوال کیا۔ یا رسول اللہؐ کیا آپ کی حمایت ابوطالبؑ کے کچھ کام آئی۔! رسولِ اکرمؐ نے فرمایا، ہاں اس وقت وہ ضحضاح میں ہیں۔ اگر میں نہ ہوتا تو وہ درکِ اسفل میں ہوتے [1]

۲ــــ ابن ابی عمر نے سفیان، عبدالملک بن عمیر، عبداللہ بن حارث کے واسطے سے ابن عباس سے نقل کیا ہے کہ میں نے رسولِ اکرمؐ سے سوال کیا کہ "کیا آپ کی حفاظت و حمایت ابوطالب کے کچھ کام آئی۔!" فرمایا! "ہاں وہ بڑی شدت میں تھے، اب ضحضاح میں رکھ دیئے گئے ہیں [2]

۳-۴ــــ محمد بن حاتم نے یحییٰ بن سعید سفیان کے واسطے سے یہی روایت نقل کی ہے [3] اور اسی طرح ابوبکر ابن ابی شیبہ نے وکیع کے واسطے سے سفیان سے یہ روایت نقل کی ہے [4]

۵ــــ قتیبہ بن سعید نے لیث، ابن الہاد، عبد بن خباب کے واسطے سے ابوسعید خدری سے نقل کیا ہے کہ رسول اکرمؐ کے سامنے ابوطالبؑ کا ذکر کیا گیا تو آپ نے فرمایا شاید قیامت کے دن میری شفاعت ان کے کام آ جائے اور ان کو ضحضاح میں رکھ دیا جائے اس طرح کہ آگ پیروں تک ہو اور دماغ کا گودا پک رہا ہو [5]

---

[1] مسلم ج ۱ ص ۱۳۴ باب شفاعت النبی [2] ایضاً

[3] مسلم ج ۱ ص ۱۳۴ [4] مسلم ج ۱ ص ۱۳۵

[5] مسلم ج ۱ ص ۱۳۵

۶ — ابوبکر بن ابی شیبہ نے عفان، حماد بن سلمہ، ثابت، ابی عثمان، نہدی کے واسطے سے ابن عباس سے نقل کیا ہے کہ آنحضرتؐ نے فرمایا کہ سب سے مختصر عذاب جہنم میں ابوطالبؑ پر ہے آگ کی دو جوتیاں پہنے ہیں اور بھیجا ابل رہا ہے [1]

۷ — مسدد نے یحییٰ، سفیان، عبدالملک، عبداللہ بن حرث کے واسطے سے عباس سے نقل کیا ہے کہ انھوں نے حضرتؐ سے سوال کیا کہ آپ کی حمایت ابوطالبؑ کے کچھ کام آئی؟ تو فرمایا کہ ہاں ابھی وہ ضحضاح میں ہیں اگر میں نہ ہوتا تو درکِ اسفل میں ہوتے [2]

۸-۹ — عبداللہ بن یوسف نے لیث سے مثل حدیث پنجم اور ابراہیم بن حمزہ [3] نے بھی ابن ابی حازم دراوردی، یزید کے واسطے سے مثل حدیثِ خامس روایت کی ہے [4]

رُواۃ کی حیثیتوں پر ایک نظر

تہمتوں کی فہرست نقل کرنے کے بعد ہمارا فریضہ ہے کہ ہم ان کے رجال پر بھی ایک نظر ڈال لیں تاکہ ان روایتوں کی صحیح قدر و قیمت معلوم ہو سکے۔

(۱)

ا — عبداللہ قواریری کا کوئی ذکر میزان الاعتدال میں نہیں ہے، البتہ غدیر میں اس کی ایک روایت نقل ہوئی ہے اور اس پر اس طرح تبصرہ ہوا ہے کہ اس سند میں عبید اللہ قواریری ہے جس سے بخاری نے صرف پانچ حدیثیں نقل کی ہیں اور مسلم نے چالیس۔ حالانکہ احمد بن یحییٰ نے اس سے ایک لاکھ حدیثیں سنی تھیں۔ اب سوال یہ ہے کہ جب بخاری اور مسلم دونوں ہی نے ان تمام روایتوں کو ترک کر دیا ہے۔ تو اس کی حدیثوں کی کیا قیمت رہ جاتی ہے جب کہ یہ فرض کر لینا ہمارے لئے مشکل ہے کہ بخاری و مسلم کو ان تمام روایتوں کی خبر نہ ہوئی ہو [5]

---

[1] مسلم ج ا ص ۱۳۵

[2] [3] [4] بخاری ج ۲ ص ۲۰۱

[5] الغدیر ج ۹ ص ۲۹۵، تہذیب التہذیب ج ۷ ص ۴۱

ب — محمد بن ابی بکر المقدمی کا بھی کوئی تذکرہ نہیں ہے۔ صاحبِ غدیر نے اسے ضعیف قرار دیا ہے [1] اور بغیر قید مقدمی کے ایک مجہول شخص کا ذکر رجال میں نظر آتا ہے [2]

ج — محمد بن عبدالملک الاموی۔ اس شخص کے لئے اموی ہونا ہی اس کی حیثیت کے لئے کافی ہے اب اگر یہ مروان بن حکم ہے تو کیا کہنا۔ دونوں ہی رسول اکرمؐ کی دعا کے مصداق — اور مروان تو بقول حضرت عائشہ پیدائش سے پہلے ہی ملعون ہو چکا تھا ویسے اس محمد کے بارے میں ابوداؤد کا خیال ہے کہ اس کی عقل محکم نہ تھی [3]

د — فی الحال ابوعوانہ کو صیغہ راز ہی میں رہنے دیجئے۔

ہ — عبدالملک بن عمر۔ شعبی کے بعد کوفہ کا حاکم بن گیا۔ اتنا زندہ رہا کہ بقول ذہبی اس کا حافظہ خراب ہو گیا۔ اور بقول ابوحاتم حافظہ بالکل بدل گیا۔ بقول امام احمد غلطیاں بہت کرتا تھا۔ ابن فراش کے نزدیک شعبہ اسے پسند نہ کرتا تھا۔ امام احمد ضعیف سمجھتے تھے [4] ابن حبان کی نظر میں اوٹ پٹانگ ہانکتا تھا [5]

اس قاضی کے فضائل میں یہ نقل کیا گیا ہے کہ جب ابنِ زیاد نے عبید اللہ بن بقر کو پشت بام سے پھینک دیا تو اس کا گزر ان کے پاس سے ہوا۔ اس نے بڑی رحم دلی کے ساتھ اپنے چاقو سے ان کا خاتمہ کر دیا [6] ماشاء اللہ!

اس کی خواہش پرستی اور شہوت رانی کی اس درجہ شہرت تھی کہ ایک مرتبہ کلثم بن سریع اپنے گھر والوں کے خلاف مقدمہ لے کر آئی۔ اس نے فوراً اس کے حق میں فیصلہ دے دیا۔ لوگوں نے فیصلہ کے راز کو تاڑ لیا اور ہذیل بن عبداللہ اشجعی نے اشعار نظم کرنا شروع کر دیئے جن میں اس کی عادلانہ تفاوت کا صحیح تجزیہ کیا گیا تھا [7]

---

[1] میزان الاعتدال ج ۳ ص ۹۶

[2] المیزان ج ۳ ص ۹۶

[3] المیزان ج ۲ ص ۱۵۱

[4] دلائل الصدق ج ۱ ص ۴۵

[5] اعیان الشیعہ ج ۱ ص ۲۲۲

[6]، [7] اعیان الشیعہ ج ۱ ص ۲۲۲

بلکہ بعض کا تو کہنا ہے ابن ابی العوجاء نے ان میں دسیسہ کاریاں کردی تھیں [۱] بہرحال کوئی اس کی کس قدر تعریف کیوں نہ کرے ہمارے پاس اس کی وہ حدیثیں بھی ہیں جن میں تجسیم باری تعالیٰ کا افسانہ بڑی آزادی سے نقل ہوا ہے تو کیا اس کے بعد بھی ہم اسے معتبر مان سکتے ہیں ۔!

اسی حماد نے ثابت کے واسطے سے انس سے یہ روایت کی ہے کہ رسولِ اکرمؐ نے تجلی طور کی تفسیر اللہ کے چٹکیاں بجانے سے کی ہے چنانچہ حماد نے ثابت سے سوال کیا تو اس نے کہا کہ جب رسول اکرمؐ نے کہا ہے تو میں کیوں نہ بیان کروں [۲]۔ ترمذی نے بھی اس روایت کی تصحیح کردی ہے ۔ استغفر اللہ !

حماد ہی کا قول ہے کہ اللہ ایک حسین امرد لڑکے کی شکل کا ہے [۳]۔ اس کے کپڑے بھی سبزی مائل چمکدار ہیں [۴] ـــــــ یہی وہ روایتیں ہیں جن سے متاثر ہوکر ذہبی نے تمام تعریفوں کو بھلا کر کہہ دیا ہے کہ ایسے مہملات اس کے پاس بہت زیادہ ہیں ۔ اور شاید اب اس نے نیا خواب دیکھا ہو [۵]۔ ابن عدی نے اس کے منفرد روایات کا تذکرہ کیا ہے اور بخاری نے بالکل اعراض کرلیا ہے [۶]

د ـــــ اس کے متعلق ہمیں تفصیلاً علم نہیں ہے اس لئے کہ راویوں میں اس نام کا ایک ڈھیر ہے جس میں کوئی کاذب' کوئی ضعیف اور کوئی منکر الحدیث ہے ۔ خدا جانے موصوف کن صفات سے متصف تھے ؟ شاید ثابت ابن ابی ثابت یعنی حبیب کے بھائی ہوں' جن کے متعلق ذہبی کی رائے ہے کہ یہ ایک مجہول شخص ہے [۷]۔ لیکن اس کے باوجود حماد نے اس سے روایتیں کی ہیں ۔ جیسا کہ ابھی تجسیم کی روایت میں دیکھا جا چکا ہے اور ظاہر ہے کہ جب ایسے اشخاص حضرتِ احادیث کو نہیں بخش سکتے تو حضرت ابوطالبؑ کس شمار میں ہیں ؟

ھ ـــــ ابوعثمان الہندی ۔ خدا جانے کون اور کیا ہے [۸] !

(۷)

حدیث ہفتم

ا ـــــ مسدد ۔ معلوم نہیں کہ یہ کون ہے ؟ البتہ اس نام کا ایک شخص ذہبی نے نقل کیا ہے

---

[۱] المیزان ج ۱ ص ۲۷۷
[۲] المیزان جلد ۱ ص ۴۰۸
[۳] المیزان ج ۳ ص ۲۷۸
[۴] المیزان جلد ۳ ص ۲۲۸
[۵] ص ۲۲۸
[۶] " " ج ۱ ص ۲۷۹
[۷] المیزان جلد ۱ ص ۱۶۸ - ۱۷۲
[۸] المیزان ج ۳ ص ۳۷۷

جس میں تساہلی بہت تھی [۱]

ب ـــــ بقیہ سند میں یحییٰ' سفیان اور عبدالملک وغیرہ ہیں جن کی تحلیل کی جاسکتی ہے ۔

(۸)

حدیث ہشتم :

ا ـــــ عبداللہ بن یوسفؒ اگر یہ تنیسی ہے' جیساکہ صاحب شیخ الابطح کا خیال ہے [۲] تو ابن عدی کے نزدیک ضعیف ہے [۳] اور اگر عبداللہ بن سلیمان بن یوسف ہے جو لیث سے روایت نقل کرتا ہے جیسا کہ میرا ذاتی خیال ہے تو یہ غیر معتبر [۴] اور مشکوک ہے [۵] اس کے فضائل کی حدیثوں کا ذہبی نے انکار کردیا ہے [۶]

ب ـــــ لیث کے بعد سے آخر تک کے روایتوں پر تبصرہ کیا جاچکا ہے ۔

(۹)

حدیث نہم

ا ـــــ ابراہیم بن حمزہ ۔ اسے پردۂ خفا ہی میں رہنے دیجئے ۔

ب ـــــ ابن ابی حازم ـــــ اس کا نام عبدالعزیز تھا' اپنے باپ سے روایت کرتا تھا اس کے علاوہ سلمان بن بلال کی کتاب سے بھی نقل کرتا تھا لیکن لاپروائی کے ساتھ ۔

فلاس کا قول ہے کہ اسے طلبِ حدیث میں شہرت نہ تھی اپنے باپ کے علاوہ ہر حدیث میں ضعیف ہے ابن المدینی کا قول ہے کہ حاتم بن اسمٰعیل کو باپ سے نقل شدہ حدیثوں پر اعتراض تھا بلکہ ان کا مقولہ تھا کہ میں نے اسے منع بھی کیا ہے لیکن اس نے قبول نہیں کیا [۷]

ج ـــــ الدراوردی ـــــ یہ عبدالعزیز بن محمد [۸] ہے جس کے بارے میں امام احمد کا خیال ہے کہ اس کا حافظہ خراب تھا ۔ یہ ایک لاشئ محض انسان تھا ۔ ہمیشہ خرافات نقل کرتا تھا ۔

ابوحاتم کا خیال ہے کہ یہ ایک قابلِ استدلال شخص ہے اور ابوزرعہ کی نظر میں بدحافظہ ہے [۹]

---

[۱] المیزان ج ۳ ص ۱۶۲
[۲] شیخ الابطح ص ۴۷
[۳] المیزان ج ۲ ص ۸۹
[۴] المیزان جلد ۲ ص ۸۹
[۵، ۶] المیزان ج ۲ ص ۴۲
[۷] المیزان ج ۲ ص ۱۳۵
[۸] شیخ الابطح ص ۷۵
[۹] شیخ الابطح ص ۱۳۷—۱۳۹

بلکہ ان میں ایک کلمۂ لعل بھی ہے جس میں حرف اُمید کے معنی پائے جاتے ہیں۔ جس کا مفہوم یہ ہے کہ رسولؐ کو اپنی شفاعت پر بھی اعتماد نہیں ہے معاذ اللہ!

تیسری قسم وہ ہے جس میں ابو طالبؑ کو تمام اہل جہنم سے خفیف العذاب قرار دیا گیا ہے اس میں شفاعت کا کوئی ذکر ہی نہیں ہے جس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ شاید استحقاق ہی مختصر عذاب کا ہو — لیکن سوال یہ رہ جاتا ہے کہ اس اختصار کی وجہ کیا ہے؟ اور اسے اختصار کیونکر کہیں گے کہ ایک انسان کو آگ کی جوتیاں پہنادی جائیں اور وہ بھی اس طرح کہ پیر کی جوتیوں سے سر کا بھیجہ بہہ نکلے۔ اعوذ باللہ!

علاوہ اس کے کہ یہ روایت اس توجیہ کے بھی خلاف ہے جو بعض علماء نے کی ہے کہ چونکہ ابو طالبؑ باطل پر ثابت قدم تھے اس لئے عذاب بھی قدموں ہی پر ہو رہا ہے جیسا کہ قرآن کا قانون ہے کہ عذاب گناہ سے مشابہ ہوتا ہے[1] اس لئے اگر عذاب قدموں پر ہے تو بھیجہ کیوں بہتا ہے؟ اور پھر بھیجہ بھی کوئی چشمہ ہے کہ جس قدر بہتا جاتا ہے اسی قدر بڑھتا جا رہا ہے۔

(۲)

میری سمجھ میں نہیں آتا کہ رسولِ اکرمؐ ایک ایسے انسان کی کس طرح شفاعت کر سکتے ہیں جس کے قلب میں اسلام کا گزر ہی نہ ہوا ہو جب کہ قرآن مجید کی متعدد آیتوں نے آپ کو ایسے افراد سے محبت، مودت، موالات اور تعلقات سے منع کیا ہے چہ جائیکہ شفاعت جس کا درجہ ان سب سے مافوق ہے پھر حضرت کو اس شفاعت کی ضرورت کیا تھی؟ اگر یہ اس حمایت و حفاظت کا صلہ ہے جو ابو طالبؑ نے انجام دی تھی اور رسالت کا بوجھ اٹھانے میں ہاتھ بٹایا تھا تو ابو طالبؑ ہی کو اس ہمدردی کی کیا پڑی تھی۔؟ اور اگر انھوں نے سلسلہ تبلیغ میں کوئی احسان کیا تھا تو حضرتؐ نے اسے قبول کیسے کر لیا جب کہ آپؐ کی دعا یہ تھی کہ خدایا مجھ پر کسی کافر و مشرک کا احسان نہ ہونے پائے۔

پھر سوال یہ ہے کہ آیا رسولؐ کی شفاعت کا نتیجہ ہی کیا ہے جب کہ قرآن کی آیت نے صاف صاف اعلان کر دیا ہے کہ کافروں پر رحمتِ الٰہی نہیں ہو سکتی۔ ان کے عذاب میں تخفیف غیر ممکن ہے ان کے لئے شفاعت کی امید نہیں کی جا سکتی۔

۱ — خالدین فیہا لا یخفف عنہم العذاب ولا ہم ینظرون۔

"اہل جہنم نہ باہر نکل سکیں گے اور نہ ان کے عذاب میں کمی ہوگی"

---

[1] السیرۃ النبویہ ج ۱ ص ۸۹

د — یزید۔ اس کا علم نہیں کہ یہ کون ہے؟ اگر ابن کیسان ہے تو اس کی حیثیت عرفی ظاہر کی جا چکی ہے۔

اصل حدیث پر ایک نظر

رواۃ کے سلسلے میں ایک سرسری مطالعہ اس بات پر مجبور کر رہا ہے کہ ہم ان تمام روایتوں کو ردی کی ٹوکری میں ڈال دیں کہ ان کے راوی مجہول، کاذب، ضعیف، جعل ساز اور بے ایمانوں کے علاوہ کچھ نہیں ہیں اور قاعدہ یہ ہے کہ ایک راوی کی خرابی روایت کو درجۂ اعتبار سے ساقط کر دیتی ہے۔ چہ جائیکہ شروع سے آخر تک سب ایک ہی قسم کے راوی ہوں۔ لیکن بایں ہمہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ایک طائرانہ نظر اصل حدیث کی حیثیت پر بھی ڈال لی جائے۔

(۱)

جس وقت ہم حدیثِ ضحضاح کی عبارت کا جائزہ لیتے ہیں تو ہمیں ان مختلف حدیثوں میں ایک عجیب و غریب قسم کا تضاد نظر آتا ہے۔

بعض روایات کا مفہوم یہ ہے کہ "ابو طالب ضحضاح میں ہیں اور اگر رسولِ اکرمؐ کی سفارش نہ ہوتی تو درکِ اسفل میں ہوتے اس عبارت سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ رسولِ اکرمؐ کی سفارش ہو چکی اور ابو طالب اس سے مستفیض ہو چکے جیسا کہ حدیثِ دوم میں صاف صاف مذکور ہے کہ میں نے ان کو بڑی سختیوں میں پایا تو نکال کر ضحضاح تک پہنچا دیا۔

میری سمجھ میں نہیں آتا کہ رسول اکرمؐ کے اختیارات اتنے وسیع تھے کہ وہ ابو طالبؑ کو سختیوں سے نکال کر ضحضاح تک پہنچا دیں تو آپ نے اتنا کرم اور کیوں نہ کر دیا کہ انھیں جہنم ہی سے نکال لیتے مجھے تو اس وقت متنبی کا یہ شعر یاد آ رہا ہے

ولم ار فی عیوب الناس شیئاً
کنقص القادرین علی التمام

(لوگوں کا سب سے بڑا عیب یہ ہے کہ تکمیل پر قادر ہوں اور کام کو ناقص چھوڑ دیں)

پھر جب کہ رسول اکرمؐ انسانی اخلاق کے معلم اور بشری اقدار کے نمونۂ کامل تھے، کیا خدائی تعلیم کا اثر یہی ہے!

اس کے مقابلہ میں بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ شفاعت قیامت کے روز کام آئے گی

ب ـــ اولٰئك الذين اشتروا الحیٰوۃ الدنیا بالاٰخرۃ فلا یخفف عنھم العذاب ولاھم ینصرون

"آخرت کو دنیا سے بدلنے والوں کے عذاب میں تخفیف نہیں ہوگی۔"

ج ـــ وذروا الذین اتخذوا دینھم لعبًا ولھوًا و غرّتھم الحیٰوۃ الدنیا وذکربه ان تبسل نفس بما کسبت لیس لھا من دون اللہ ولی ولا شفیع وان تعدل کل عدل لا یؤخذ منھا اولٰئك الذین ابسلوا بما کسبوا لھم شراب من حمیم وعذاب الیم بما کانوا یکفرون۔

("دین کو بازیچہ بنانے والوں کا کوئی شفیع نہیں ہو سکتا۔ ان کے لئے دردناک عذاب ہے اس لئے کہ یہ کافر ہیں۔)

د ـــ واذا رای الذین ظلموا العذاب فلا یخفف عنھم ولاھم ینظرون

"جب ان کے سامنے عذاب آجائے گا تو پھر تخفیف غیر ممکن ہے"

ھ ـــ والذین کفروا لھم نار جھنم لا یقضی علیھم فیموتوا ولا یخفف عنھم من عذابھا کذالك نجزی کل کفور۔

"کافرین کے عذاب میں کسی طرح کی تخفیف ممکن نہیں ہے"

و ـــ وقال الذین فی النار لخزنة جھنم ادعوا ربکم یخفف عنا یومًا من العذاب قالوا الم تك تاتیکم رسلکم بالبینات قالوا بلیٰ قالوا فادعوا وما دعاء الکٰفرین الا فی ضلل۔

"اہلِ جہنم ہزار تخفیف کی دعائیں کریں لیکن سب بے کار ہیں۔"

ز ـــ فی جنات یتساءلون من المجرمین ما سلککم فی سقر قالوا لم نك من المصلین ولم نك نطعم المسکین وکنا نخوض مع الخائضین وکنا نکذب بیوم الدین حتیٰ اتانا الیقین فما تنفعھم شفاعة الشافعین۔

"روزِ جزا کا انکار کرنے والے اور بے نمازی وغیرہ کی شفاعت نہیں ہو سکتی۔"

ح ـــ وانذرھم یوم الازفة اذ القلوب لدی الحناجر کاظمین ما للظٰلمین من حمیم ولا شفیع یطاع

"ظالمین کی شفاعت نہیں ہو سکتی"

اس مفہوم کی بعض حدیثیں بھی پائی جاتی ہیں۔

ا ـــ اذا دخل اھل الجنة الجنة واھل النار النار یقوم موذن بینھم یا اھل النار لاموت ویا اھل الجنة لاموت خلود

"جنت و جہنم دونوں دائمی ہیں۔" [۱]

ب ـــ یقال لاھل الجنة خلود لاموت ولاھل النار یا اھل النار خلود لاموت

"اہلِ جنت و جہنم دونوں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔"

ان تمام احادیث و روایات سے صاف صاف واضح ہوتا ہے کہ کفار ہمیشہ جہنم میں رہیں گے ان کے عذاب میں تخفیف نہیں ہوگی۔ اس لئے کہ یہ لوگ شفاعت کے حدود سے خارج ہیں۔

(۳)

اس کے علاوہ کہ حدیث کے رواۃ ضعیف اور کاذب ہیں۔ ان کی عبارتوں میں تناقض و تعارض ہے۔ اس کا مفہوم صریح آیاتِ قرآنیہ سے متصادم ہے۔ خود یہ حدیث اس احتضار والی حدیث سے بھی متعارض ہے جسے سابق میں نقل کیا جا چکا ہے اور مزید لطف یہ کہ دونوں کے بعض راوی مشترک ہیں حیرت انگیز بات ہے کہ ابن عمر، محمد بن حاتم اور یحییٰ بن سعید وغیرہ نے یہاں تو شفاعت کی حدیث وضع کر دی ہے اور یہ بھول گئے ہیں کہ وقت احتضار کے لئے جو حدیث وضع کی تھی اس میں آنحضرتؐ نے کہا تھا "چچا کلمہ پڑھ لو تاکہ شفاعت کے امکانات پیدا ہو جائیں اور ابوطالبؑ نے نہیں پڑھا تھا" [۲] کسی نے سچ کہا ہے کہ دروغ گوئی کے لئے خاصے حافظے کی ضرورت ہوتی ہے۔

اگر یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ ابوطالبؑ نے وقت احتضار کلمہ پڑھ لیا تھا تو پھر یہ رسولؐ کا بخل ہوگا کہ ان کو قعرِ جہنم سے نکال کر ضحضاح میں ڈال دیں۔ بھلا یہ بھی کوئی کرم و شفاعت اور تخفیف ہے کہ پیر میں جوتیاں ہوں اور سر سے بھیجا اُبل رہا ہو۔ استغفر اللہ! اس کے علاوہ بخاری و مسلم میں ایسی روایتیں بھی ہیں جن میں کلمہ گو کو جنتی بتایا گیا ہے تو بیچارے ابوطالبؑ ہی کا کیا قصور تھا کہ ان کا کلمہ ضحضاح نم کا ہو کر رہ گیا۔

ملاحظہ ہوں چند حدیثیں:۔

---

[۱] بخاری ج ۴ ص ۸۴

[۲] الغدیر ج ۴ ص ۷۰، ۳۷۰ ج ۸ ص ۲۴ بحوالہ کتب مختلف

ا ــ من مات وهو يعلم انه لا اله الا الله دخل الجنة

"جو خدا کو واحد جان کر مر جائے وہ جنتی ہے" [۱]

ب ــ لا يدخل النار احد يقول لا اله الا الله

"کلمہ گو جہنم میں نہیں جاتا" [۲]

اس کے علاوہ متعدد حدیثیں ہیں جن میں شفاعت کو صرف ایمان و اسلام پر معلق کیا گیا ہے لہٰذا یہ حدیثیں بھی اس حدیث ضحضاح کی مخالف ہیں جس میں باوجود شرک ابوطالب کی شفاعت کرلی گئی ہے ملاحظہ ہوں چند احادیث :۔

ا ــ قيل بلى سل فان كل نبى قد سئل فاخرت مسألتى الى يوم القيامة فهى لكم ان شهد انه لا اله الا الله۔

(میرا سوال قیامت کے روز اہلِ توحید کے لئے ہوگا) [۳]

ب ــ اعطيت الشفاعة وهى نائلة من امتى من لا يشرك بالله شيئاً

"(مجھے شفاعت کا حق دیا گیا ہے لیکن ان کے لئے جو مشرک نہ ہوں)

ج ــ ان شفاعتى لكل مسلم۔

"میری شفاعت تمام مسلمانوں کے لئے ہے"

د ــ اوحى الله الى جبرئيل ان اذهب الى محمد فقل له ارفع راسك سل تعطوا اشفع تشفع ـ ادخل امتك من خلق الله من شهد ان لا اله الا الله يوماً واحداً مخلصاً ومات على ذالك

"اللہ نے پیغمبر کی طرف وحی کی کہ اگر کوئی ایک دن بھی خلوص سے توحید کا اعتراف کرلے تو جنت میں لے جاؤ"۔

ان روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ پیغمبرؐ کا حقِ شفاعت صرف اہلِ اسلام سے مخصوص ہے کافر کے بارے میں شفاعت کرنے کا حق نہیں ہے۔ علاوہ اس کے کہ پیغمبرؐ نے بھی اپنے حق کو قیامت پر اٹھا رکھا ہے جیسا کہ حدیث (ا) سے واضح ہوتا ہے۔

---

[۱] مسلم ج ۱ ص ۴۱، الغدیر ج ۹ ص ۲۴، الغدیر ج ۱۰ ص ۹، ۱۱۹

[۲] سیر اعلام النبلاء ج ۲ ص ۲۹۵

[۳] الغدیر ج ۸ ص ۲۴، ج ۴ ص ۱۵۰-۱۵۸

ان روایات میں شفاعت کی مقدار بیان نہیں ہوئی ہے لیکن یہ کہا جا سکتا ہے کہ جس کی شفاعت ہو جائے گی وہ جہنم میں نہیں جا سکتا۔ اس لئے کہ سابق روایتوں نے اہلِ توحید کو جنتی ثابت کردیا ہے۔

اس کے بعد لمحۂ فکریہ یہ رہ جاتا ہے کہ ان تمام حدود و قیود کے باوجود حضرت رسولِ مقبولؐ نے دنیا ہی میں اور ایک مشرک کی شفاعت کیسے قبول کرلی! حقیقت یہ ہے کہ یہ حدیث صرف حدیثِ احتضار ہی سے متعارض نہیں بلکہ متعدد حدیثوں سے تعارض رکھتی ہے اور قاعدہ کی رو سے یہی تعارض و تضاد روایت کے اعتبار کو ختم کرنے کے لئے کافی ہے یہ تو اتفاق ہے کہ دونوں روایتوں کے راوی بھی جعل سازی اور افترا پردازی میں ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر ہیں۔

اس مقام پر بعض حدیثیں اور بھی ہیں جن کا نقل کردینا لطف سے خالی نہ ہوگا۔ ملاحظہ ہوں :۔

ا ــ يدخل الجنة من امتى سبعون الف بغير حساب [۱]

"میری امت کے ستر ہزار افراد بلا حساب جنت میں جائیں گے" بلکہ ایک احتمال ابوحازم کی نظر میں سات لاکھ کا بھی ہے [۲]

ب ــ يبعث من هٰذه المقبرة البقيع ـ سبعون الفا يدخلون الجنة بغير حساب [۳]

"بقیع میں دفن شدہ ستر ہزار افراد بلا حساب داخلِ بہشت ہوں گے۔"

ج ــ ليدخلن الجنة من امتى سبعون الفا لا حساب عليهم ولا عذاب مع كل الف سبعون الفا [۴]

"میری امت کے ستر ہزار افراد بلا حساب جنت میں جائیں گے اور ہر ہزار کے ساتھ ستر ہزار ہوں گے"

---

[۱] مسلم ج ۱ ص ۱۳۷، بخاری ج ۴ ص ۸۴

[۲] الغدیر جلد ۵ ص ۳۸۳، طبرانی ج ۴ ص ۱۳

[۳] الغدیر جلد ۷ ص ۱۲۰، از مجمع الزوائد ج ۱۰ ص ۴۰۵

[۴] الغدیر جلد ۵ ص ۲۸۳

اس قسم کی بے شمار حدیثیں ہیں جن میں بے حساب شفاعت کا حساب لگایا گیا ہے ہمارا مقصد یہ نہیں ہے کہ آپ حضرات ستر ہزار کو ستر ہزار میں ضرب دے کر رسولِ اکرمؐ کے حقِ شفاعت کی وسعت کا اندازہ کریں بلکہ ہمیں تو صرف یہ پوچھنا ہے کہ کیا اس حدیثِ ضحضاح کے راوی نے اس ضرب و جمع کا حساب لگا کر ان تمام افراد کا جائزہ لے لیا ہے کہ ان میں حضرت ابوطالبؑ نظر نہیں آسکے اور ان کی منزل ضحضاح قرار دے دی گئی۔

ان تمام روایات کو نقل کرنے سے ہمارا مقصد یہ نہیں ہے کہ ہم ان تمام روایات پر ایمان لا چکے ہیں یا انھیں تسلیم کر چکے ہیں ___ ہرگز نہیں ___ ہمارا مقصد صرف یہ ہے کہ یہ روایتیں بھی انہی کتابوں میں درج ہیں جن میں یہ ضحضاح کی حدیث ہے اور مزید لطف یہ ہے کہ بعض کے راوی بھی ضحضاح والے ہی افراد ہیں۔

جی چاہتا ہے کہ اس مقام پر ایک مردِ انصاری انیس نامی (جسے معاویہ نے علیؑ پر سب و شتم کے لئے معین کیا تھا) اس کے خطبے کا اقتباس بھی نقل کر دیا جائے ۔ یہ شخص منبر پر جا کر حمدِ باری تعالیٰ کے بعد یوں گوہر ریز ہوتا ہے۔

" لوگو! تم نے اس بیچارے پر بہت زیادہ سب و شتم کیا ہے ۔ خدا کی قسم! میں نے رسولِ اکرمؐ کو یہ کہتے سنا ہے کہ روزِ قیامت روئے زمین کے کنکر پتھر سے زیادہ کی شفاعت کروں گا خدا کی قسم رسول بڑا صلۂ رحم کرنے والا رسولؐ تھا۔ تو کیا تم لوگوں کا خیال ہے کہ وہ ہر ایک کی شفاعت کرے گا[۱] اور اپنے اہلبیت کو چھوڑ دے گا؟ "

حقیقت یہ ہے کہ یہ کلام اتنا پر مغز اور حساس ہے کہ اس پر کسی تبصرہ و تنقید کی ضرورت نہیں ہے

(۴)

حدیثِ ضحضاح سے یہ ثابت ہو چکا ہے کہ رسولِ اکرمؐ اپنے چچا ابوطالبؑ کی شفاعت ضرور کریں گے ۔ اب سوال یہ ہوتا ہے کہ یہ شفاعت کلمہ پڑھنے کے بعد ہے یا کلمہ پڑھنے سے پہلے؟

اگر یہ کہا جائے کہ یہ شفاعت کلمہ پڑھنے کے بعد کی ہے تو سابق کے روایات کی بناء پر انھیں جنّت میں ہونا چاہیئے ضحضاح میں کیا کام ہے! اور اگر یہ کہا جائے کہ یہ شفاعت کلمہ پڑھنے سے پہلے کی ہے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ آنحضرتؐ مشرکین کی بھی شفاعت کریں گے حالانکہ یہ بات ان صریح آیتوں کے خلاف ہے جن میں مشرکین سے ہمدردی کی ممانعت کی گئی ہے۔ اور ظاہر ہے کہ جو روایت قرآن کریم سے متعارض

---

[۱] الغدیر ج ۱۰ ص ۲۶۰، اسد الغابہ ج ۱ ص ۱۳۴، اصابہ ج ۱ ص ۵۹، استیعاب ج ۱ ص ۳۷

(قدرے اختلاف کے ساتھ)

ہوئی اس کی جگہ دیوار ہوتی ہے خواہ اس کے راوی کتنے ہی ثقہ اور معتبر کیوں نہ ہوں! چہ جائیکہ یہ روایات جن کے رواۃ ایک سے ایک بڑھ کر بے ایمان اور جعل ساز قسم کے لوگ ہیں۔

(۵)

لطف یہ ہے کہ ان احادیث کو حضرتِ عباس کی طرف منسوب کیا گیا ہے حالانکہ یہ تمام حدیثیں اس حدیثِ احتضار سے صریحی تضاد رکھتی ہیں جس میں حضرت عباس نے رسولِ اکرمؐ سے یہ عرض کی تھی کہ ابوطالبؑ نے آپ کی بات رکھ لی اور کلمہ پڑھ لیا ہے ۔ ہم سابق میں کہہ چکے ہیں کہ جس شخص کو حدیثِ احتضار پر عمل کرنا ہے اس کا انسانی اور اخلاقی فرض ہے کہ حدیث کو آخر تک تسلیم کرے اور درمیان سے الگ نہ کرے۔

اب اگر کوئی شخص ان دونوں حدیثوں کو صحیح طریقے سے اخذ کرے گا۔ تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ ایک اچھے خاصے تعارض و تصادم میں گرفتار ہو جائے گا اور اگر چاہے کہ ایک کو ترک کر دے اور ایک کو قبول کرے تو یہ غیر ممکن ہوگا اس لئے کہ دونوں کے اکثر راوی ایک ہی ہیں ۔ اگر ایک راوی کی ایک روایت قابلِ ترک ہے تو دوسری روایت قابلِ عمل کیسے ہوگی؟

(۶)

ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر رسولِ اکرمؐ کو کیا ضد ہے کہ حضرت ابوطالبؑ کو ایک طبقۂ جہنّم سے نکال کر دوسرے طبقے میں ڈال دیں جب کہ یہ اُن کے جود و کرم کے علاوہ اس حدیث کے بھی خلاف ہے جو حضرتِ عثمان کی شان میں تیار کی گئی ہے کہ :-

" عثمان کی شفاعت سے ستّر ہزار مستحقِ جہنّم بلا حساب جنّت میں چلے جائیں گے "[۱]

ذرا ملاحظہ کیجئے، دو چار نہیں ستّر ہزار ـــ! اللہ اکبر! خلیفہ کے اختیارات اتنے وسیع اور نبیؐ کے اختیارات اتنے محدود! اس کا مطلب تو یہ ہے کہ صحابیٔ رسولؐ کا درجہ تقربِ عظمتِ رسولؐ سے ستّر ہزار گنا زیادہ ہے کہ وہ اتنے کی شفاعت کر سکتا ہے اور یہ ایک کو بھی جنّت میں لے جانے سے عاجز ہیں؟

شاید اس امتیاز کا سبب یہ ہو کہ حضرت ابوطالبؑ اپنی حفاظت و رعایت اور نصرت و حمایت کی بناء پر اس بات کے مستحق ہو گئے کہ عثمان کی سفارش سے اچھے خاصے گنہ گار جنّتی بن جائیں اور وہ رسولؐ کی شفاعت سے بھی جنّتی نہ بن سکیں بلکہ ایک طبقہ سے نکل کر دوسرے طبقے میں رہ جائیں اور اس طبقے کی حالت! العیاذ باللہ!

---

[۱] الصواعق ص ۶۵ ـــ الغدیر ج ۹ ص ۲۴۸ از فتوحاتِ اسد

الغدیر ج ۸ ص ۳۰۳

حقیقت یہ ہے کہ حضرت ابوطالبؑ کے بارے میں شفاعت نہ ہونے ہی کی روایت زیادہ صحیح ہے اس لئے کہ شفاعت اس شخص کی ہوتی ہے جو خود اپنے عمل سے جزا کا مستحق نہ ہو۔

ابوطالبؑ جیسا فداکار، جاں نثار اور محافظِ اسلام و رسولِ اسلام بھی مستحق جنت نہ ہوگا تو کون ہوگا؟ جنت ابوطالبؑ جیسے مجاہد اور مخلص کے لئے نہیں ہے تو پھر کس کے لئے ہے؟

اللہ ایسے ہفوات و خرافات سے محفوظ رکھے جن میں احسان کا انکار، اقدار کا اختلاط، ضمیر کی کشتی، انسانیت کی عداوت، اللہ کا غضب، اولیائے خدا کا بغض، صراطِ مستقیم سے اعراض اور گمراہیوں کا راز پوشیدہ ہو!

مومن

لغت کے اعتبار سے لفظ ایمان کے معنی تصدیق کرنے کے ہیں جس کی بناء پر اس کا استعمال مسلم و کافر دونوں کے لئے ہو سکتا تھا، لیکن اصطلاحی اعتبار سے لفظ ایمان میں ایک مذہبی رنگ پیدا ہو گیا ہے جس کی بنا پر اب وہ کافر کی ضد بن گیا ہے۔

اس اصطلاح کا خلاصہ یہ ہے کہ ایمان دل سے تصدیق اور زبان سے معارف الہیہ کے اقرار کا نام ہے۔ بشرطیکہ انسان ان تمام امور کا پابند بھی ہو جو اس تصدیق و اقرار کے لازمی نتائج ہیں۔

قلبی اعتقاد ایک ایسی شئے ہے جس کا علم انسان کو نہیں ہو سکتا، اس کی واقفیت صرف ذات علام الغیوب کے لئے ہے۔ جو دلوں کی گہرائیوں سے واقف اور ضمیر کے اقرار سے باخبر ہے۔ انسان کا فریضہ ہے کہ ہر شخص کے ظاہری حالات کی بنا پر اس کے ایمان و کفر کا فیصلہ کرے۔ اگر کوئی شخص اپنے کو مسلمان کہتا ہے تو کسی مسلمان کو یہ حق نہیں ہے کہ اس کے اسلام سے انکار کر دے، اس لئے کہ قرآن ــــ اس کی مذمت و ممانعت فرمائی ہے۔

ولا تقولوا لمن القیٰ الیکم السلام لست مومنا

"کسی مدعیٔ اسلام کو غیر مومن نہ کہو۔"

اور جب عام مدعیانِ اسلام کے لئے قرآن کا یہ اہتمام ہے تو اس شخص کے بارے میں کیا کہا جا سکتا ہے جس نے ایمان و اسلام کی بنیادیں مضبوط کر کے آخر وقت تک ان کی حفاظت کی ہے۔

عام طور سے اسلام و ایمان کو معلوم کرنے کے دو طریقے ہیں:

(۱)۔ خود انسان کے قول پر اعتماد کر کے اسے مسلمان کہا جائے اور مستحق جنت بھی قرار دیا جائے اگر اس کے قول و فعل کی ہم آہنگی کا علم ہو جائے۔

(۲)۔ رسول کریمؐ یا ائمہ معصومینؑ جو شیعہ نقطۂ نظر سے عصمت کے مالک ہیں اس کے دل کی گہرائیوں کی شہادت دیں کہ رسولؐ کا کلام مطابق وحی ہوتا ہے اور وحی ترجمانِ حقیقت ہوتی ہے ائمہ معصومینؑ بھی رسولِ اکرمؐ ہی کے حقائق کی ترجمانی کرتے ہیں ان کے یہاں نہ جذبات کی حکومت ہوتی ہے اور نہ خواہشات کی پیروی!

جب ہم ان دونوں طریقوں پر نظر کرتے ہیں تو ہمیں حضرت ابوطالبؑ کا ایمان روزِ روشن کی طرح واضح نظر آتا ہے کہ ایک طرف ان کے اپنے اقوال و افعال کا تسلسل ہے اور دوسری طرف رسولِ کریمؐ اور ائمہ اطہارؑ کی طرف سے مدح و ثناء کا سیلابِ عظیم ہے جس میں عمل خالص جہادِ متصل، دفاعِ مسلسل، عقیدۂ راسخہ اور ایمانِ کامل کی داستانیں نمایاں نظر آتی ہیں۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس مقام پر حضرت ابوطالبؑ کے بعض اقوال و اشعار کا ترجمہ بھی نقل کر دیا جائے جو اسلام و ایمان کا صریحی اعلان کر رہے ہیں۔ چنانچہ آپ فرماتے ہیں:

ملیک الناس لیس له شریك
هو الوهاب والمبدی المعید
ومن تحت السماء له بحق
ومن فوق السماء له عبید[۱]

"تمام انسانوں کا مالک لاشریک سب کا ایجاد کرنے والا اور سب کو پلٹانے والا خدا ہے۔ زیرِ آسمان تمام چیزیں اس کی ملکیت ہیں اور آسمان کے تمام بسنے والے اس کے بندے ہیں۔"

کیا ان دونوں اشعار میں کسی کو کفر و الحاد کا شائبہ نظر آتا ہے جن میں ایک طرف پروردگارِ عالم کو ملیک الناس کہا جا رہا ہے جو قرآن کریم کے سورۂ "ناس" سے ملتی

---

[۱] ایمان ابی طالب ص ۲۰، دیوانِ ابی طالب ص ۱۱، الحجہ ص ۸۰، شیخ الابطح ص ۸۵

ہوئی تعبیر ہے اور وحدانیت کا اعتراف ہے۔ لامحدود عطایا کا اقرار ہے اور آخر میں اس کی ایجاد کے ساتھ ساتھ روزِ معاد کے اعادہ کا تذکرہ ہے جو اسلام کا مفصل عقیدہ ہے اور دوسری طرف دوسرے شعر میں تمام روئے زمین کی ملکیت اور تمام اہلِ آسمان کی بندگی کا اعلان ہے جو توحید کا مکمل مفہوم ہے۔

پھر فرماتے ہیں: —

یا شاهد الله علی فاشهد
انی علی دین النبی احمد

"اے خدا! شاہد گواہ رہنا کہ میں محمدؐ کے دین پر ہوں۔"

من ضلّ فی الدین فانا المهتدی[۱]

"اگر دُنیا گمراہ ہو جائے تو ہو جائے میں ہدایت یافتہ ہوں۔"

کیا دینِ نبیؐ پر ثابت قدم رہنے کا اقرار اور اسی کے ساتھ دین سے منحرف ہونے والے کے گمراہ ہونے کا اعلان، اقرار اسلام سے زیادہ نہیں ہے؟ کیا کوئی شخص اعتراف اسلام کر لے تو اس کی جان، اس کا مال، اس کی آبرو محفوظ نہیں ہو جاتی؟ پھر جس شخص نے اتنا صریحی اعتراف و اعلان کیا ہو اس پر اتنے شدید حملے کیوں کیے جا رہے ہیں۔ کیا یہ گمراہی نہیں ہے کیا یہ حقائق سے چشم پوشی نہیں ہے کیا یہ بقول حضرت ابوطالبؑ دینِ نبیؐ سے انحراف کا نتیجہ نہیں ہے۔ حقیقت یہی ہے کہ ان افراد نے اپنے نفس پر قیاس کر کے حضرت کو کافر و گمراہ بنانے کی کوشش کی ہے۔

دوسرے مقام پر فرماتے ہیں:—

لقد اکرم الله النبی محمداً   فاکرم خلق الله فی الناس احمد

---

[۱] شرح النہج جلد ۳ ص ۳۱۵، الحجہ ص ۸۱، شیخ الابطح ص ۸۰ (مبرد نے اپنی کتاب کامل ج ۳ ص ۹۱۹ پر ان اشعار کو حضرت علیؑ کی طرف منسوب کیا ہے اس لئے کہ آپ انھیں برابر پڑھا کرتے تھے حالانکہ یہ اشتباہ ہے حضرت کا بار بار پڑھنا فقط شعر کی عظمت اور معنویت کی دلیل ہے اور بس۔

وشق له من اسمه ليجله

فذو العرش محمود وهذا محمد[له]

"اللہ نے اپنے نبی کو تمام عالم سے زیادہ اشرف قرار دیا ہے اپنے نام سے ان کا نام نکالا ہے وہ محمود ہے اور یہ محمدؐ۔"

یہ شعر وہ ہیں جن میں وقت واحد میں توحید و رسالت دونوں کے جلوے نظر آتے ہیں۔ نبوت کے اقرار کے بارے میں آپ کے متعدد اشعار کتاب کے مختلف صفحات پر درج کئے جا چکے ہیں جن کی ایک مختصر فہرست پھر نقل کی جا رہی ہے۔

انت الرسول رسول الله نعلمه

عليك نزل من ذى العزة الكتب

"ہم آپ اللہ کے رسول ہیں اور آپ ہی پر کتابیں نازل ہوئی تھیں۔"

الم تعلموا انا وجدنا محمدا

نبیا کموسیٰ صح فی اول الكتب

"کیا تمہیں خبر نہیں ہے کہ محمدؐ بھی موسیٰ کی طرح نبی ہیں اور ان کا ذکر سابق کتب میں موجود ہے۔"

انت ابن آمنة النبی محمد

آپ آمنہ کے فرزند نبی ہیں۔

نبی اتاه الوحی من عند ربه

محمدؐ وہ نبی ہیں جن پر وحی نازل ہوتی ہے۔

انت النبی محمد

آپ محمدؐ نبی ہیں۔

الا ان احمد قد جاءهم

بحق ولم یاتهم بالكذب

له شرح النہج ج ۳ ص ۳۱۵، الحجة ص ۷۵، معجم القبور ج ۱ ص ۱۹۷، الغدیر ج ۷ ص ۳۳۵
دیوان ابی طالب ص ۱۱، اعیان الشیعہ ج ۳۹ ص ۱۴۷

"آگاہ ہو جاؤ محمدؐ کا پیغام حق ہے باطل نہیں ہے۔"

اولیو منوا بکتب منزل عجب

علی نبی کموسیٰ اوکذی النون

"محمدؐ کی کتاب بڑی عجیب ہے وہ اسی طرح نبی ہیں جس طرح موسیٰ یا ذی النون تھے۔"

لقد علموا ان ابننا لا مکذب

لدینا ولا نعباء بقول الاباطل

"دنیا جانتی ہے کہ ہمارا فرزند صادق ہے۔ ہم باطل کی پروا بھی نہیں کرتے۔"

قابل مضحکہ لیکن بدنیتی کا واضح ثبوت یہ ہے کہ علامہ قرانی نے اس کلام پر تبصرہ کیا ہے کہ "زبان سے اقرار اور دل سے اعتقاد تو ہے لیکن ابوطالبؑ مومن نہ تھے۔"[له]

خدا جانے اس غرض مند انسان کی نظر میں ایمان کسے کہتے ہیں؟ حقیقت تو یہ ہے کہ یہ دل کے جذبات تھے جو نوک قلم تک آ گئے اور ان کو واقعہ سے کوئی ربط نہیں ہے۔

یہ ایک مشت نمونہ ہے ورنہ اس کے مقابلے میں کلمات و بیانات کا ایک انبار ہے جس میں رسالت کا اعتراف بلکہ دین کی ترویج کا مکمل سامان ہے حضرت ابوطالبؑ کا یہ اعتراف اور آپ کی یہ پیروی ایک بڑے ایمانی جذبے کی غمازی کر رہی ہے۔

ایک ایسا انسان جو قبیلہ کا سردار ہو، مکہ کا رئیس اور قریش کا قائد ہو، اسے کیا پڑی تھی کہ وہ ایسے یتیم کے سامنے سر نیاز خم کرتا جو کل تک اپنی ہی آغوش میں پل رہا تھا اور اپنی ہی اولاد کے حکم میں تھا۔ جس پر خود ہی مربی کی اطاعت فرض ہوتی ہے۔

یہ صرف عقیدۂ راسخ اور ایمان کامل کا جذبہ تھا جس نے ساری ریاست و سیادت کے جذبات کو دل سے نکال دیا۔ اور ابوطالب کی زبان سے ان کے گود کے پالے ہوئے سردار کہلوایا اور پھر مدح و ثنا اور تعریف و توصیف کا دریا بہا دیا۔ اگر یہ عقیدہ و ایمان نہ ہوتا تو ایسا خضوع و خشوع ایک غیر ممکن امر تھا اسے قرابت و رشتہ داری پر محمول نہیں کیا جا سکتا۔

له السیرة النبویہ ج ۱ ص ۸۵

اور اگر ایسا تھا تو ابولہب کو کیا ہو گیا تھا۔؟ اس نے کیوں ساتھ نہیں دیا؟ کم از کم مخالفت ہی نہ کی ہوتی۔ یہ کچھ نہیں ہے' دینی جذبات کے سامنے قرابت اور رشتہ داری کی کوئی وقعت نہیں ہے۔ ہم ابھی دیکھ چکے ہیں کہ عبداللہ بن عبداللہ بن ابی نے اخوت کے رشتہ کو قطع کر دیا اور اپنی دینی حماقت سے قتل پر آمادہ ہو گئے۔

ہم ابھی سُن آئے ہیں کہ عدی بن حاتم نے پدری شفقت کو بالائے طاق رکھ دیا اور اپنے پارۂ جگر زید کو مارنے پر آمادہ ہو گئے بلکہ جب وہ ہاتھ سے نکل گیا تو اس کی موت کی بد دعا کرنے لگے۔ یہ سب کیا تھا!۔ یہی نا کہ دینی جذبات دل کی گہرائیوں سے رشتہ داری کے احساسات کو بیخ و بُن سے اکھاڑ کر پھینک چکے تھے۔ ظاہر ہے کہ جب عام انسان کا یہ عالم ہو تو شیخ بطحا کا کیا عالم ہوگا۔ جہاں ایک طرف اپنی قوم کی زعامت و سیادت' اپنے دین کے احساسات و جذبات ہیں اور دوسری طرف قرابت اور رشتہ داری پھر رشتہ دار بھی وہ جو اپنے مزعوم مذہب کو جڑ سے اکھاڑ دینے کی فکر میں ہے۔ کیا ایسے حالات میں بھی رشتہ داری نباہی جا سکتی ہے۔! ہرگز نہیں۔ یہ بات کسی ایسے دل میں نہیں بیٹھ سکتی جس میں ذرّہ برابر بھی شعور ہو!

کیا فقط رشتہ داری اور قرابت کی محبت تھی جو ابو طالبؑ کو اس بات پر مجبور کر رہی تھی کہ وہ محمد اور ان کے پیغام کی مدح و ثنا میں تعریفوں کے پل باندھ دیں اور ساری قوم کو اپنے مزعوم دین کی طرف دعوت دیں اور وہ بھی اتنے صریح اور تند و تیز لہجے میں!

اعوذ برب البیت من کل طاعن   علینا بسوء او یلوح الباطل
ومن فاجر یغتابنا بمعیبة   ومن ملحق فی الدین مالم نحاول
کذبتم وبیت الله نبزی محمداً   ولما نطاعن دونه ونناضل
ونسلمه حتی نصرع حوله   ونذهل عن ابنائنا والحلائل
وحتی تری ذا الردع یرکب ردعه   عن الطعن فعل الانکاب لتحمل
وینهض قوم فی الحدید الیکم   نهوض الروایا من طریق جلاجل
وانا وبیت الله ان جد ما اری   لتلتین اسیافنا بالاماثل
بکل فتی مثل الشهاب سمیدع   اخی ثقة عند الحفیظة باسل
وماترک قوم لا اباک سیداً   یحوط الزمار غیر نکس مواکل

وابیض یستقی الغمام لوجهه   ثمال الیتمیٰ عصمة للارامل
یلوذ به الهلاک من آلِ هاشم   فهم عنده فی نعمة وفواضل
ومیزان صدق لا یخس شعیرة   ووزان عدل وزنه غیر عائل
الم تعلموا ان ابننا لا مکذب   لدینا ولا نعبا بقول الاباطل
لعمری لقد کلفت وجداً باحمد   واحببته حب الحبیب المواصل
وجدت بنفسی دونه فحمیه   ودافعت منه بالذری والکواهل
فلازال للدنیا جمالاً لاهلها   وشینا لمن عادی وزین المحافل
فمن مثله فی الناس ای مؤمل   اذا قاسه الحکام عند التفاضل
حلیم رشید عادل غیر طائش   یوالی الاها لیس عنه بغافل

وایده رب العباد بنصره
واظهر دیناً حقه غیر باطل[1]

' اللہ ہر بد نظر اور باطل کوش سے نجات دے "
اللہ ہر فاسق و فاجر' غیبت شعار اور بے ایمان سے بچائیے۔
قریش! تمہارا خیال غلط ہے کہ ہم محمد کو چھوڑ دیں گے' ابھی نیزہ بازی ہوگی مقابلے ہوں گے۔
لوگ قتل ہوں گے' زن و بچہ کے خیالات ذہنوں سے محو ہوں گے۔
ایسی نیزہ بازی ہوگی کہ کشتے ایک پر ایک گریں گے۔
ہماری قوم مسلح ہو کر اس طرح چلے گی جس طرح اونٹ پانی لے کر چلتے ہیں۔ ان کی آواز ظاہر ہوتی ہے۔
خانۂ حق کی قسم اگر ہم میدان میں آئے تو یہ اس کی ذلت اور بد بختی کے سوا کیا ہے؟
ہمارا سردار یتیموں اور بیواؤں کا وارث ہے اس کے طفیل بارش رحمت ہوتی ہے آلِ ہاشم اسی کی پناہ میں رہتے ہیں اسی لئے تو مطمئن اور محترم ہیں۔
ہمارا رئیس محمدؐ وہ میزانِ صداقت ہے جس میں بال برابر فرق نہیں۔ صداقت کو پورے وزن سے تولتا ہے۔
کیا تمہیں نہیں معلوم کہ یہ غلط گو یا باطل پرست نہیں ہے۔

اپنی جان کی قسم میں محمدؐ کا دل و جان سے دوست ہوں
میں نے اپنی جان پر کھیل کر اس کی حفاظت کی ہے اور طاقت کے ذریعہ اس
کو بچایا ہے
یہ اہلِ دنیا کے لئے باعثِ جمال، محفلوں کی زینت اور دشمنوں کے لئے باعثِ ننگ و عار ہے
مقابلے کے وقت اس کے علاوہ اور کس سے فضیلت و برتری کی اُمید کی جا سکتی ہے
یہ حلیم، رشید، عادل، صحیح الفکر اور اللہ کا مسلسل محب ہے۔
اللہ نے اس کی نصرت و تائید کی ہے۔ اس نے اس کی دین کو غلبہ دیا ہے۔"[1]

ناظرینِ کرام ان اشعار پر ایک طائرانہ نظر ڈال لیں کہ ایک اڑتی ہوئی نظر بھی ان اشعار کی معنویت کو دلوں میں اتار دے گی۔ اور ان کی نرمی، شیرینی اور طلاوت قلوب کو اپنی طرف جذب کر لے گی۔

یہ فقط شاعری نہیں ہے، دل کی آواز ہے جس کے ساتھ اعضاء و جوارح کا عمل شریک کار رہا ہے، رُوح کی صدا ہے جس پر جہادِ مسلسل نے لبیک کہی ہے عقائد کا سیلاب ہے جس میں خدمات و اعمال شریک رہے ہیں۔

حضرت ابوطالبؑ کا ایمان اس قدر واضح ہے کہ اس پر کسی دلیل و برہان کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ ضرور ہے کہ بسا اوقات اندھے کے سامنے سورج کے اوصاف بھی بیان کئے جاتے ہیں تاکہ اگر دیکھ نہ سکے تو کم از کم عقیدہ تو پیدا کر لے اسی بنا پر ہم نے یہ تمام دلائل و براہین پیش کئے ہیں جن میں خود آنجناب کا اقرار، آپ کا جہاد، آپ کی خدمات رسولِ اکرمؐ کی مدح و ثنا، ائمہ اطہارؑ کی تعریف و توصیف وغیرہ شامل ہیں۔

یہی وہ دلائل و براہین ہیں جن کی بنا پر علماءِ شیعہ نے ایمانِ ابوطالبؑ کو ایک ایسی یقینی شے قرار دیا ہے جس میں شک و شبہ کی گنجائش نہیں۔ اسی پر تمام شیعوں کا اتفاق و اجماع ہے اور یہی شیعوں کا مذہب ہے بلکہ اگر کوئی شخص اس حقیقت کا اعتراف نہ کرے تو یہی بات اس کے غیر شیعہ ہونے کے لئے کافی ہے اس لئے کہ اس قدر احادیث و اخبارِ ائمہ اطہارؑ

---

[1] شرح النہج ج ۳ ص ۳۱۵، دیوانِ ابی طالب ص ۶۸، ایمان ابی طالب ص ۶-۸، الحجۃ ص ۸۱-۹۵ السیرۃ الہشامیہ ص ۲۹۱، شیخ الابطح ص ۳۴، ہاشم و امیہ ص ۱۷۴، الغدیر ج ۷ ص ۳۳۸، اعیان الشیعہ ج ۳۹ ص ۱۴۹

خصوصاً ارشادِ امام رضاؑ کے بعد یہ ثابت ہو چکا ہے کہ تشیع اور کفرِ ابوطالبؑ کا عقیدہ دو متضاد چیزیں ہیں۔ کفر کا قائل ائمہ اطہارؑ کا مخالف اور مذہبِ شیعہ سے خارج ہے۔

فقط شیعہ ہی نہیں بلکہ اکثر زیدی[1] حضرات نے بھی اسی قول کو اختیار کیا ہے اور اس سے بالاتر یہ ہے کہ بعض اکابر معتزلہ[2] نے بھی تسلیم کیا ہے جیسا کہ شیخ ابوالقاسم بلخی اور ابوجعفر اسکافی[3] کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے۔

یہی نہیں بلکہ بعض اربابِ کشف و مشاہدہ بھی آپ کے ایمان[4] بلکہ نجات کے معتقد ہیں جیسا کہ قرطبی، سبکی، شعرانی وغیرہ کے قول سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ حضرات اسی عقیدہ کو اپنا دین تسلیم کرتے تھے[5]

امام احمد بن الحسین المشہور ابن وحشی نے تو یہاں تک فرما دیا ہے کہ ابوطالبؑ کا بغض کفر ہے[6] اور یہی باب اجہوری نے اپنے فتاویٰ میں نقل کی ہے[7] تلمسانی کا قول ہے کہ ابوطالبؑ کا تذکرہ حمایت و نصرت نبی کریمؐ کے ساتھ ہونا چاہیئے۔ بُرائیوں کے ساتھ ان کا تذکرہ نبی کریمؐ کے لئے باعثِ اذیت ہے اور آنحضرتؐ کو اذیت دینا کفر ہے اور کافر کی سزا قتل ہے[8]

ابو طاہر کی نظر میں ابو طالبؑ سے بغض رکھنے والا کافر ہے[9]

وحلان کی رائے ہے کہ اتنے دلائل و براہین کے بعد نجاتِ ابوطالبؑ کا قائل ہونا ہی اپنی نجات کا باعث ہو سکتا ہے[10]

سیوطی نے ایک کتاب "بغیتہ الطالب لایمان ابی طالب[11]" کے نام سے

---

[1] الحدیدی ج ۳ ص ۳۱۰، شیخ الابطح ص ۵۵، اعیان الشیعہ ج ۳۹ ص ۱۳۵
[2] ایضاً
[3] الحدیدی ج ۳ ص ۳۱۰، اعیان الشیعہ ج ۳۹ ص ۱۳۵
[4] السیرۃ النبویہ ج ۱ ص ۸۷، الغدیر ج ۷ ص ۳۸۲، اعیان الشیعہ ج ۳۹ ص ۱۳۵
[5] الغدیر ج ۷ ص ۳۸۲
[6] ایضاً
[7-11] الغدیر ج ۷ ص ۳۸۲-۳۸۴

لکھی ہے جس کا عنوان ہی ان کے عقیدہ کی وضاحت کر رہا ہے۔

اس مقام پر تمام مؤلفین و مفکرین کے اقوال و افکار کا پیش کرنا مقصود نہیں ہے یہ اپنے امکان سے باہر ہے۔ مقصد صرف یہ ہے کہ بعض علماء کے اقوال سے بھی موضوع پر روشنی پڑ جائے اور بحمد اللہ یہ مقصد حل ہو گیا۔

ان تمام واضح دلائل و براہین کے بعد حضرت ابوطالبؑ کے کفر کے قائل دو ہی قسم کے لوگ ہو سکتے ہیں :۔

وہ جماعت جس نے ضمیر فروشی اور دین فروشی کر کے معاویہ سے تجارت کے لئے روایتیں وضع کی ہوں اور اس طرح اپنے تعیشِ دُنیوی اور عذابِ آخرت کا بیک وقت انتظام کیا ہو!

اور وہ جماعت جس نے بعد میں آکر اسی مسموم فضا میں آنکھ کھولی ہو اور اُسے یہ حقیقت واضح طور پر نظر نہ آسکی ہو۔ ہم نے حقیقت کے چہرے سے نقاب ہٹا دی ہے باطل کا پردہ چاک کر دیا ہے۔ اب کسی انسان کے لئے عند اللہ کوئی عذر باقی نہیں رہ گیا ہے

تعجب خیز امر یہ ہوگا کہ ان تمام واضح دلائل، محکم براہین اور مستحکم شواہد کے بعد بھی ابوطالبؑ کے ایمان کا انکار کر دیں اور اس حدیث کے قائل ہو جائیں جسے مسلم نے نقل کیا ہے۔

"شرید کہتے ہیں کہ ایک دن میں رسول اکرمؐ کے ساتھ ہمسفر تھا۔ آپ نے فرمایا تمہیں امیہ بن ابی الصلت کے اشعار یاد ہیں۔ میں نے عرض کی جی ہاں فرمایا سناؤ۔ میں نے ایک شعر سنا دیا تو فرمایا اور کچھ۔ پھر ایک شعر سنا دیا۔ فرمایا اور۔؟ میں نے اسی طرح تقریباً سو شعر سنا دیے تو آپؐ نے فرمایا کہ یہ اپنے اشعار میں تو تقریباً مسلمان تھا۔" [۱]

دوسری روایت میں ہے کہ زید بن عمرو دینِ حق کی تلاش میں شام کے راستے مکہ جا رہا تھا۔ راستہ میں موت آگئی۔ حضرت عائشہ رسول اکرمؐ کی نقل فرماتی ہیں کہ "میں جنت میں گیا تو میں نے زید بن عمرو کے دو بڑے بڑے درخت دیکھے" [۲]

---

[۱] صحیح مسلم ج ۱ ص ۴۸

[۲] السیرۃ النبویہ ج ۱ ص ۹۶

تیسری روایت ہے کہ سعید بن زید بن عمرو بن نفیل اور عمر بن الخطاب نے رسول اکرمؐ سے زید کے لئے استغفار کرنے کی اجازت مانگی تو حضرتؐ نے اجازت دیتے ہوئے فرمایا کہ زید ایک مستقل اُمت کی طرح مبعوث ہوگا۔" [۱]

ایک روایت میں قیس بن ساعدہ کے بارے میں بھی یہی الفاظ ملتے ہیں [۲]

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ تضاد کیسا؟ آخر رسولؐ جیسے معدن جود و کرم انسان کو کیا ہو گیا ہے کہ غیروں پر یہ عنایتیں کہ کسی کو ایک اُمت بنائے دے رہے ہیں کسی کے لئے استغفار ہو رہا ہے۔ اور جس نے اپنی آغوش میں پرورش کی ہے۔ اپنا خون پسینہ ایک کر کے پالا ہے اس پر کوئی کرم نہیں ہے؟ اور حد یہ ہے کہ اس کے تمام احسانات کا بھی کوئی بدلہ نہیں ہے جب کہ قرآن نے ہل جزاء الاحسان الا الاحسان کی تعلیم دی ہے۔ استغفر اللہ!

ان تمام بیانات کے بعد اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ حضرت ابوطالبؑ کو غیر مسلم کہنا رسولِ اکرمؐ کو اذیت دینا ہے اور آپ کو اذیت دینا ایک گناہ کبیرہ اور معصیت عظیم ہے جیسا کہ قرآن کریم اعلان کر رہا ہے۔

ا۔ والذین یؤذون رسول اللّٰہ لھم عذاب الیم

"رسول کو اذیت دینے والوں کے لئے عذاب الیم ہے"

ب۔ وما کان لکم ان تؤذوا رسول اللّٰہ

"تمہیں رسول کو اذیت دینے کا حق نہیں ہے"

ج۔ ان الذین یؤذون اللّٰہ و رسولہ لعنھم اللّٰہ فی الدنیا والآخرۃ واعد لھم عذاباً مھیناً۔

"خدا و رسول کو اذیت دینے والوں کے لئے لعنت اور رسوا کن عذاب ہے"

یہی وجہ ہے کہ تلمسانی نے آپ کے کفر کے قائلین کو واجب القتل قرار دیا تھا کہ یہ

---

[۱] علی ہامش السیرۃ ج ۱ ص ۱۳۶

[۲] السیرۃ النبویہ ج ۱ ص ۷۳-۷۶-۹۵، بحار ج ۶ ص ۵۷

قول نبی کریمؐ کے لئے باعثِ اذیت ہے اور آپ کو اذیت دینے والا کافر اور مستحق قتل ہے بھلا اس سے زیادہ اور کیا اذیت ہو سکتی ہے کہ آپؐ کے چچا ناصرؐ کفیل مربّی اور ایک مومنِ کامل و مجاہدِ مخلص کو کافر کہہ دیا جائے! اگر یہ صحیح ہے کہ سبیعہ بنتِ ابی لہب نے حضرت سے شکایت کی لوگ مجھے حَمَّالَةَ الحَطَبْ کی بیٹی کہتے ہیں تو آپ بگڑ کر مجمع میں آ گئے۔ اور فرمانے لگے کہ آخر لوگ مجھے میرے قرابت داروں کے معاملے میں کیوں اذیت دیتے ہیں۔ میری اذیت اللہ کی اذیت ہے[۱] حالانکہ کفر و اسلام کے درمیان کوئی قرابت باقی نہیں رہتی۔ اگر یہ صحیح ہے کہ حضرتؐ نے مُردوں کو بُرا بھلا کہنے سے منع کیا ہے[۲] صرف اس لئے کہ اس سے زندوں کو اذیت ہوتی ہے۔ اور اسی بناء پر نبی کریمؐ کو اذیت دینے والے کو مستحقِ قتل قرار دیا گیا ہے اگر توبہ نہ کرے[۳] بلکہ مالکین کی رائے کی بناء پر تو اگرچہ توبہ بھی کر لے[۴]

اگر یہ سب صحیح ہے تو کیا ابوطالبؑ کو کافر کہنا آنحضرتؐ کے لئے باعثِ اذیت نہیں ہے؟ کیا اس کے بعد انسان قتل، عذاب اور لعنت کا مستحق نہیں بن جاتا؟

یہی وجہ ہے کہ جب رسولِ اکرمؐ کے والدین کے بارے میں اسلام و کفر کی نزاع شروع ہوئی تو علامہ سیوطی نے ان الفاظ میں فیصلہ دیا۔

■ والدین کا مسئلہ اگرچہ اجماعی نہیں ہے اختلافی ہے لیکن میری رائے یہی ہے کہ انھیں نجات یافتہ کہا جائے، اس لئے کہ اس کے خلاف کہنا نبی اکرمؐ کو تکلیف دینا ہے۔ اور دُنیا کا دستور ہے کہ اگر کسی کے باپ کی تنقیص و توہین کی جائے تو اولاد کو اذیت ہوتی ہے"[۵]

مجھے اس مقام پر یہ کہنا ہے کہ اوّلاً تو رسول اکرمؐ کے والدین کے بارے میں کفر کا قول مسلمانوں میں ایک اشتباہ کی بناء پر پیدا ہو گیا ہے۔ ان افترا پردازیوں کا تمام تر مقصد یہ تھا کہ ابوطالبؑ کو کافر کہہ کر حضرت علیؑ کی توہین کریں۔ اتفاق کی بات کہ یہ سلسلہ حضرت آمنہ حضرت عبداللہ بلکہ حضرت عبدالمطلب تک پہونچ گیا۔

---

[۱] تا [۴] السیرۃ النبویہ ج ۱ ص ۷۷

[۵] السیرۃ النبویہ ج ۱ ص ۷۶

دوسری بات یہ ہے کہ اس مسئلے کو اختلافی کہنا کسی طرح دُرست نہیں ہے اس لئے کہ آبائے نبیؐ کے ایمان کی اشہادت قرآن کریم کی آیتیں اور خود حضرتؐ کی حدیثیں دے رہی ہیں اور ایسی حالت میں مخالفین کے قول کو اہمیت دے کر مسئلے کو اختلافی بنا دینا کسی طرح جائز نہیں —

تیسری بات یہ ہے کہ سیوطی نے آبائے رسولؐ کے ذکرِ بد کو صرف اس لئے منع کیا ہے کہ اس سے رسول اکرمؐ کو اذیت ہوگی۔ لیکن میرا عقیدہ ہے کہ اس اذیت کا منشا صرف قرابت داری اور رشتہ داری نہیں ہے بلکہ سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ اس طرح حق پر ایک حملہ اور ایمان پر ایک شدید وار ہو جاتا ہے جو کسی بھی انسان کے لئے برداشت نہیں کیا جا سکتا۔

بہرحال اگر ماں باپ کو کافر کہہ دینا آنحضرتؐ کے لئے باعثِ اذیت ہوگا تو کیا یہ بات باعثِ تکلیف نہ ہوگی کہ رسولؐ کی تربیت ایک کافر کے حوالے کر دی جائے۔ جب کہ رسولؐ کی مسلسل دُعا یہ تھی کہ خداوند کسی فاسق و فاجر کا احسان نہ ہونے پائے اس کا مطلب تو یہ ہوگا کہ دعائے رسولؐ مستجاب نہ ہو سکی۔

اگر یہ صحیح ہے کہ باپ کو مشرک کہہ دینا بیٹے کی توہین کا باعث ہوتا ہے تو اس کا کھلا ہوا مطلب یہ ہوگا کہ ابوطالبؑ کے کفر و شرک کی داستان بھی اسی لئے وضع کی گئی ہے کہ حضرت علیؑ کے اس امتیاز کو مٹا دیا جائے کہ آپؑ کے آباؤ اجداد میں سے کسی نے بتوں کے سامنے پیشانی نہیں جھکائی۔ بلکہ ہمیشہ سے ایمان و عقیدہ کی آغوش میں پرورش پاتے رہے اس کا واضح ثبوت یہ ہے کہ بعض راویوں نے بعض اصحاب کرام کے آباؤ اجداد کے اسلام کی روایتیں بھی وضع کر لی ہیں تاکہ حضرت علیؑ کی اس انفرادی صفت کا دو طرح سے مقابلہ کیا جا سکے۔ ایک طرف آپ کی صفت کا انکار کیا جائے اور دوسری طرف اس صفت میں آپ کا شریک بنا دیا جائے۔

حالانکہ ان راویوں نے یہ خیال نہیں کیا کہ اگر یہ تمام آباؤ اجداد مسلمان ثابت بھی ہو جائیں تو ان کا اسلام کفر کے بعد کی منزل میں ہوگا۔ جب کہ حضرت ابوطالبؑ نے کفر کا منہ ہی نہیں دیکھا۔ یہ عقیدہ تزلزل و تذبذب سے دوچار ہی نہیں ہوا۔

بعینہٖ یہی فریب اس بحث میں دیا جاتا ہے کہ جس میں حضرت علیؑ کے سابق الاسلام ہونے کی گفتگو اُٹھائی جاتی ہے اور اس سے یہ ظاہر کیا جاتا ہے کہ یہ بچوں میں سب سے

پہلے اسلام لائے تھے۔ حالانکہ ہمارا خیال یہ ہے کہ یہ بحث سرے سے غلط ہے۔ دیگر مسلمانوں کے متعلق یہ بحث ہوسکتی ہے کہ وہ پہلے کافر تھے لیکن حضرت علیؑ کے باب میں یہ بحث ہی بے معنی ہے

اگر یہ صحیح ہے کہ باپ کی تنقیص سے بیٹے کی توہین ہوتی ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ حضرت ابوطالبؑ کی توہین صرف حضرت علیؑ کی توہین نہیں ہے بلکہ رسولِ اکرمؐ کی بھی توہین ہے اس لئے کہ دونوں بنصِ آیہ مباہلہ متحد ہیں۔ ان دونوں کو علاوہ حضرت کے تمام خصوصیات وصفات میں مشترک ہونا چاہیئے۔ لہٰذا رسولؐ کے لئے ابوطالبؑ عبداللہؑ ہیں اور فاطمہ آمنہ، چاہے دونوں مومن ہوں یا کافر اس لئے کہ علیؑ نفسِ محمدؐ ہیں۔

اگر رسولِ اکرمؐ کو یہ بات تکلیف دیتی ہے کہ ابولہب کی بیٹی کو بنتِ حمالۃ الحطب کہا جائے حالانکہ اس کا باپ ابولہب اور اس کی ماں "حمالۃ الحطب" ہے تو کیا آنحضرتؐ کیلئے یہ بات تکلیف دہ نہ ہوگی کہ آپ کے مومنِ کامل اور مجاہد مخلص چچا کو کافر کہہ دیا جائے؟ حقیقت امر یہ ہے کہ اس ظلم و تعدی اور جنایت و بہتان سے جس قدر بھی متاثر ہوا جائے کم ہے۔ ابوطالبؑ جیسا قریب تر انسان اس کی توہین کی جائے اور رسولِ اکرمؐ کو اذیت نہ ہو کون ابوطالبؑ؟ اپنا چچا، چاہنے والا اور پالنے والا چچا ــــ کون ابوطالبؑ ـ؟ اپنا جاں نثار مجاہد، مومن اور بزرگ مخلص۔ اس کے علاوہ خود حضرت علیؑ کو اذیت دینا ہی آنحضرتؐ کی اذیت کے لئے کافی ہے، جبکہ دونوں کا نفس ایک اور دونوں کی روح ایک ہے۔ اگر شفاعت کا دائرہ اتنا وسیع ہے کہ اتنی بڑی بڑی تعداد اس میں داخل ہوسکتی ہے جس کا ذکر سابق کی روایات میں ہوا ہے۔ تو کیا اس میں اتنی وسعت اور نہیں ہے کہ اس میں ابوطالبؑ بھی داخل ہوجائیں ـ!؟

اگر رسولؐ سے زیادہ اگر کوئی صلۂ رحم کرنے والا نہیں ہے جیسا کہ معاویہ کے خطیب انیس نے قسم شرعی کے ساتھ بیان کیا ہے تو کیا یہ صلۂ رحم کے خلاف نہیں ہے کہ تمام دنیا کی شفاعت کریں اور اپنے حقیقی چچا اور اپنے نفس کے حقیقی باپ کی شفاعت نہ کرسکیں

سچ تو یہ ہے کہ ابوطالبؑ کو اس شفاعت کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ شفاعت پر اس کی نجات موقوف ہوتی ہے جس کے اعمال استحقاقِ جنّت کے لئے کافی نہ ہوں اور جس کے ذاتی اعمال پر دین کی بنیاد، عقیدہ کا استحکام اور اسلام کی ترویج کا دارومدار ہو اسے شفاعت

کی کیا ضرورت ہے! وہ تو اپنے ذاتی اعمال ہی سے عدالتِ الٰہیہ کے تقاضوں کے مطابق جنّت کا مستحق بن سکتا ہے۔

اس کے بعد سوال یہ ہے کہ اگر ابوطالبؑ ہی جنّت میں نہ جائیں گے تو وہ خلق کس لئے ہوئی ہے؟ اگر جنّت انھیں کو بطور جزا نہ ملے گی تو کسے ملے گی؟ اگر ابوطالبؑ جہنّم میں چلے گئے۔ تو پھر بچے گا کون؟ انبیاء و مرسلین یا شہداء و صدیقین۔؟ میرا خیال تو یہ ہے کہ پھر کوئی نہ بچ سکے گا۔ اس لئے کہ ابوطالبؑ جہنّم میں اسی وقت جائیں گے جب تمام اخلاقی اقدار ختم ہوجائیں۔ عدالتِ الٰہیہ کا سلسلہ منقطع ہوجائے۔ احکامِ الٰہیہ کی بنیادیں ظلم وجور پر قائم ہوجائیں اور جزاء و عمل میں کوئی ارتباط باقی نہ رہ جائے۔

والذین یؤذون المومنات بغیر ما اکتسبوا فقد احتملوا بھتانا و اثما مبینا ۝

"جو لوگ اہلِ ایمان کو بہتان رکھ کر اذیت دیتے ہیں وہ کھلے ہوئے گناہ کے متحمل ہوتے ہیں"

ختم شد